Institute of Policy Studies
Islamabad

ICRC

# اسلام اور غیر جانبدارانہ انسانی خدمت

سیّد ندیم فرحت
ڈاکٹر ضیاء اللہ رحمانی

PRESS

# اسلام اور غیر جانبدارانہ انسانی خدمت

سیّد ندیم فرحت

ڈاکٹر ضیاء اللہ رحمانی

Institute of Policy Studies
Islamabad

جملہ حقوق محفوظ ہیں۔ انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد کی تحریری اجازت کے بغیر اس کتاب کے کسی حصے کی نقل یا اشاعت، کسی بھی شکل میں اسٹوریج، جہاں سے اسے دوبارہ حاصل کیا جاسکتا ہو یا کسی بھی شکل میں ترسیل نہیں کی جاسکتی۔

جملہ حقوق محفوظ ۲۰۲۲ء

کتاب: اسلام اور غیر جانبدارانہ انسانی خدمت

تالیف وتدوین: سیّد ندیم فرحت، ڈاکٹر ضیاءاللہ رحمانی

اشاعت: ۲۰۲۲ء

آئی ایس بی این: ۰-۸۲۴-۴۴۸-۹۶۹-۹۷۸

زیرِ اہتمام:

PRESS

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، نصر چیمبرز، پلاٹ ۱، کمرشل سنٹر، ایم پی سی ایچ ایس، ای الیون تھری—اسلام آباد

فون: ۸۴۳۸۳۹۱-۳، ۸۴۳۸۳۸۸، ای میل: publications@ips.net.pk

ویب سائٹ: www.ipsurdu.com, www.ips.org.pk

فیس بک: InstituteOfPolicyStudiesPakistan

سرورق: آصف تیموری

صفحہ سازی: عابد حسین

طباعت: پریمیئر پرنٹرز، راولپنڈی

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد تحقیق کے لیے آزادانہ اظہارِ خیال کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ ادارہ کی مطبوعات میں پیش کیے گئے تمام خیالات سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

# فہرست


- پیش لفظ: عالمی انتظام میں برابری اور تعاون کی اہمیت — خالد رحمٰن ۷

## اسلام اور انسانی خدمات: چند اصولی مباحث

- ریڈ کراس اور ریڈ کریسنٹ کی تحریک: بنیادی اصول اور مذاہب کے ساتھ مکالمہ — ڈاکٹر ضیاءاللہ رحمانی ۱۷
- انسان دوست خدمات کا مفہوم اور دائرہ عمل: غیر وابستگی، غیر جانبداری اور خود مختاری کی اہمیت — سید ابرار حسین ۲۴
- اسلام، انسانی خدمات اور عالمی منظر نامہ — مفتی منیب الرحمٰن ۳۴

## انسان دوست خدمات کے اصولی و عملی پہلو

- انسانی اقدار اور اسلام میں انسانی خدمات کی وسعت — مفتی عبدالمنعم فائز ۴۱
- اسلام اور انسانی خدمات: امکانات و مسائل — مولانا عبداللہ کھوسو ۵۹
- اسلام میں انسانی خدمات کے بعض نظری و عملی پہلو — مولانا محمد یٰسین ظفر ۷۴
- صدارتی کلمات — سید ابرار حسین ۸۵

## اسلام اور انسانی خدمات: شرعی و قانونی نقطۂ نظر

- بین الاقوامی انسانی امداد اور ریاستی قانون: ممکنہ تعارض اور حل کے لیے تجاویز — محمد رفیق شنواری ۹۱
- جنگ زدہ علاقوں میں انسانی خدمات اور مقاصدِ شریعت: ایک تجزیاتی مطالعہ — ڈاکٹر اشفاق احمد ۱۴۴

- صدارتی کلمات — مولانا محمد یٰسین ظفر ۱۶۱


## مکالمہ: انسانی خدمت میں درپیش رکاوٹیں اور مذہب کا مطلوب کردار


- مکالمہ: انسانی خدمت میں درپیش رکاوٹیں اور مذہب کا مطلوب کردار —
ڈاکٹر سید محسن نقوی، مولانا ڈاکٹر احمد بنوری، شجاع الدین شیخ ۱۶۷


## اسلام اور انسانی خدمات کی معاصر صورتیں


- اسلام اور عصر حاضر میں انسانی خدمات — ڈاکٹر شہزاد چنا ۱۷۹
- اسلام میں انسانی خدمت کی اہمیت — ڈاکٹر عائشہ جدون، ڈاکٹر عمر سلیم ۱۹۵
- ریاستِ مدینہ میں انسانی خدمات کے لیے وسائل کی فراہمی —
ڈاکٹر حافظ وقاص خان، اسامہ حمید ۲۰۲
- صدارتی کلمات — محمد عبد الشکور ۲۲۰


## پاکستان میں انسانی خدمات امکانات و مسائل


- غیر جانبدار انسانی خدمات اور پاکستان میں اطلاق — اقصیٰ تصغیر ۲۲۵
- سمندری حدود و علاقہ جات میں انسانی خدمات: پاکستانی اور بین الاقوامی
تناظر میں — ڈاکٹر ملیحہ زیبا خان ۲۴۳
- پاکستان میں انسانی خدمات: نوعیت اور مسائل — راحیلہ خان ۲۶۴
- صدارتی کلمات — کنور وسیم ۲۸۲


## مذہب، انسانی خدمات اور انسان دوست تنظیمیں


- مکالمہ: مذہب، انسانی خدمات اور انسان دوست تنظیمیں — عمیر حسن،
محمد عبد الشکور، ڈاکٹر شاہدہ نعمانی، پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد ۲۸۹

## بلاامتیاز انسانی خدمات: دینی مدارس کا کردار


- مکالمہ—بِلاامتیاز انسانی خدمات: دینی مدارس کا کردار—
ڈاکٹر سید عزیزالرحمٰن، ڈاکٹر عمیر محمود صدیقی، مولانا ڈاکٹر زبیر اشرف عثمانی،
مفتی عبدالرحیم ۳۰۳
- خصوصی گفتگو—مولانا محمد حنیف جالندھری ۳۱۵
- حرفِ آخر—ڈاکٹر ضیاءاللہ رحمانی ۳۲۰

## پیش لفظ

# عالمی انتظام میں برابری اور تعاون کی اہمیت

خالد رحمٰن

انسانی زندگی میں جنگ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ انسانی زندگی۔ جنگ کیوں ہوتی ہے اس کے اسباب پر تفصیلی گفتگو کا یہاں موقع نہیں ہے لیکن اگر سرسری طور پر غور کیا جائے تو دوسروں پر بالادستی کی خواہش، ان کے وسائل پر قبضہ کا لالچ، حملہ کا خوف، انتقام کی خواہش اور ایک بار کوئی تنازعہ چھڑ جائے تو ردعمل اور جوابی ردعمل اس کے نہ صرف تاریخی اسباب رہے ہیں بلکہ آج کی جنگوں میں بھی بنیادی طور پر یہی عوامل کارفرما نظر آتے ہیں۔ ان اسباب کی روشنی میں یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ آنے والے دنوں میں بھی جنگوں کا سلسلہ جاری ہی رہنا ہے۔

دوسری جانب جنگ کہیں بھی ہو اور کوئی بھی ہو، تباہی لاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر گزرتے دن کے ساتھ جنگ زیادہ مہلک ہوتی جارہی ہے اور یہ اس کے باوجود ہے کہ جنگ کے حوالہ سے اسے روکنے کے لیے گزشتہ سو برس کے دوران کئی بین الاقوامی قوانین اور ادارے بھی وجود میں آچکے ہیں۔ ان قوانین میں، ہر ملک کی سرحدوں کا احترام، جنگ چھیڑنے کے لیے قانونی جواز کی موجودگی، اس قانونی جواز پر کسی قانونی اتھارٹی [اقوام متحدہ] کا اطمینان، جنگ سے قبل تمام پرامن ذرائع کا استعمال اور طاقت کے استعمال کو جنگ کا مقصد پورا ہوتے ہی روک دینا شامل ہے۔

اس پس منظر میں آج کی دنیا میں جب ہم سلامتی کے نظام کو یقینی بنانے، جنگ کو روکنے اور اس کے لیے بین الاقوامی تعاون، امن اور یگانگت کی بات کرتے ہیں تو فوراً اقوامِ متحدہ کی تنظیم کا

خیال آتا ہے جو اس وقت قائم نظام کی تشکیل اور قیام میں ایک کلیدی کردار رکھتی ہے۔ بلاشبہ اس ادارے نے کسی نہ کسی درجہ میں جنگوں کو روکنے میں کچھ پیش رفت بھی کی ہے اور کم از کم بڑی طاقتوں کے درمیان کوئی براہ راست جنگ گزشتہ سات دہائیوں کے دوران نہیں ہوئی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں جنگوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری ہے۔ کیا آئندہ ایسی کوئی صورت ہو گی کہ اقوام متحدہ کسی بڑے بریک تھرو میں کامیاب ہو جائے؟

اس سوال کے جواب میں مناسب ہو گا کہ اس موقع پر ہم اس تنظیم اور اس کے تناظر میں موجودہ عالمی ماحول ور جحانات کے بعض پہلوؤں پر نظر ڈال لیں۔

---

اقوامِ متحدہ کا قیام ۱۹۴۵ میں عمل میں آیا، اس وقت کے مباحث پر غور کرنے سے بڑی دلچسپ صورتِ حال سامنے آتی ہے۔ امریکہ، سویت یونین، فرانس اور برطانیہ جنگ عظیم دوم جیتنے والے ممالک میں شامل تھے اس بنیاد پر ان کا مطالبہ تھا کہ ہمارے پاس ویٹو پاور ہونی چاہیے۔ ان کے پاس اس مطالبے کے حق میں ایسے دلائل بھی تھے جو دُنیا کے سامنے پیش کیے گئے، مگر اس وقت کے امریکی صدر ہیری ایس ٹرومین نے اس ضمن میں اپنی جو یادداشت لکھی ہے، وہ ایک اہم حقیقت تک ہماری رسائی میں بہت معاون ہے۔[1]

ٹرومین کے مطابق اس موقع پر ان کا کہنا تھا کہ دنیا میں امن کے قیام کے لیے جو بھی انتظام ہونے جارہا ہے، اس میں امریکہ کے پاس ویٹو پاور ہونا لازم ہے اور اس کی غیر موجودگی میں امریکی سینٹ اس انتظام کو قطعاً قبول نہیں کرے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر ہمیں بطور ایک طاقت ور ملک یہ اختیار حاصل نہ ہوا تو ہمارے قومی مفادات کو ٹھیس پہنچے گی اور ہمیں اس صورت میں اقوامِ متحدہ قبول نہیں۔

---

[1] Truman, Henry S., "1945–Year of Decisions. Memoirs: Volume 1," New York: Doubleday & Co. (1955); 470

گویا دیگر ممالک کے سامنے صرف دو امکانات تھے۔ایک یہ کہ اقوامِ متحدہ کو ایک ایسے چارٹر کے ساتھ تسلیم کر لیں جس میں ان طاقت ور ممالک کو ویٹو کا اختیار دیا گیا ہو اور دوسرا یہ کہ اقوامِ متحدہ کا قیام ہی عمل میں نہ آئے۔اس ماحول میں تشکیل پانے والی اقوامِ متحدہ کی تنظیم سے کارکردگی کی توقع ایک خاص حد تک ہی رکھی جا سکتی ہے۔

دوسری جانب طویل عمر پانے والے امریکہ کے ۳۹ویں صدر جمی کارٹر نے اپریل ۲۰۱۹ تجزیہ کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ میری (اس وقت کے امریکی صدر) ڈونلڈ ٹرمپ سے امریکہ چین تعلقات کے حوالے سے بات چیت ہوئی۔اس بات چیت میں صدر ٹرمپ نے اس فکر مندی کا اظہار کیا کہ چین بہت تیزی سے ترقی سے کر رہا ہے۔اس نسبت سے کارٹر صاحب نے اپنا تجزیہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ امریکہ دنیا کی تاریخ میں سب سے بڑی جنگجو قوم ہے۔امریکہ کی دو سو چالیس سالہ تاریخ میں، بقول جمی کارٹر، صرف سولہ سال امن کے ہیں۔باقی تمام سال جنگ کے ہیں۔ان کا کہنا تھا کہ امریکی ریاست گزشتہ چند دہائیوں میں ان جنگوں میں پانچ ٹریلین ڈالر خرچ کر چکی ہے، جب کہ چین کا معاملہ یہ ہے کہ اس نے ۱۹۷۹ سے اب تک جنگ لڑنے میں ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کیا۔[۲] ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک درست اعداد و شمار اس سے مختلف ہوں لیکن اعداد و شمار کی بحث سے قطع نظر بھی یہ حقیقت تو اپنی جگہ موجود ہے۔

اگر عالمی نظام بشمول اقوام متحدہ میں امریکہ کی حیثیت اور اس کے اس طرزِ عمل کو پیش نظر رکھا جائے تو مذکورہ نکات گویا اس حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں کہ 'میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی'۔

---

[2] Hurt, Emma, "President Trump Called Former President Jimmy Carter to Talk about China, NPR, April 15, 2019 https://www.npr.org/2019/04/15/713495558/president-trump-called-former-president-jimmy-carter-to-talk-about-china

جنگوں اور ان کی تباہی کی تاریخ کی ہی طرح انسانی زندگی میں ہمدردی، تعاون اور خیر خواہی کی بھی تابناک مثالیں ہمیشہ ہی موجود رہی ہیں۔ الہامی مذاہب ہوں یا زندگی کے بارے میں دیگر نظریات، انسانوں کے لیے امن اور سلامتی کی خواہش اور اس کے لیے کوئی نہ کوئی لائحہ عمل ان سب کی جانب سے ہی پیش کیا جاتا رہا ہے اور ان کے ماننے والے اس پر اپنے اپنے انداز میں عمل بھی کرتے رہے ہیں۔

اس تناظر میں جہاں یہ ضرورت ہے کہ جنگوں کے سلسلہ کو روکنے کی کوششیں جاری رہنی چاہییں وہیں اس پر بھی غور و فکر اور اہتمام ضروری ہے کہ اگر جنگ چھڑ ہی جائے تو انسانوں میں موجود خیر خواہی اور خدمت کے جذبات کو استعمال کرتے ہوئے جنگوں کے نتیجہ میں ہونے والے نقصانات اور ہلاکتوں کو کس طرح کم از کم کیا جائے؟ انسانیت کے حوالہ سے یہ وہ سوال ہے جس نے IHL یعنی بین الاقوامی قوانین انسانیت کو جنم دیا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ IHL کے حوالہ سے دنیا بھر میں سرگرم تنظیموں اور اداروں میں سب سے نمایاں نام انٹرنیشنل کمیٹی آف دی ریڈ کراس (International Committee of Red Crescent) کا ہے۔ جنگ سے یا کسی بھی اور سبب سے ہونے والی تباہی کو کم کرنے کی کوششوں کے لیے عالمی سطح پر قانون سازی ہو یا میدانِ عمل میں براہ راست خدمتی سرگرمیاں آئی سی آر سی کے غیر معمولی کردار کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے۔

آئی سی آر سی کا بنیادی حوالہ قوانین انسانیت ہیں؟ یہ کس طرح وجود میں آئے ہیں ان کا آپریشنل میکنزم کیا ہے؟ اور کس حد تک کامیاب ہیں یہ وہ سوالات ہیں جن سے ہر اس شخص کو دلچسپی ہونی چاہیے جو کسی بھی درجہ میں انسانی جانوں کی ہلاکتوں کو روکنا یا کم از کم کرنا چاہتا ہے؟

اسلام کے ماننے والوں کے لیے اس کی اہمیت اس اعتبار سے غیر معمولی ہے کہ قرآن مجید میں انسانی جان کی حرمت پر زور دیتے ہوئے ایک انسان کی جان بچانے کو پوری انسانیت کی جان بچانے سے تعبیر کیا گیا ہے [المائدہ: ۳۲]- غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس آیت میں جان بچانے

کے ذکر میں کسی بھی طرح سے وقت اور مقام (time & space) کی قید نہیں ہے۔ یعنی بعض مخصوص صورتوں سے قطع نظر [جن پر علیحدہ سے گفتگو ہونی چاہیے] یہ تاکید عموم کے طور پر بیان ہوئی ہے۔ اس میں مذہب، رنگ و نسل یا کسی اور شناخت کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے۔

اسی عموم کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جان کو یہ خطرات خواہ روز مرہ زندگی میں کسی حادثہ یا بیماری کی صورت میں لاحق ہوں یا تصادم اور جنگی صورتحال کی بناء پر، ان سے متاثرہ ہر انسان کی مدد کرنے کی تاکید ہے۔ چنانچہ جنگ کے دوران زخمی ہونے والے فوجی ہوں یا قیدی اور یا جنگ اور کسی قدرتی آفت یا وباء کی بناء پر آنے والی تباہی کی بناء پر بے گھر ہونے والے اور خوراک وادویات کی قلت کے شکار لوگ، اسلام کے ماننے والوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ آگے بڑھ کر ان کی مدد کریں گے۔

اس مجموعی پس منظر کو سامنے رکھا جائے تو اپنی سپرٹ کے اعتبار سے آئی سی آر سی ایک نہایت غیر معمولی ادارہ ہے۔ اس کے قیام [۱۸۶۳] کو اب تو ۱۵۹ سال ہو گئے ہیں اور اس وقت اس کی رُکنیت دنیا کے ۱۹۲ ممالک پر محیط ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی یہ حیثیت بن چکی ہے کہ دنیا میں بعض استثنائی صورتوں کو چھوڑ کر شاید ہی کوئی ایسی جنگ یا مسلح تصادم ہوتا ہو جہاں ICRC کوئی کردار ادا نہ کرے۔ اور یہ اس لیے ممکن ہوا ہے کہ ICRC نے اپنے اس کردار کے لیے تکریمِ انسانیت کے حوالے سے بہت اہم اصول وضع کیے ہوئے ہیں۔ ان اصولوں میں انسانیت، غیر جانبداری، غیر وابستگی، اتحاد، رضاکارانہ خدمت، خود مختاری اور عالمگیریت شامل ہیں اور ان کی بھرپور پابندی نے اس ادارہ کے اعتبار (credibility) کو دنیا بھر میں قابل قبول بنایا ہے۔

مندرجہ بالا حقائق کو ذہن میں رکھتے ہوئے اگر مختلف عالمی اداروں کا آئی سی آر سی سے موازنہ کیا جائے تو آئی سی آر سی اور دیگر اداروں کی ساخت اور ان کے اہداف میں فرق ہے۔ اقوام متحدہ کی جانب سے گزشتہ ۷۵ سالوں میں ویٹو پاور کے استعمال نے عالمی سطح پر کسی بھی انتظام کے بارے میں ایک بے اعتباری پیدا کر دی ہے۔ یہ بے اعتباری کہ اس نظام کی تشکیل انسانی فائدے اور امن کے لیے نہیں، بلکہ کچھ مخصوص ممالک کے مفادات کے لیے کی گئی ہے۔ جبکہ آئی سی آر سی

کی تشکیل سب کے مفادات کو پورا کرنے کے لیے کی گئی ہے جو کہ اس کے نام اور علامات (ریڈ کرسٹل، ریڈ کریسنٹ، ریڈ کراس) اور تکریم انسانیت کے لیے اس کے اختیار کردہ اصولوں سے ظاہر ہے۔ دوسری جانب دنیا میں مذہب کو بدنام کرنے کے لیے کی جانے والی شعوری اور غیر شعوری کوششوں کو ردّ کر کے ریڈ کراس اور ہلالِ احمر کی تحریک تمام مذاہب کو اہمیت دے رہی ہے جو کہ آج کی دنیا کی بہت بڑی ضرورت ہے۔

اس پس منظر میں یہ جاننا اور دہرانا بہت ضروری ہے کہ جب آئی سی آر سی یا وسیع تر تناظر میں ریڈ کراس اور ہلالِ احمر کی تحریک کے بارے میں بات ہو تو اسے دیگر بین الاقوامی اداروں کی طرح سمجھنے کی بجائے اسے خود اس کے اپنے اصولوں کے ہی تناظر میں دیکھا جائے۔ اور جس حد تک ممکن ہو اس کے ساتھ تعاون پر مبنی پروگرام تشکیل دیا جائے۔

---

یہ وہ سیاق و سباق ہے جس میں انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اور آئی سی آر سی نے باہم اشتراک سے پروگرامات کا آغاز کیا ہے۔ ICRC کے مقاصد ہوں یا وہ اصول جن کی بنیاد پر یہ کام کرتی ہے اپنی اسپرٹ کے اعتبار سے اسلام کے اصولوں سے متصادم نہیں بلکہ عمومی طور پر مطابقت رکھتے ہیں۔ تاہم ہمارے یہاں ایک عام آدمی ہی نہیں اچھے خاصے تعلیم یافتہ لوگوں کی بھی اس سے واقفیت کم کم ہی ہے۔ حالانکہ مسلم دنیا کے لیے تو انہیں جاننے کی اہمیت اس اعتبار سے اور بھی زیادہ ہے کہ آج کے مسلح تنازعات میں بہت سی جگہ پر وہ براہِ راست ہدف ہیں اور جانی و مالی نقصان برداشت کر رہے ہیں۔

زیر نظر کتاب انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اور انٹرنیشنل کمیٹی آف ریڈ کراس کے مشترکہ پروگرامات کے تسلسل میں کچھ عرصہ قبل منعقد ہونے والی ایک کانفرنس کے مقالات و مباحث پر مبنی ہے۔ کانفرنس کا ہدف ایک جانب آئی سی آر سی کی سرگرمیوں سے تعارف تھا لیکن اس سے کہیں بڑھ کر، انسانیت، احترام انسانیت اور خدمت خلق کے حوالہ سے اسلامی تعلیمات کی روشنی

میں تفہیم اور تعاون واشتراک کے ان مواقع کی جانب توجہ دلانا تھا جو مسلمان تنظیموں اوران کی قیادت کے ساتھ ساتھ آئی سی آر سی کے لیے یکساں طور پر اہم ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ معاشرے کے قائدین اور بالخصوص دینی مناصب کے اہل افراد مل بیٹھ کر بات کریں تو باہم افہام و تفہیم، تعاون، اور ترقی کی راہیں کھلتی ہیں۔

آئی سی آر سی کے طرزِ عمل میں یہ بات بڑی خوش آئند ہے کہ یہ تنظیم تشہیر سے دور رہتی ہے، اور یقیناً یہ اس تحریک کا بہت دانشمندانہ فیصلہ ہے۔ کسی بھی مشکل صورتِ حال میں متحارب یا مخالف فریقوں سے رابطہ رکھنا، ان میں سے ہر ایک کی حکمتِ عملی سے واقف ہونا، اور پھر اپنی غیر وابستگی اور غیر جانبداری کی بنیاد پر معلومات کو راز رکھنا، ایک بڑا امتحان ہوتا ہے۔ اسی طرح کسی بھی خاص فرد یا ادارے کو مقدم رکھنے کی بجائے اپنے مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے غیر محسوس انداز میں فعال کردار ادا کرنا اس تحریک کی کامیابی اور اس پر عالمی اعتماد کی ایک وجہ ہے۔ آئی سی آر سی کے مشن اور کارکردگی کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کے کام کو سمجھنے کی اشد ضرورت ہے۔

دوسری جانب اسلام آفاقی اور عالمگیر مذہب ہے۔ اس کے پیروکاروں کو اس قابل ہونا چاہیے کہ وہ اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں ہر دور کے مسائل کو حل کرنے کے قابل ہوں اور آگے بڑھ کر قیادت کر سکیں۔ اس مقصد کے لیے ایسے تعمیری رویّے کی ضرورت ہے جس میں توانائیاں باہم تکرار و تصادم میں صرف نہ ہوں۔

دنیا اپنی رفتار سے اپنی طے کردہ سمت میں مسلسل آگے بڑھ رہی ہے۔ ٹیکنالوجی کی پیش رفت اور نت نئے ہتھیاروں کی دستیابی سے جنگوں کی نوعیت مسلسل تبدیل ہو رہی ہے۔ ایسے میں خود بین الاقوامی قوانین انسانیت سے متعلق اداروں سے رابطہ اور ان سے جڑے موضوعات پر بھی مسلسل غور و خوض کی ضرورت ہے۔ اسلامی اسکالرز اس غور و فکر کا حصہ ہوں گے تو وہ اسلام کے آفاقی تعلیمات کو بھی اس میں زیادہ بہتر طور پر سمو سکیں گے۔

یوں اس بات کو دہرانے کی ضرورت ہے کہ مثبت علمی و عملی سرگرمی کی بنیاد پر ہی کوئی تعمیری کردار ادا کیا جا سکتا ہے۔ محض نکتہ چینی اور احتجاج سے اپنے موقف کا اظہار تو ہو سکتا ہے اور شاید وقتی طور پر کسی تسلسل میں رخنہ بھی ڈالا جا سکے لیکن اس کے ذریعے قیادت حاصل نہیں کی جا سکتی۔ اس پس منظر میں کانفرنس میں یہ اہتمام تھا کہ مختلف مکاتیب فکر کی قیادت اور اسکالرز کے ساتھ میدان عمل میں مصروف تنظیموں کے ذمہ داران بھی شریک ہوں۔

کانفرنس کے مقالات ومباحث کو مرتب کرنے کا ایک بڑا مقصد تو کانفرنس کے پیغام کو وسیع تر حلقے تک پہنچانا ہوتا ہے۔ البتہ اس نوعیت کی کسی compilation میں ایک الجھن یہ ہوتی ہے کہ ہر مقالہ میں اپنے مخصوص موضوع کے ساتھ ساتھ کانفرنس کی مرکزی تھیم بھی جھلک رہی ہوتی ہے۔ یوں بعض چیزوں کی تکرار ہوتی ہے۔ اس کا ایک حل تو یہ ہے کہ مقالات میں خاصی کتر بیونت (substantial editing) کر دی جائے۔ بعض صورتوں میں یہی مناسب ہوتا ہے۔ البتہ کانفرنس کے ماحول اور وہاں ہونے والی کارروائی کی دستاویز بندی بھی ایک ہدف ہو تو اِس سے گریز ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس کتاب کی ترتیب میں مرتبین نے مقالات میں صرف ضروری ترامیم کی حکمت عملی اختیار کی ہے۔

آئی پی ایس اور آئی سی آر سی کے اشتراک سے تیار ہونے والی یہ دوسری کتاب ہے۔ اس سے قبل ۲۰۲۱ میں ''اسلام اور تکریم انسانیت کے اصول'' شائع ہو چکی ہے۔ امید ہے باہم اشتراک سے ہونے والے یہ کام آئندہ بھی جاری رہیں گے اور اس طرح دنیا میں سلامتی کے لیے درکار ماحول کی تیاری اور اس کے لیے عملی اقدامات میں ہم اپنا حصہ ڈال سکیں گے۔

خالد رحمٰن

چیئر مین

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد

# اسلام اور انسانی خدمات

## چند اصولی مباحث

# ریڈ کراس اور ریڈ کریسنٹ کی تحریک

## بنیادی اصول اور مذاہب کے ساتھ مکالمہ

ڈاکٹر ضیاء اللہ رحمانی*

انسانی تاریخ میں تکریمِ انسانیت کا تصور اور خدمتِ انسانیت کی سوچ ابتدا سے ہی موجود رہی ہے۔ سورۃ المائدۃ کی آیات ۲۷ سے ۳۱ تک آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کے درمیان تصادم اور کرۂ ارض پر پہلے قتل کے بیان میں یہی ذکر ہے کہ جب قابیل نے اپنے بھائی کو قتل کیا اور نادم ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ایک کوّے کے ذریعے اس کی تربیت کی کہ کس طرح ایک انسان کی لاش کو احترام کے ساتھ دفن کرے۔

فَبَعَثَ اللَّهُ غُرَابًا يَبْحَثُ فِي الْأَرْضِ لِيُرِيَهُ كَيْفَ يُوَارِي سَوْءَةَ أَخِيهِ قَالَ يَا وَيْلَتَىٰ أَعَجَزْتُ أَنْ أَكُونَ مِثْلَ هَٰذَا الْغُرَابِ فَأُوَارِيَ سَوْءَةَ أَخِي فَأَصْبَحَ مِنَ النَّادِمِينَ

''پھر اللہ نے ایک کوّا بھیجا جو زمین کرید تا تھا تاکہ اسے دکھلائے کہ اپنے بھائی کی لاش کو کس طرح چھپانا ہے، اس نے کہا افسوس مجھ پر اس کوے جیسا بھی نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش چھپانے کی تدبیر کرتا، پھر پچھتانے لگا۔''

یہ انسان کی معلوم تاریخ میں humanitarian action کا پہلا واقعہ ہے۔ ہمیں معلوم

---

* ریجنل ایڈوائزر برائے اسلامی قانون وفقہ، انٹرنیشنل کمیٹی آف دی ریڈ کراس (آئی سی آر سی)

ہے کہ اللہ نے انسان کی تخلیق اور فطرت میں خیر کا داعیہ رکھا ہے۔فِطۡرَتَ ٱللَّهِ ٱلَّتِي فَطَرَ ٱلنَّاسَ عَلَيۡهَا[1] کے مصداق پیدا کردہ انسان اور اس کے بنائے ہوئے معاشروں میں انسانی خدمت کسی نہ کسی شکل میں ہمیشہ موجود رہی ہے۔بعثتِ نبوی سے پہلے حلف الفضول کا منعقد ہونا اور شرک و بت پرستی سمیت مختلف النوع برائیوں میں گھرے ہوئے معاشرے میں مظلوم اور بے سہارا کی مدد کرنے پر مکّہ کے سرداروں کا اتفاق کرنا خدمتِ انسانیت کے اسی فطری تصوّر کا تسلسل ہے۔

خدمتِ انسانیت کی تاریخ میں ۲۴ جون ۱۸۵۹ کو ایک نئے باب کا اضافہ ہوا جب ایک سوئس تاجر ہنری ڈونا اپنے تجارتی سفر میں شمالی اٹلی کے علاقے سلفرینو سے اس وقت گزرا جب اس جگہ فرانس اور آسٹریا کی فوجوں کے درمیان ۱۶ گھنٹے کی لڑائی ہوئی تھی۔ میدانِ جنگ زخمیوں اور لاشوں سے بھرا پڑا تھا۔ ہنری ڈونا(Henry Donna)نے قافلہ روک کر آس پاس کے علاقے سے لوگوں کو اکٹھا کیا، زخمیوں کی ممکن حد تک مرہم پٹی کی اور لاشوں کو دفن کیا۔اپنے سفر سے واپسی پر اس نے ۱۸۶۲ میں ایک چھوٹی سی کتاب لکھی جسے اس نے ''سلفرینو کی یادداشت'' کا عنوان دیا۔ اس مختصر کتاب میں اس نے جنگ سے متعلق اپنے تاثرات کے علاوہ دو تجاویز پیش کیں: ایک یہ کہ ایسی رفاہی انجمنوں کا قیام عمل میں لایا جائے جو عوام کی مالی مدد سے جنگوں کے دوران غیر جانبدارانہ رفاہی کام کریں۔ یہ تجویز ریڈ کراس اور ہلال احمر انجمنوں کی ابتداء ثابت ہوئی اور آج ایسی ۱۸۸ قومی انجمنیں موجود ہیں۔ دوسری تجویز یہ تھی کہ ایک ایسا بین الاقوامی معاہدہ کیا جائے جو ان انجمنوں کے رضاکاروں اور فوجی طبّی عملے کو میدان جنگ میں قانونی تحفظ دے سکے۔ یہ تجویز جنیوا معاہدات کی ابتداء ثابت ہوئی، جس کو آج دنیا کے ۱۹۲ ممالک تسلیم کر چکے ہیں۔

اس کتاب کی اشاعت پر سوئٹزرلینڈ میں پانچ نامور لوگوں نے ہنری ڈونا کی پُکار پر لبیک کہا اور ۱۸۶۳ میں جنیوا میں زخمیوں کی مدد کی بین الاقوامی انجمن کا قیام عمل میں لایا گیا، جو بعد میں بین الاقوامی ریڈ کراس کمیٹی بنی۔

---

[1] الروم: ۳۰

دوسری تجویز کی روشنی میں ۱۸۶۴ میں پہلا جنیوا معاہدہ ہوا جس میں ۱۲ ممالک شریک ہوئے۔ یہ معاہدہ جنگ میں زخمی ہونے والے فوجیوں کے تحفظ کے بارے میں تھا اور اس میں پہلے سے قائم کردہ انجمن کو جنگی حالات میں غیر جانبداری کی بنیاد پر انسانی خدمت کا اختیار دیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ مختلف ممالک میں قومی انجمنوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔

۱۸۶۵ میں خلافت عثمانیہ نے جنیوا معاہدے کی توثیق کی اور اپنے زیرِانتظام علاقوں میں آئی سی آر سی کو کام کرنے کی اجازت بھی دی۔ ۱۸۶۸ میں خلافتِ عثمانیہ نے اپنی قومی انجمن تشکیل دی۔ اس موقع پر سلطنت نے کراس کے نشان ( ✚ ) کو بطور علامت استعمال کرنے پر تحفظات کا اظہار کیا اور ہلالِ احمر ( ☾ ) کو بطور نشان اپنانے کا مطالبہ کیا، جو تحریک نے منظور کر لیا۔

گستاو موینے نے اس تشکیلی دور میں بطور صدر آئی سی آر سی اس تحریک کو عیسائیت کی بنیادی وابستگی سے بالاتر ایک آفاقی اور غیر مذہبی تحریک بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس لیے ترکی کے مطالبے پر ہلالِ احمر اور بعد ازاں ایران کے مطالبے پر سرخ شیر اور سورج کے نشان کو تحریک کے مسلمہ نشانوں کے طور پر مان لیا گیا۔ جب اسرائیل نے اپنی مذہبی حساسیت کی بنا پر نئے نشان کا مطالبہ کیا تو ابتدائی طور پر تو یہ مطالبہ رد کر دیا گیا۔ تاہم ۲۰۰۵ میں ریڈ کرِسٹل ( ◆ ) کو بھی تحریک کے ایسے نشان کے طور پر منظور کر لیا گیا جو کسی خاص نظریئے یا مذہب سے وابستگی پر دلالت نہیں کرتا۔

## ریڈ کراس کا نشان کیوں اپنایا گیا تھا؟

اس بارے میں معروف ترین روایت یہ ہے کہ آئی سی آر سی کے قیام کے وقت جب یہ سوال زیرِبحث آیا کہ تنظیم کے افراد اور متعلقات کے لیے کوئی امتیازی نشان ہونا چاہیے تو مختلف تجاویز پر غور کے بعد اتفاق ہوا کہ سوئٹزرلینڈ کے جھنڈے کو معکوس کر لیا جائے، یعنی اس پر موجود سفید نشان اور سرخ پس منظر کے برعکس سرخ نشان اور سفید پس منظر کو اپنا لیا جائے۔ اس امتیازی علامت کو پرچم، گاڑیوں اور تنصیبات پر نہ صرف آسانی سے بنایا جا سکے گا بلکہ دور سے نظر بھی آ سکے گا۔

اس تحریک کا آغاز سوئٹزر لینڈ سے ہونے، مرکزی کمیٹی کے سویس ارکان کے مسیحی ہونے اور کراس کی وجہ سے جو اشتباہ پیدا ہو سکتا تھا اس کو دور کرنے کے لیے تحریک نے انسانیت اور آفاقیت کے اصولوں پر زور دیا اور شروع سے تحریک کے معاملات سے مذہب یعنی عیسائیت کو دور رکھا۔ حالانکہ ہنری ڈونا خود ایک مذہبی آدمی تھا اور اس کے اندر فلاحِ انسانیت کے جذبات میں ایک اہم محرک مذہب ہی تھا۔ تحریک کی اس خصوصیت کو اس وقت کی دو مسلم حکومتوں خلافتِ عثمانیہ اور ایران نے تسلیم کیا اور یہ دونوں ریاستیں ابتدائی عرصے ہی میں اس کا حصہ بن گئیں۔ دونوں ریاستوں نے ۱۸۹۸ اور ۱۹۰۶ اور ۱۹۰۷ کے دوران ہونے والی ہیگ امن کانفرنسوں میں بھی بھرپور حصہ لیا تھا، جو اس تحریک اور اس سے متعلق قواعد و ضوابط کی تشکیل میں کلیدی حیثیت رکھتی ہیں۔

۱۹۴۹ میں ہونے والی سفارتی کانفرنس میں چار جنیوا معاہدات منظور ہوئے۔ اس کے بعد ۱۹۷۷ میں منعقدہ کانفرنس کے دوران دو اضافی معاہدے (additional protocols) منظور ہوئے۔ ان سب میں مسلمان ممالک کے سفراء نے بھرپور شرکت کی۔ افغانستان، مصر، ایران، پاکستان اور ترکی کے نام اس ضمن میں قابلِ ذکر ہیں۔

تحریک ریڈ کراس و ریڈ کریسنٹ کے تین عناصر ہیں: ریڈ کراس کی بین الاقوامی کمیٹی (آئی سی آر سی)، قومی انجمنیں، ریڈ کراس اور ریڈ کریسنٹ کی قومی انجمنوں کا بین الاقوامی فیڈریشن۔ تحریک کا ہر چار سال بعد بین الاقوامی اجتماع ہوتا ہے جس میں پچھلی مدت کا جائزہ اور آئندہ کام کی منصوبہ بندی کی جاتی ہے۔ عام فہم کے لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ آئی سی آر سی کا بنیادی دائرۂ عمل مسلح تصادم کی صورت میں خدمات کی انجام دہی ہے۔ قومی انجمنوں کا کام امن کے عرصے میں صحت اور ابتدائی طبّی امداد کے حوالے سے کام کرنا اور فیڈریشن کا کام قدرتی آفات کی صورت میں قومی انجمنوں کو اکٹھا کر کے خدمات سر انجام دینا ہے۔

چونکہ یہ تحریک اب ایک بین الاقوامی تحریک ہے اور اس میں تمام مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ شامل ہیں، اس لیے اس کے کام کو زیادہ سے زیادہ مقبول بنانے اور اس کو اپنے بنیادی مقاصد سے مربوط رکھنے کے لئے تحریک نے شروع سے ہی ایسے اصول وضع کیے جن پر عمل کر کے اس خالص انسانی خدمت کے کام کو کسی بھی ایسے انحراف سے بچایا جاسکے، جس سے تحریک کے بنیادی مقصد پر آنچ آتی ہو۔ ان اصولوں کو تکریمِ انسانیت کے اصول (humanitarian principles) کہا جاتا ہے۔

اصولِ تکریمِ انسانیت ایک ایسی جامع اصطلاح ہے جو ریڈ کراس اور ہلالِ احمر کی تحریک کے ان سات اصولوں کا احاطہ کرتی ہے جو تحریک کے دستور کا نافذ العمل حصہ ہیں، یعنی انسانیت، غیر وابستگی، غیر جانبداری، خود مختاری، رضاکارانہ خدمت، اتحاد اور عالمگیریت۔ یہ اصول ۱۹۵۶ میں آئی سی آر سی کے ڈائریکٹر برائے امورِ عامہ جین پکٹے (Jean Pictet) نے تجویز کیے تھے اور انہیں ویانا (آسٹریا) میں منعقدہ تحریک کی بین الاقوامی کانفرنس نے ۱۹۶۵ء میں اپنے دستور کا حصہ بنایا۔

۱۹۸۶ء میں ان اصولوں کو اس تحریک کے دستور کے نافذ العمل حصے کے طور پر شامل کیا گیا۔ لہٰذا اس کے بعد سے کسی بھی ملک کی قومی انجمن کو تسلیم کرنے کا معیار یہی اصول طے پائے ہیں۔ آئی سی آر سی کو ان اصولوں کی ترویج و اشاعت کی ذمہ داری دی گئی اور جنیوا معاہدات میں شریک ریاستوں کو پابند کیا گیا کہ وہ ان اصولوں کی پاسداری جنگ و امن دونوں حالتوں میں کریں گے۔

آئی سی آر سی ان اصولوں کی ترویج و اشاعت مختلف ذرائع سے کرتی رہی ہے اور اس کی کوشش یہ رہی ہے کہ ان اصولوں کے اندر بذاتِ خود جو آفاقیت ہے، اس کو نمایاں کیا جاسکے تاکہ مختلف تہذیبوں اور ادیان کے ماننے والے ان کو ایک مشترکہ ورثہ کے طور پر برتیں اور محض مغربی دنیا سے آئے ہوئے دوسرے نظریات کی طرح نہ سمجھیں۔ چونکہ آئی سی آر سی کی سرگرمی کا بڑا حصہ مسلم ممالک میں ہے اس لیے کچھ عرصہ قبل اس نے یہ فیصلہ کیا کہ بین الاقوامی قانونِ انسانیت اور اصولِ انسانیت کو اسلامی دنیا کے دینی اداروں اور شخصیات کے سامنے رکھا جائے اور ان

معاملات پر اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت حاصل کی جائے۔ اس سلسلے میں مسلمان اہلِ علم کے ساتھ مقامی سطح پر بحث و تمحیص کے علاوہ قومی اور بین الاقوامی سطح کے پروگرام منعقد کیے گئے۔ پاکستان میں بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی نے اس سلسلے میں اہم کردار ادا کیا۔ ۲۰۰۴ء اور پھر ۲۰۱۴ء میں اسلامی یونیورسٹی اور آئی سی آر سی کے اشتراک سے دو بین الاقوامی کانفرنسیں ہوئیں جن میں کثیر تعداد میں مسلمان علماء اور ماہرین بین الاقوامی قانون نے شرکت کی۔ ان میں جنگ کے حوالے سے بین الاقوامی قوانین اور انسانی خدمات کے حوالے سے غیر جانبداری اور آزادی کے اصولوں کو اسلام کے تناظر میں موضوعِ بحث بنایا گیا۔ اس کے علاوہ سیمینارز، کانفرنسز اور تربیتی کورسز کا انعقاد مختلف سطحوں پہ ہوتا رہا۔ اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز (آئی پی ایس) اور آئی سی آر سی نے ۲۰۱۹ میں ایک دوروزہ سیمینار میں پاکستان بھر سے اہلِ علم کے ایک منتخب گروہ کو اکٹھا کیا اور اسلام کے اصولِ انسانیت کو غور و فکر کا موضوع بنایا۔ اس سیمینار میں جو بحث و تمحیص ہوئی اس کا خلاصہ ایک کتاب کی صورت میں شائع ہوا، جس کا عنوان ہے ''اسلام اور تکریمِ انسانیت کے اصول: ریڈ کراس اور ہلالِ احمر تحریک کے بنیادی اصول اور اسلامی نقطۂ نظر''۔

اس کے علاوہ مختلف اسلامی ممالک کے علماء اور اسلامی تعلیمی و فکری اداروں کے ساتھ بین الاقوامی قانونِ انسانیت، اصول تکریمِ انسانیت اور انسانی خدمت کے حوالے سے اسلام کے نقطۂ نظر پر مختلف نوعیت اور مختلف سطح کے پروگرامات ہوتے رہتے ہیں۔ اس اشتراکِ عمل کے مقاصد میں باہمی تعارف؛ باہمی تعاون کے لیے مشترکات کو نمایاں کرنا؛ اسلام، اسلامی اداروں اور علماء سے خدمتِ انسانیت کی بہتر راہوں کی رہنمائی لینا؛ علماء اور اسلامی اداروں کے ذریعے مسلمان ممالک و معاشروں میں خدمتِ انسانیت کی ضروریات سمجھنا؛ اور متاثرہ علاقوں اور افراد تک رسائی کے لیے مدد حاصل کرنا شامل ہیں۔

موجودہ کاوش بھی اسی تسلسل کا حصہ ہے۔ بزرگ علماء، نوجوان اہلِ علم اور طلبہ و طالبات کے ساتھ ہونے والا یہ مکالمہ بعض غلط فہمیوں کو دور کرے گا، انسانی خدمت کے لیے اشتراک کو

مزید فروغ دینے کا باعث ہوگا اور عوام میں اسلام کے تصوّرِ خدمت اور موجودہ عالمی انتظام کی ہم آہنگی کی تفہیم میں اضافہ کرے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حقیقت کو سمجھنے اور نیک مقاصد میں ایک دوسرے کا دست و بازو بننے کی توفیق دے۔ آمین

# انسان دوست خدمات کا مفہوم اور دائرہ عمل

## غیر وابستگی، غیر جانبداری اور خود مختاری کی اہمیت

سید ابرار حسین*

دنیا کے تمام مذاہب نے اپنے نظام فکر و عمل میں انسان کو مرکزی اہمیت دی ہے۔ انسان ہی وہ محور ہے جس کے گرد دنیا کی تمام تہذیبیں گردش کر رہی ہیں۔ اگرچہ بعض مذہبی تعلیمات میں انسانی اختراعات کے نتیجے میں پیدا شدہ افراط و تفریط کی نشان دہی کی جا سکتی ہے لیکن انسان کا احترام، انسان سے محبت، انسان کے حقوق اور اس کے مقام و مرتبہ پر دنیا کے تمام مذاہب متفق ہیں۔ انسان طبعاً بھی اور اپنی ضروریاتِ زندگی کے لیے بھی سماجی زندگی گزارتا ہے۔

بقول شاعر:

مہر و ماہ و انجم کی بے نیازیاں توبہ!
دوست ہو کہ دشمن ہو، آدمی غنیمت ہے

لیکن اگر سماج میں رہنے والوں سے اس کا رویہ خالص مادی ہو تو اجتماعی زندگی بے سکونی، ظلم اور ناانصافی کا شکار ہو جاتی ہے۔ دنیا کے بیشتر مذاہب نے انسان کو یہ احساس دلا کر اس کی زندگی کے مطمعِ نظر کو تبدیل کر دیا ہے کہ موجودہ زندگی، آئندہ زندگی کا ایک پڑاؤ ہے۔

---

*سابق سفیرِ پاکستان۔ وائس چیئرمین، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز (آئی پی ایس)، اسلام آباد

ایک معروف روایت دنیا و آخرت کے باہم تعلق کو یوں بیان کرتی ہے: أَلدُّنْيَا مَزْرَعَةُ الْآخِرَةِ یعنی دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ اس احساس کے ساتھ انسان کا ہدف اس دنیا تک محدود نہیں رہتا بلکہ وہ اپنے گرد موجود اشیاء، حالات اور تعلقات کو ایک وسیع تر تناظر میں پرکھنے اور برتنے لگتا ہے۔

اسلام نے بالخصوص جو نقطۂ نظر دیا ہے اس کے مطابق انسان اس کرّۂ ارض پر ایک ذمہ دار یعنی خلیفہ ہے اور اس کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس دنیا اور اس کے رہنے والوں کے لیے، ان کی دنیا کی زندگی اور اس دنیا کے بعد کی زندگی کی آسائشوں کے لیے فکر مند رہے اور اس بات کا ہر ممکن اہتمام کرے کہ زمین سے فتنہ و فساد کو دور کیا جا سکے۔ یہ درست ہے کہ ایک مسلمان کی اس خیر خواہی کا تقاضا ہے کہ وہ تمام افراد کو اس دین کی جانب دعوت دے جسے وہ پورے یقین کے ساتھ انسانوں کے لیے ان کے خالق کا حقیقی اور آخری پیغام سمجھتا ہے لیکن اس کے لیے یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ انسان کو عقیدے کی آزادی کا حق بھی اسی خالق کی جانب سے ودیعت کردہ ہے اور یہ کہ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ۔[1]

ایک مبنی بر انسانیت معاشرے کی تشکیل اسی صورت میں ممکن ہے کہ وسیع تر انسانی معاشرے میں رہنے والے تمام افراد ایک دوسرے کی عزت، وقار اور جان و مال کی حفاظت کو یقینی بنائیں۔

اگرچہ ہمدردی، رحم اور مدد کا جذبہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی سرشت میں رکھا ہے اور اس کا عملی مظاہرہ ہمیں انسانیت کے تمام ادوار، تمام علاقوں اور ہر قسم کے حالات میں ملتا ہے لیکن گذشتہ کچھ عرصہ کے دوران انسانی خدمت یا humanitarian action کو ایک ایسے مستقل شعبے کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے جس کے اپنے اصول، اہداف اور طریق ہائے کار ہیں۔ بین الاقوامی ریڈ کراس کمیٹی کے سات بنیادی اصولوں یعنی انسانیت، غیر جانبداری، غیر وابستگی، اتحاد، رضاکارانہ خدمت، خود مختاری، اور عالمگیریت کو اگر سمجھنے کی کوشش کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان اصولوں کے

---

[1] البقرة: ١١٩

وضع کرنے میں یہ احتیاط برتی گئی ہے کہ ان پر وہ مذہبی اور تہذیبی چھاپ نہ رہے جس سے اس تحریک کا آغاز ہوا تھا۔ تاہم ان میں سے بھی تین اصول ایسے ہیں جو ان بنیادی اصولوں یعنی fundamental principles میں سے بھی کلیدی اصول یعنی core principles سمجھے جاتے ہیں۔ اس لیے ان تین اصولوں کو سمجھنا اور ان پر مقامی تناظر میں بات چیت کرنا اہم ہے۔ یہ تین اصول غیر وابستگی یعنی impartiality، غیر جانبداری یعنی neutrality، اور خود مختاری یعنی independence ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ان تمام اصولوں کی بنیاد یا اصل الاصول انسانیت ہے اور ان تمام اصولوں کا مقصد مصائب اور مشکلات کی صورت میں انسانوں کی بلا امتیاز خدمت ہے۔ اسی تسلسل میں دسمبر ۱۹۹۱ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ایک قرارداد منظور کی جو یہ مطالبہ کرتی ہے کہ انسانی خدمت کی تمام سرگرمیوں میں انسانیت، غیر جانبداری اور غیر وابستگی کے اصولوں کی بنیاد پر معاونت فراہم کی جائے۔ یہ تینوں اصول ریڈ کراس اور ہلال احمر کی عالمی تحریک اور مصائب میں امداد فراہم کرنے والی پانچ سو سے زائد تنظیموں نے اپنا رکھے ہیں۔ بہر حال یہ سمجھنا چاہیے کہ تمام تنظیمیں ان اصولوں کی تشریح و تنفیذ ایک ہی طرح سے نہیں کرتیں اور کئی مواقع پر ان میں مقامی ثقافت، روایات یا خود تنظیم کی اقدار و روایات کی جھلک نظر آتی ہے، تاہم ان اصولوں نے انسانی خدمت کے شعبے کو بالعموم متاثر کیا ہے۔ میری کوشش ہو گی کہ ان تین کلیدی اصولوں کو اختصار لیکن وضاحت سے متعارف کرواسکوں۔

غیر وابستگی کا اصول شہریت، نسل، مذہبی عقائد، طبقے یا سیاسی آراء کی بنیاد پر عدم امتیاز پر مبنی ہے۔ اس کا عملی مطلب یہ ہے کہ انسانی خدمت میں ترجیحات کے تعین کا واحد عامل لوگوں کی ضرورت اور فوری توجہ ہو۔

ہم سب ہی اس بات سے واقف ہیں کہ زلزلہ، سیلاب یا خشک سالی کی صورت میں مختلف تنظیموں سے وابستہ جو رضاکار امدادی سامان لے کر کسی علاقے میں پہنچتے ہیں وہاں بالعموم مقامی با اثر افراد کی طرف سے یہ دباؤ ہوتا ہے کہ ایسے افراد یا علاقوں میں امداد پہلے پہنچائی جائے جہاں ان کا

اثر ورسوخ زیادہ ہو۔اسی طرح خود بعض رضاکاروں کی دلچسپی اس میں ہوسکتی ہے کہ ان لوگوں کو مدد فراہم کرنے میں ترجیح دی جائے جو انہیں کسی ذاتی وابستگی کی بنیاد پر خود سے قریب تر محسوس ہوتے ہیں۔اگر ذاتی یا گروہی اغراض مصیبت زدہ انسانوں کی فوری ضرورت پر ترجیح حاصل کر لیں تو ایسی سرگرمی سیاسی یا ذاتی تو ہوسکتی ہے لیکن اسے انسانی خدمت کی سرگرمی نہیں کہا جاسکتا۔

غیر وابستگی عملی اور اخلاقی دونوں حوالوں سے اہم ہے۔آپ اس بات سے اتفاق کریں گے کہ جب آپ کسی اصول کی پاسداری کرنا چاہتے ہیں تو بہر حال آپ کو اس کے لیے اضافی کوشش کرنی پڑتی ہے۔مثلاً اگر آپ کسی اجنبی علاقے میں امدادی سرگرمی کے لیے گئے ہیں اور آپ غیر وابستگی کی بنیاد پر پہلے سے دستیاب حوالوں سے اعراض کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو اپنی غیر جانبدارانہ رائے بنانے میں وقت درکار ہوگا۔ایک ایسے وقت میں جب لوگ امداد کے لیے بے چینی سے منتظر ہوں، آپ کو اہل تر اور فوری مدد کے مستحق افراد کے تعین کے لیے لوگوں سے بات کرنے، انہیں سن کر مختلف حوالوں سے تجزیہ کرکے ان کی حقیقی ضروریات کو سمجھنے اور یہ تعین کرنے میں وقت لگے گا کہ کس کو کیا دیا جانا چاہیے۔اسی طرح اگر آپ ایک ایسے علاقے میں خدمت کے لیے جارہے ہیں جہاں کچھ لوگ پہلے سے آپ سے وابستگی محسوس کرتے ہیں اور اس بنیاد پر ترجیح حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس اصول کے مطابق عمل کرنے پر آپ اپنے ذاتی تعلقات کو داؤ پر لگا رہے ہوں گے۔یہ بہر حال طے ہے کہ بالآخر نہ صرف آپ کو خود طمانیت کا احساس ہوگا بلکہ بالعموم لوگ اس اندازِ کار کو سراہیں گے بھی۔

آپ یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ غیر جانبداری کی اصل روح عدم امتیاز ہے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ انسانی خدمت کا اصل جوہر عدم امتیاز ہی ہے۔جب آپ کے پیشِ نظر بیمار، کمزور، مسکین، مصیبت زدہ یا بے کس انسان ہے تو اس وقت انسانیت کا تقاضا یہ ہے کہ اس پڑتال میں پڑے بغیر کہ ایسے فرد کی شناخت یا وابستگی کیا ہے، اس کی فوری اور ہر ممکن مدد کی جائے۔اس کی سب سے نمایاں صورت تو جنگی حالات میں نظر آتی ہے، جب عدم امتیاز اور غیر جانبداری کا اصول یہ تقاضا کرتا ہے

کہ مسلح تصادم یا خانہ جنگی کے دوران دوست اور دشمن سب ہی کو ان کی ضرورت کے بقدر امداد کا مستحق سمجھا جائے۔ گویا ہر ممکن کوشش کی جانی چاہیے کہ امداد و معاونت سے متعلق ہر فیصلہ تعصبات، ذاتی پسند و ناپسند اور ترجیحات کو پسِ پشت ڈال کر صرف حقائق ہی کی بنیاد پر کیا جائے۔

کسی تنازع یا داخلی کشمکش کے دوران زیرِ حراست افراد، بیمار اور زخمی افراد بالعموم سب سے زیادہ مشکل صورتِ حال میں ہوتے ہیں اور بیشتر صورتوں میں اپنے لیے مدد کے حصول کے لیے کوشش بھی نہیں کر سکتے۔ اسی طرح خواتین، بزرگوں اور بچوں کے حوالے سے بھی یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ وہ امتیازی سلوک کا نشانہ نہ بن جائیں۔ ضروری نہیں کہ عدم امتیاز کا مطلب سب کے لیے مساوی مدد ہی ہو۔ دیکھا یہ جائے گا کہ کون مدد کا کس قدر حق دار ہے اور کس کی ضرورت کتنی فوری ہے۔ اسی بنیاد پر امداد کی نوعیت، مقدار اور ترجیح کا تعین ہو گا۔

انسانی خدمت کی تنظیموں کو اس بات کا اہتمام کرنا چاہیے کہ وہ ہمہ وقت اپنے وابستگان کی اس حوالے سے نہ صرف تربیت بلکہ نگرانی بھی کرتی رہیں کہ عدم امتیاز اور غیر وابستگی کا اصول پیشِ نظر رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک اجتماعی رویئے کی تشکیل کے لیے تنظیم یا ادارے کے قواعد و ضوابط، پیشہ ورانہ معیارات اور طریقِ کار کو ایسے تشکیل دیا جانا چاہیے کہ اس اصول کی ممکن حد تک پاسداری کو یقینی بنایا جا سکے۔

میں نے اس جانب اشارہ کیا تھا کہ جب انسان کا مطمعِ نظر اس دنیا اور اس کے فوری و وقتی فوائد سے ہٹ کر وسیع تر اور دیرپا مقصد کی جانب مبذول ہو جائے تو وہ ذاتی غرض و خواہش سے بالاتر ہو کر سوچ سکتا ہے۔ اس کا عملی اظہار اسلام کے تشکیل کردہ اس کردار میں ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا إِنَّا نَخَافُ مِن رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَمْطَرِيرًا [2]

''اور وہ اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔ (اور اُن سے کہتے ہیں کہ) ہم تمہیں صرف اللہ کی خاطر کھلا رہے ہیں، ہم تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ۔ ہمیں تو اپنے رب سے اُس دن کے عذاب کا خوف لاحق ہے جو سخت مصیبت کا انتہائی طویل دن ہوگا۔''

ایسے میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ غیر وابستگی کا یہ مطلب ہر گز نہیں ہے کہ انسانی خدمت میں مصروف افراد اپنی ذاتی وابستگیوں اور رجحانات کی نفی کر دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسا تو ممکن ہی نہیں ہے۔ مثلاً اسلام سے وابستگی یا وطن سے محبت ایسے عوامل ہیں جو انسان کی شخصیت کا جزو ہوتے ہیں، اور یہ ممکن نہیں کہ انسانی خدمت کی کسی سرگرمی میں اپنے دین سے وابستہ افراد یا اپنے اہلِ وطن کی جانب کشش محسوس نہ ہو۔ ایسے میں غیر وابستگی کا مطلب یہ ہے کہ ان ذاتی اغراض کو پسِ پُشت ڈال کر عملاً مصیبت زدہ افراد کی ضرورت کا پاس کیا جائے۔ یاد رہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں قحط کے وقت تیار کھجوریں اور ۵۰۰ دینار اس وقت بھیجے تھے جب چند ہی ماہ قبل قریش نے مدینہ پر حملہ کیا تھا۔[3]

دوسرا اہم اصول غیر جانب داری کا ہے جو غیر وابستگی سے جُڑا ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے ادارے، تنظیمیں اور افراد جو انسانی خدمت میں مصروف ہوں وہ سیاسی، نسلی، مذہبی یا نظریاتی تقسیم کا حصہ نہ بنیں۔ تمام لوگوں کا اعتماد مسلسل حاصل رکھنے کے لیے کسی تفریق، تقسیم یا چپقلش کی صورت میں فریق نہ بننا نہایت اہم ہے۔

غیر جانبداری کا مطلب نہ تو غیر فعالیت یا لاتعلقی ہے اور نہ ہی بے حسی۔ دراصل یہ ایک

---

[2] الدھر: ۸تا۱۰

[3] السرخسی، شمس الائمہ محمد بن احمد، شرح کتاب السیر الکبیر، دار الکتب العلمیۃ، ۱۹۹۷، ج ۱، ص ۷۰

ایسی عملی ضرورت ہے جس کی بنیاد پر انسانیت کے خدمت گار تمام فریقوں کا اعتماد حاصل کر پاتے ہیں۔ کسی تنازع، چپقلش یا تلخی کے ماحول میں یہی غیر جانبداری کام آتی ہے اور رضاکار اس تنازع کے دونوں طرف کے کمزور افراد تک پہنچ پاتے ہیں، امدادی کاروان لے جا سکتے ہیں، قیدیوں سے مل سکتے ہیں اور ان کا رابطہ ان کے عزیزوں سے بحال کروا سکتے ہیں، اور اسی اصول کی وجہ سے ان پر فریقین میں سے کسی کے حملے کا خطرہ کم ہوتا ہے۔ اگر کسی تنازع کے فریق انسانی خدمت کی سرگرمی کو یا ایسی تنظیم کو دوسرے فریق کے حق میں سمجھنے لگ جائیں یا خود تحریک کے رضاکار خود کو کسی ایک فریق کی جانب جھکاؤ سے نہ روک سکیں تو بعض اوقات اس کے نتائج سنگین بھی ہو سکتے ہیں۔

غیر جانبداری کے اصول پر عمل آسان نہیں ہے۔ حالات کے تناؤ اور جذبات کی شدت میں بھی انسانی خدمت میں مصروف افراد کو خود پر قابو رکھتے ہوئے ذاتی احساسات و خیالات کے اظہار سے گریز کرنا پڑتا ہے تاکہ ان کے مقصد کو ٹھیس نہ پہنچے۔ بعض صورتوں میں یہ افراد اپنی رائے میں غیر جانبدار نہیں ہوتے لیکن اپنے عمل میں انہیں بہر حال غیر جانبداری ہی کو اپنانا ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا [4]

''اور تمہیں کسی قوم کی عداوت اس پر نہ اُبھارے کہ تم انصاف نہ کرو۔''

غیر جانبداری کا مطلب یہ تو ضرور ہے کہ تنازع کا حصہ نہ بنا جائے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ سنگین انسانیت سوز معاملات پر بھی خاموشی اختیار کر لی جائے۔ ظلم اور بدسلوکی کا راستہ روکنا بھی انسانیت کے احترام اور انسانی خدمت کا ایک لازمہ ہے۔ اسی طرح ان تنظیموں کے لیے قیدیوں، مہاجرین، پناہ گزینوں، اور دیگر کمزور طبقات سے متعلق بہتر قوانین کے لیے آواز اٹھانا یا صحت و سلامتی سے متعلق امور کے حوالے سے کوشش کرنا بھی غیر جانبداری کے منافی نہیں ہے۔

---

[4] المائدہ:۸

موضوع سے متعلق تیسرا اہم اصول خود مختاری ہے۔ غیر جانبداری اور غیر وابستگی کے اصول پر قطعاً عمل ممکن نہیں ہے اگر انسانی خدمت کی سر گرمی خود مختار نہ ہو اور اسے اپنی ترجیحات کے تعین میں آزادی حاصل نہ ہو۔ انسان دوست انجمنوں کو اس قابل ہونا چاہیے کہ وہ انسانیت اور انسانوں کی ضرورت ہی کی بنیاد پر اپنے فیصلے کر سکیں اور کسی سیاسی، فوجی یا دیگر قوت کے تابع نہ ہوں۔ وسیع تر مفہوم میں خود مختاری کا مطلب یہ ہے کہ ہر رضاکار ایسی سیاسی، نظریاتی یا معاشی مداخلت کی کوشش کی مزاحمت کرے، جو انسانیت، غیر جانبداری اور غیر وابستگی کے بنیادی اصولوں پر عمل میں رکاوٹ بنے۔

پہلے ذکر کردہ دونوں اصولوں پر عمل مشکل ضرور ہے لیکن چونکہ ان دونوں کا انحصار خود مختاری کے اصول پر ہے اس لیے یہ بات سمجھنا آسان ہے کہ انسانی خدمت میں مشکل ترین کام خود مختاری کا تحفظ ہے۔ انسانی خدمات کے لیے ہمیشہ وسائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ وسائل فراہم کرنے والے چاہے کوئی بااثر افراد ہوں، سیاسی گروہ ہوں یا حکومتیں، بیشتر صورتوں میں ان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اس امداد کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کریں۔ بالخصوص جب سوچ کا دائرہ مادی دنیا تک محدود ہو تو بے لوث انسانی خدمت کا امکان محدود تر ہو جاتا ہے۔ اس لیے شدید اور فوری ضرورت کی کیفیت میں بھی ایسی مالی مدد حاصل کرنے سے انکار کرنا جو بعض سیاسی، نسلی یا مذہبی اہداف کے ساتھ مشروط ہو، ایک منضبط، مفید اور دیرپا انسانی خدمت کے لیے ضروری ہے۔ یہ فیصلہ جس قدر مشکل محسوس ہوتا ہے، حقیقت میں اس سے زیادہ مشکل ہے۔ جب بھی امداد یا امدادی سر گرمی کو کسی خاص گروہ کی طرف موڑنے کی کوشش کی جاتی ہے تو یقیناً دلیل کی خاطر کچھ ایسے لوگ ضرور پیش کیے جاتے ہیں جو اسی گروہ میں انتہائی ضرورت مند ہوتے ہیں۔ انسان دوست اور خدا خوف فرد کے لیے یہ بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ بعض مصیبت زدہ افراد سے اعراض کرے۔ لیکن ایسی کسی بھی صورتِ حال میں وسیع تر مفاد کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ اپنی آزادی و خود مختاری پر اصرار کیا جائے اور کوئی ایسی صورت نکالی جائے جس میں ضرورت مند افراد محروم

بھی نہ رہیں اور خود مختاری کا بھی ہر ممکن حد تک تحفظ کیا جا سکے۔ اگر کوئی تنظیم اپنی امدادی سرگرمی کو عوامی یا سیاسی دباؤ کی بنیاد پر ترتیب دینے لگے تو شاید اسے کوئی فوری فائدہ مل جائے لیکن ایسی مثال قائم کر کے یہ تنظیم ایک کھلونا بن جائے گی، جس پر رفتہ رفتہ عوام کا اعتماد باقی نہیں رہے گا۔

وہ عوامل جو کسی انسان دوست تنظیم یا تحریک کی خود مختاری پر اثر انداز ہو سکتے ہیں، ان میں سب سے زیادہ پُر زور عامل حکومتوں سے تعاون کرنے کی ضرورت اور بہت سی صورتوں میں حکومتی اجازت اور معاونت کی ضرورت ہے۔ بہت سے سانحات یا تنازعات میں انسان دوست تنظیموں کے لیے یہ لازم ہو جاتا ہے کہ وہ حکومتوں کے ساتھ مل کر کام کریں۔ کم از کم حکومتی ہدایات اور قوانین کی پابندی تو ان پر بہر حال لازم ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ حکومتوں کے لیے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ان تنظیموں کی سرگرمیوں پر کسی بھی حقیقی یا من گھڑت بنیاد پر پابندی لگا دیں۔ تاہم خود مختاری کا تقاضا یہ ہے کہ حکومتوں کے ساتھ کام کرتے ہوئے یا ان کی جانب سے کسی کام کی درخواست کی صورت میں بھی انسان دوست تنظیمات اپنے فیصلے خود کریں اور ان میں انسانیت، غیر وابستگی، غیر جانبداری اور خود مختاری کے اصولوں کی پاسداری کریں۔ اسی طرح کسی ایسے علاقے میں یا آبادی کے کسی ایسے طبقے میں جہاں متعلقہ حکومت کسی وجہ سے امداد پہنچنے سے روکنا چاہتی ہو، امداد فراہم کرنے کی ممکنہ صورتوں کی مسلسل تلاش بھی انسانی خدمات کے لیے ضروری ہے۔ گویا جہاں بھی سیاسی مفادات متصادم ہوں، وہاں خود مختاری کا تحفظ دو دھاری تلوار پر چلنے کے مترادف ہے۔

حالیہ عرصے میں یہ مشکل بار بار پیش آ رہی ہے کہ حکومتیں اور عطیات دینے والے بین الاقوامی ادارے انسانی خدمات کو اپنے سیاسی و تزویراتی مقاصد کے حصول کا ایک بڑا ذریعہ سمجھنے لگ گئے ہیں۔ حکومتوں نے مصیبت زدہ افراد کی مدد کو اپنے لیے عوامی سفارت کاری کا ذریعہ سمجھ لیا ہے اور اس ماحول سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بہت سی تنظیمیں اور افراد انسانی خدمت کو ذاتی تشہیر اور منفعت کے لیے استعمال کرنے لگ گئے ہیں۔ ایسے میں مختلف انسان دوست تنظیمات کا باہم ربط و

ضبط بہت ضروری ہے تاکہ وہ انسانوں کی ضرورت کو بنیاد بنا کر کم وقت اور وسائل میں زیادہ مؤثر مدد فراہم کر سکیں۔ اگر اسلام کے تناظر میں بات کی جائے تو بھلائی اور خدا خوفی کے امور میں باہم تعاون اور ناانصافی و زیادتی کی صورتوں میں عدم تعاون کا رویہ کسی بھی خود مختار انسانی خدمت کے لیے ضروری ہے۔

---

انسانی خدمت کے یہ وہ اصول ہیں جو کسی بھی منضبط اور پیشہ ورانہ انسان دوست سرگرمی کے لیے اہم ہیں۔ اس بات کا اظہار دوبارہ ضروری ہے کہ ان سب کا مقصد انسانیت کی بھلائی، فلاح، اور ہمدردی ہے۔ نیز یہ کہ یہ اصول اس وقت کام کرتے ہیں جب معاشرے میں بالعموم یا کم از کم معاشرے کے ایک قابلِ ذکر طبقے میں انسان دوستی اور خدا خوفی کی بنیاد پر رضاکارانہ خدمات کا جذبہ موجود ہو۔

اس سب کے ساتھ ساتھ ہمیں اس بات سے آگاہ رہنا چاہیے کہ ہم ایک ایسے ماحول میں بات کر رہے ہیں جہاں گذشتہ دو دہائیوں کے دوران اسلام کی بنیاد پر قابلِ قدر انسانی خدمات سرانجام دینے والی بیشتر تنظیموں اور اداروں پر پابندی لگائی گئی ہے۔ یہ اقدامات دراصل سیاسی و تزویراتی مقاصد کے تحت کیے گئے ان اقدامات کا حصہ تھے جن کے ذریعے عالمی استعمار دنیا بھر میں اسلام کو اور دنیا کے لبرل طبقات بالعموم مذہب کو مطعون ٹھہرانا چاہتا ہے۔ اس صورتِ حال میں بھی اسلام سے روشنی لینے والے افراد اور اداروں کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ اس بات کو پیشِ نظر رکھیں کہ وہ ربّ العالمین کے بندے ہیں اور ان کے لیے رحمۃ للعالمین ﷺ کی سیرت لائقِ اتباع ہے۔

# اسلام، انسانی خدمات اور عالمی منظر نامہ


## مفتی منیب الرحمٰن *


بد قسمتی سے دنیا میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مذہب اور بالخصوص اسلام خالص انسانی بنیادوں پر دکھ، درد اور کرب کے ازالے اور انسانیت کو راحت پہنچانے کی سوچ سے متفق نہیں ہے اور شاید مظلوموں اور تکلیف میں مبتلا افراد کی مدد کے مواقع پر مسلمان بھی مذہب کی بنیاد پر تفریق کا رویہ اپناتے ہیں۔ ایسے تمام افراد کو میں یقین دلاتا ہوں کہ ایسا ہر گز نہیں ہے۔ اللہ کریم نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

فَلَا اقۡتَحَمَ الۡعَقَبَةَ وَمَا أَدۡرَاكَ مَا الۡعَقَبَةُ فَكُّ رَقَبَةٍ أَوۡ إِطۡعَامٌ فِي يَوۡمٍ ذِي مَسۡغَبَةٍ يَتِيمًا ذَا مَقۡرَبَةٍ أَوۡ مِسۡكِينًا ذَا مَتۡرَبَةٍ[1]

''مگر وہ گھاٹی پر سے ہو کر نہ گزرا اور تم کیا سمجھے کہ گھاٹی کیا ہے؟ کسی (کی) گردن کا چھڑانا یا بھوک کے دن کھانا کھلانا، یتیم رشتہ دار کو یا فقیرِ خاکسار کو۔''

اس آیتِ کریمہ میں جب مختلف لوگوں کو خیر پہنچانے کا ذکر فرمایا گیا ہے تو یہ تخصیص نہیں کی گئی کہ جس کی گردن چھڑائی جائے، یا فقر و فاقہ میں مبتلا جس شخص کو کھانا کھلایا جائے، یا جس یتیم کے سر پر ہاتھ رکھا جائے، یا جس مسکین کی مدد کی جائے اس کا مسلمان ہونا شرط ہے۔ بلکہ اللہ تعالی نے انسانی بنیادوں پر ان مظاہر و مصارف کو وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ فرمانِ باری ہے:

---

* صدر، تنظیم المدارس اہلِ سنّت، پاکستان

[1] البلد: ۱۱تا۱۶

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا[2]

''اور باوجود یہ کہ ان کو خود بعام کی خواہش (اور حاجت) ہے، فقیروں اور یتیموں اور قیدیوں کو کھلاتے ہیں۔''

اس آیت میں بھی مسکینِ مسلم، یتیمِ مسلم اور اسیرِ مسلم کا ذکر نہیں ہے بلکہ ہر یتیم، مسکین اور اسیر انسان پر خرچ کرنے کو اسلام نے اعلیٰ انسانی قدر قرار دیا ہے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اَلْخَلْقُ عِیَالُ اللّٰہِ[3] یعنی مخلوق حقیقی اعتبار سے اللہ کی کفالت میں ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ مالک و رازقِ حقیقی ہے لیکن عالمِ اسباب میں اس نے سبب اور مسبب کا ایک رشتہ اور نظام قائم کیا ہے۔ لہٰذا فرمایا کہ تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے عیال کے لیے بہتر ہو۔ اور اس سلسلے میں بھی مسلمان کی تخصیص نہیں کی گئی۔ اسی طرح ایک حدیث میں فرمایا:

خَيْرُ النَّاسِ مَنْ يَّنْفَعُ النَّاسَ[4]

''لوگوں میں سے بہترین وہ ہے جو انسانیت کو نفع پہنچائے۔''

اس بارے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی درجے میں ہر انسان دوسرے انسان کو نفع پہنچا رہا ہوتا ہے تو اس کا دوسروں کے مقابلے میں بہتر ہونا کیسے ممکن ہے؟ معجم طبرانی کی ایک حدیث اس اشکال کو دور کرنے میں معاون ثابت ہوئی، جس کے الفاظ یوں ہیں کہ ''خَيْرُ النَّاسِ أَنْفَعُهُمْ لِلنَّاسِ''[5] یعنی انسانوں میں سے بہترین وہ ہے کہ جو انسانیت کے لیے سب سے زیادہ نفع رساں ہو۔

---

[2] الدھر: ۸

[3] المشکوۃ: ۴۲۵

[4] کنزالاعمال، ج۸: ۲۰۱

[5] طبرانی، المعجم الاوسط: ۵۷۸۷

یعنی انسان کا نفع رسانی میں جو درجہ ہوگا، وہی اس کی فضیلت کا بھی درجہ ہوگا اور جس شخص سے مطلق کسی انسان کو خیر نہیں ملتی اس میں مطلق خیر نہیں ہے۔ اسی طرح جس سے کمالِ خیر ملتی ہے وہ کمالِ خیر کے مرتبے پر فائز ہے۔

آفات چاہے قدرتی ہوں، جیسے زلزلہ اور خشک سالی وغیرہ، یا انسان کی پیدا کردہ، جیسے جنگیں، ہمارے دین و مذہب میں ان آفات کے موقع پر رنگ، نسل اور مذہب کی تفریق سے بالاتر ہو کر انسانیت کی خدمت کرنا ایک اعلیٰ انسانی قدر ہے۔

البتہ یہ بات ہمیشہ پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اگر کسی بھی سرگرمی میں دہرے معیارات اختیار کیے جائیں یعنی عنوان کچھ اور رکھا جائے اور اس کے تحت مواد کچھ اور ہو تو یقیناً لوگوں کو تحفظات ہوں گے اور ان کے تحفظات کو بلاجواز بھی نہیں کہا جا سکتا۔ بدقسمتی سے ہمارے سامنے عالمی سطح پر ایسی مثالیں مسلسل سامنے آ رہی ہیں۔ ہمیں ایسی مثالوں کو بھی قائم ہونے سے روکنا چاہیے یا کم از کم اپنی استطاعت کے مطابق اپنی آواز بلند کرنی چاہیے جن میں بعض ممالک بعض دیگر ممالک کو سیاسی حربے کے طور پر ان کی بنیادی ضروریات اور حقوق سے بھی محروم کر دیتے ہیں تاکہ اس ملک کے باشندے محروم و مجبور ہو جائیں۔ میرے نزدیک کسی ایک ملک کو یہ حق دیا جانا بھی کہ وہ دوسروں کے وسائل پر جب چاہے قبضہ اور روک ٹوک کرے، انسانیت پر ظلم ہی کی ایک شکل ہے، جس کے خلاف اقوامِ عالم کو آواز بلند کرنی چاہیے۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

اَرِقَّاکُمْ اِخْوَانُکُمْ فَاَحْسِنُوْا اِلَیْھِمْ اِسْتَعِیْنُوْھُمْ عَلٰی مَا غَلَبَکُمْ وَاَعِیْنُوْھُمْ عَلٰی مَا غُلِبُوْا[٦]

"تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں، لہٰذا ان سے حسن سلوک کرو۔ جو کام تم سے نہ ہو سکے اس میں ان سے مدد لو، اور جو کام ان سے نہ ہو سکے اس میں ان کی مدد کرو۔"

[٦] مسند احمد: ۲۰۵۸۱

اسی طرح ارشاد فرمایا: ''جو خود کھاتے ہو ان کو بھی کھلاؤ، جو خود پہنتے ہو ان کو بھی پہناؤ اور ان پر ان کی طاقت سے بڑھ کر بوجھ نہ ڈالو۔''[7]

اس لیے کم از کم بنیادی انسانی ضروریات کی ضمانت ہر ایک کے لیے دستیاب ہونی چاہیے اور ریاستوں کو ان کے تحفظ کا انسانی بنیادوں پر انتظام کرنا چاہیے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

مَنْ تَرَكَ مَالاً فَلِوَرَثَتِهٖ وَمَنْ تَرَكَ كَلًّا فَإِلَيْنَا[8]

''جو کوئی مال چھوڑ جائے وہ اس کے وارثوں کا ہے اور جو کوئی بوجھ چھوڑ جائے (قرض یا بال بچے) وہ ہماری طرف ہے۔''

دنیا میں اگر کوئی مزدوروں کے حقوق کے لیے اور ان کو کم از کم معیارِ زندگی فراہم کرنے کے لیے آواز بلند کرے گا تو اس کی آواز میں ہماری آواز بھی شامل ہوگی۔ اس لیے انسانیت کے تمام طبقات کے عقائد کا تحفظ بلا امتیاز اور تمام تعصبات سے بالاتر ہونا چاہیے۔

---

[7] المسلم: ۱۶۶۱

[8] المسلم: ۱۶۱۹

# انسان دوست خدمات کے
# اصولی و عملی پہلو

# انسانی اقدار اور اسلام میں انسانی خدمات کی وسعت

مفتی عبدالمنعم فائز*

اسلام کا لفظ سلامتی سے نکلا ہے۔ سلامتی کا یہ تصور پوری انسانیت پر محیط ہے۔ سیرت النبی ﷺ، احادیث مبارکہ، سیرت صحابہ اور تاریخِ اسلام کا مطالعہ بتاتا ہے کہ سلامتی کا یہ تصور ہمہ جہت، ہمہ گیر اور ہمہ وقت ہے۔ بہترین انسان اسے قرار دیا گیا جو دوسرے انسانوں کو نفع پہنچائے۔[1] دوسروں کے لیے وہی پسند کرنے کا حکم دیا گیا جو ایک فرد اپنے لیے پسند کرتا ہو۔[2] دوسرے انسانوں کو کھانا کھلانے کی تحسین قرآن مجید نے متعدد جگہ پر کی ہے۔[3] دوسروں کو نفع پہنچانے کے لیے اپنی پسندیدہ چیز صدقہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔[4] جو لوگ اہلِ اسلام سے لڑتے نہ ہوں ان سے بھلائی اور احسان کو پسند فرمایا گیا ہے۔[5]

---

* مدرس، جامعۃ الرشید کراچی

[1] خَيْرُ النَّاسِ مَنْ يَنْفَعُ النَّاسَ (علی بن مالک، کنز العمال، ج۸، حدیث ۴۲۱۵۴)

[2] لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى يُحِبَّ لِأَخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ (محمد بن اسماعیل البخاری، صحیح بخاری، ج۱، کتاب ۲، حدیث ۱۳)

[3] الانسان:۸

[4] لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (آل عمران:۲۹)

[5] لَا يَنْهَاكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ (الممتحنۃ:۸)

سیرت النبیؐ کے مطالعہ سے تو یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ وہ قریش مکہ جن کی اذیت رسانی کی وجہ سے حضور ﷺ کو ہجرت کرنا پڑی، آپ ﷺ نے ان کی درخواست پر یمن سے آنے والی گندم ان کو بھیجنے کا حکم دے دیا جسے حکمتِ عملی کے تحت روک لیا گیا تھا۔ اپنے گردوپیش کی خبر گیری اور خیال رکھنے پر اس حد تک اصرار ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ جو شخص یہ جانتے ہوئے پیٹ بھر کر سورہے کہ اس کا پڑوسی بھوکا ہے، تو خدا کی قسم وہ مومن نہیں، خدا کی قسم وہ مومن نہیں، خدا کی قسم وہ مومن نہیں۔[6] مزید یہ کہ یہ جذبۂ رحم انسانوں تک محدود نہیں ہے بلکہ ایک مسلمان کے گردوپیش کی ہر شے اس کی موجودگی سے راحت پاتی ہے۔ درخت یا پودے سے کسی انسان یا حیوان کے پھل کھانے پر خندہ پیشانی کو صدقہ قرار دے کر ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے۔[7]

انسانیت کی خدمت کا یہ تصور حالتِ جنگ میں بھی ہے۔ دورانِ جنگ جہاں بزرگوں، راہبوں، خواتین اور لڑائی میں حصہ نہ لینے والوں کو نقصان پہنچانے سے منع کیا گیا وہاں فصلیں اجاڑنے اور بلا ضرورت درخت کاٹنے سے بھی روکا گیا ہے۔ اس مقالے میں اسلامی تاریخ خصوصاً سیرت النبی ﷺ اور احادیث کی روشنی میں انسانی خدمات کی روایت اور وسعت کا جائزہ لیا جائے گا۔

## قرآن مجید اور انسانی خدمات

اسلام نے انسان کو اس کی کھوئی ہوئی عزت اور وقار لوٹایا ہے۔ رنگ و نسل اور مسلک و مذہب کی تقسیم سے ماوراء ہو کر انسانوں کو ایک دوسرے کا احترام کرنے کی تلقین کی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً[8]

---

[6] سلیمان بن احمد طبرانی، معجم کبیر، ج ۱۲، ص ۱۱۹، حدیث ۱۲۷۴۱

[7] محمد بن الخطیب التبریزی، المشکوۃ المصابیح، کتاب ۶، حدیث ۱۲۷

[8] النساء: ۱

"اے لوگو اپنے رب سے ڈرو، جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے کثیر تعداد میں مرد اور عورتیں پھیلائیں۔"

اسی لیے اسلام نے انسانیت کے ناطے ہر شخص کو بلا تفریق احترام دینے اور اس کی مشکلات دور کرنے کا حکم دیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ فائدہ پہنچانے کا یہ عمل اس فرد یا کسی دوسرے انسان سے فائدہ یا شکر گزاری حاصل کرنے کی غرض سے نہیں بلکہ خالصتاً اللہ کی رضا کے لیے کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

وَ يُطْعِمُونَ الطَّعامَ عَلى حُبِّهِ مِسْكِيناً وَيَتِيماً وَأَسِيراً إِنَّما نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنْكُمْ جَزاءً وَلا شُكُوراً[9]

حضور ﷺ کے دورِ مبارک میں اکثر بلکہ تمام جنگی قیدی مشرکین ہی ہوتے تھے، اس کے باوجود قیدیوں کو کھانا کھلانا اللہ تعالی کی رضامندی کا سبب بتایا گیا اور مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلانے میں بھی کوئی تفریق نہیں کی گئی۔

قرآن مجید کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ نیکی کے کاموں میں مذہبی وابستگی سے بالاتر ہو کر باہم تعاون کرنا چاہیے۔ فرمانِ خداوندی ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللَّهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَائِدَ وَلَا آمِّينَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّن رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا وَإِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوا وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ أَن صَدُّوكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ أَن تَعْتَدُوا وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ[10]

---

[9] الإنسان: ۹،۸

[10] المائدۃ: ۲

''اے ایمان والو! نہ اللہ کی نشانیوں کی بے حرمتی کرو، نہ حرمت والے مہینے کی، نہ ان جانوروں کی جو قربانی کے لیے حرم لے جائے جائیں، نہ ان پٹوں کی جو ان کے گلے میں پڑے ہوں، اور نہ ان لوگوں کی جو اللہ کا فضل اور اس کی رضامندی حاصل کرنے کی خاطر بیت حرام کا ارادہ کر کے جا رہے ہیں۔ اور جب تم احرام کھول دو تو شکار کر سکتے ہو۔ اور کسی قوم کے ساتھ تمہاری یہ دشمنی کہ انہوں نے تمہیں مسجد حرام سے روکا تھا تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم ان پر زیادتی کرنے لگو۔ اور نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو اور گناہ و ظلم میں تعاون نہ کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ کا عذاب بڑا سخت ہے۔''

صلح حدیبیہ کے موقع پر مشرکین مکہ نے مسلمانوں کو حرم میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی تھی، اس پر مسلمان شدید غم وغصہ کی حالت میں تھے۔ اس موقع پر مسلمانوں کو باور کروایا گیا کہ ان کا رویہ انتقام پر نہیں بلکہ بھلائی پر مبنی ہونا چاہیے۔

## انسانی خدمات کی وسعت

انسانوں کے درمیان بھائی چارہ قائم کرنا اور انسانیت کی بنیاد پر دوسروں کے کام آنا یہ اسلامی اخلاق (ethics) کا وہ پہلو ہے، جس کی مثال دنیا کے کسی مذہب میں نہیں ملتی۔ انسانی خدمات (humanitarian action) کی کئی جہتیں اور پہلو ایسے ہیں جن کے بارے میں اسلامی تاریخ میں بڑی نمایاں، واضح اور روشن تعلیمات ملتی ہیں۔ مذہبی اختلاف کے باوجود دوسروں کی مدد کرنا، انہیں نوازنا، ان کی مشکلات دور کرنا اسلامی روایات کا ایسا پہلو ہے جس پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے۔

## کافر رشتہ داروں کی مدد

یہ درست ہے کہ انسان کے دل میں سب سے زیادہ ہمدردی بھی اپنے عزیزوں کے لیے ہوتی ہے اور حسنِ سلوک کی اوّلین توقع بھی انہی سے رکھی جاتی ہے۔ اگرچہ اسلام اپنے ماننے اور نہ ماننے

والوں کو دو گروہوں میں تقسیم کرتا ہے تاہم دین کی بنیاد پر یہ تقسیم ان کے غیر مسلم عزیزوں سے حسنِ سلوک میں رکاوٹ نہیں بنتی۔ اگر کوئی رشتہ دار کافر بھی ہو تو بھی اس کا اعزاز و اکرام کرنا چاہیے، اس سے صلہ رحمی کرنی چاہیے، اور تعاون و ہمدردی میں کمی نہیں کرنی چاہیے۔ اسماء بنت ابو بکرؓ فرماتی ہیں: ''میری والدہ جو مشرکہ تھیں، مجھ سے ملنے آئیں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ وہ مجھ سے کچھ توقع لے کر آئی ہیں، کیا میں ان کے ساتھ تعاون اور ہمدردی کر سکتی ہوں؟ آپؐ نے فرمایا: اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کرو۔[11]

امّ المومنین سیدہ صفیہؓ کے قریبی رشتہ دار یہودی تھے۔ آپ اپنی خدا ترسی کی بنا پر اپنے غلاموں اور باندیوں کے ساتھ حسن سلوک کرتی تھیں۔[12] اسی حسن سلوک سے آپؓ کی ایک باندی کو کچھ خدشہ لاحق ہوا اور اس نے امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ سے شکایت کی کہ سیدہ صفیہؓ اب بھی یوم السبت کو اچھا سمجھتی ہیں اور یہودیوں کے ساتھ صلہ رحمی کرتی ہیں۔ حضرت عمرؓ نے آپؓ سے دریافت کیا تو آپؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالی نے جب سے مجھے جمعہ عطا فرمایا ہے، میں نے یوم السبت کو کبھی بھی پسند نہیں کیا۔ رہے یہودی تو ان سے میرے قرابت کے تعلقات ہیں اور ان کو میں ضرور عطا کرتی ہوں۔ اس کے بعد آپؓ نے باندی سے پوچھا کہ کیا تم نے میری شکایت کی تھی؟ اس نے کہا: ہاں، مجھے شیطان نے بہکایا تھا۔ سیدہ صفیہؓ نے اسے سزا دینے کی بجائے آزاد کر دیا۔[13]

## کافر پڑوسیوں کا خیال رکھنا

پڑوسیوں کا خیال رکھنا، ان کے کام آنا، ان کی خوشی غمی میں شریک ہونا، اسلامی احکامات کا ایک اہم موضوع ہے۔ پڑوسی سے بلا تفریقِ مذہب حسنِ سلوک اسلامی روایت کا ایک اہم باب ہے۔ حضرت عائشہؓ نے حضور ﷺ سے پڑوسی کی مدد میں ترجیح کا سوال کیا تو آپؐ کا جواب دین کی

---

[11] صحیح بخاری، کتاب ۵۱، حدیث ۵۲

[12] خیر الدین الزرکلی، الاعلام، دار العلم للملایین، بیروت، ج ۲، ص ۳۰۲

[13] ابن عبد البر، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، کتاب النساء، ۴/۱۸۷۲

تفریق کی بنیاد پر نہیں تھا۔ حدیث میں ہے:

عَنْ عَائِشَةَ رضی اللہ عنہا قَالَتْ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ إِنَّ لِي جَارَيْنِ فَإِلَى أَيِّهِمَا أُهْدِي قَالَ "إِلَى أَقْرَبِهِمَا مِنْكِ بَابًا"[14]

"سیدہ عائشہؓ نے عرض کی: یارسول اللہ! میرے دو ہمسائے ہیں، ان میں سے کس کو ہدیہ بھیجوں؟ آپؐ نے فرمایا: جس کا دروازہ تمہارے گھر سے زیادہ قریب ہے۔"

یہی وہ رویہ ہے جس کا اظہار اس واقعہ سے ہوتا ہے جس کے مطابق حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے اپنے یہودی پڑوسی کے بارے میں دریافت کیا کہ کیا اس کے گھر میں بھی ہدیہ بھیجا جاچکا ہے؟

أَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عَمْرٍو، ذُبِحَتْ لَهُ شَاةٌ فِي أَهْلِهِ فَلَمَّا جَاءَ قَالَ أَهْدَيْتُمْ لِجَارِنَا الْيَهُودِيِّ أَهْدَيْتُمْ لِجَارِنَا الْيَهُودِيِّ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَقُولُ "مَا زَالَ جِبْرِيلُ يُوصِينِي بِالْجَارِ حَتَّى ظَنَنْتُ أَنَّهُ سَيُوَرِّثُهُ"[15]

"ایک دفعہ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کے ہاں بکری ذبح کی گئی۔ انہوں نے آتے ہی دریافت کیا کہ کیا تم نے ہمارے یہودی پڑوسی کے پاس بھی گوشت بھیجا ہے؟ کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جبریلؑ مجھے پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت کرتے رہے، یہاں تک کہ مجھے گمان ہونے لگا کہ پڑوسی کو وراثت میں حصہ دار بنادیا جائے گا۔"

## دشمن غیر مسلم سے حسن سلوک

سیرت النبی ﷺ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے ان غیر مسلموں سے بھی حسنِ سلوک کیا جنہوں نے آپؐ پر زمین تنگ کر دی اور آپؐ کے ساتھ جنگیں لڑیں۔ ثمامہ بن اثالؓ یمن کے رہائشی اور قبیلہ یمامہ کے سردار تھے۔ آپ کو صحابہ کرام نے گرفتار کیا اور مسجد نبوی میں

[14] صحیح بخاری، کتاب ۵۱، حدیث ۲۹

[15] ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ، الجامع الترمذی، کتاب ۲۷، باب ماجاء فی حق الجوار، حدیث ۴۹

ستون سے باندھ دیا۔ نبی ﷺ نے صحابہؓ کو ان سے حسنِ سلوک کی تلقین کی، ان کے لیے کھانا اور اپنی اونٹنی کا دودھ بھجوایا۔ تین دن تک آپؐ ان سے پوچھتے رہے: "ثمامہ! بتاؤ کیا خیال ہے؟" اور وہ کہتے: اے محمد (ﷺ)! میرے پاس خیر ہے۔[16] اگر آپ مجھے مار دیں گے تو ایسے شخص کو ماریں گے جو خونی ہے اور اگر احسان رکھ کر مجھے چھوڑ دیں گے تو میں آپ کا شکر گزار ہوں گا۔ اگر آپ مال چاہتے ہیں تو جتنا چاہیں طلب کریں۔ یہاں تک کہ تیسرے دن آپؐ کے حکم پر ثمامہ کو چھوڑ دیا گیا۔ وہ مسجدِ نبوی سے روانہ ہوئے اور غسل کر کے اسلام قبول کیا۔[17] اسلام قبول کرنے کے بعد آپؓ نے اہلِ یمامہ کو منع کر دیا کہ مکہ کی طرف کوئی بھی چیز نہ بھیجیں۔ غذائی قلت سے مجبور ہو کر اہلِ مکہ نے رسول اللہ ﷺ کی جانب مکتوب لکھا اور صلہ رحمی کی درخواست کی تو آپؐ کے حکم پر مکہ کے لیے غلہ جاری کر دیا گیا۔[18]

اس روایت سے معلوم ہوا کہ نہ صرف آپ نے اپنے شدید دشمن ثمامہ کے ساتھ بطور قیدی حسنِ سلوک کیا بلکہ قریشِ مکہ کی تمام تر دشمنی کے باوجود انہیں غذائی قلّت سے بچایا۔

اسی طرح غزوۂ بدر کے بعد سارہ نامی ایک عورت جو گا بجا کر پیسے کماتی تھی، مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ آئی۔ اس نے بتایا کہ وہ مسلمان ہو کر نہیں آئی، بلکہ وہ شدید مفلسی میں مبتلا ہے، کیونکہ جنگ بدر کے بعد قریش مکہ کی عیش و عشرت کی محفلیں ویران ہو چکی ہیں۔ اب کوئی اسے گانے بجانے کے لیے نہیں بلاتا۔ اس لیے مالی امداد حاصل کرنے کے لیے آئی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے بنو عبدالمطلب کو اس کی مدد کرنے کی ترغیب دی اور اس کو کچھ نقدی اور کپڑے دے کر رخصت کیا گیا۔[19]

---

[16] صحیح بخاری، حدیث ۴۳۷۲

[17] صحیح بخاری، کتاب ۶۴، باب وفد بنی حنیفہ، حدیث ۳۹۸

[18] ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ج ۲، ص ۶۳۹

[19] مفتی محمد تقی عثمانی، آسان ترجمہ قرآن، سورۃ الممتحنہ، تعارف، مکتبہ معارف القرآن، کراچی، ۲۰۱۲ء، ص ۱۱۶۹

# غیر مسلموں کی کفالت

اسلامی ریاست غیر مسلم شہریوں کو بھی عام مسلمانوں کی طرح ہی تمام حقوق کی ضمانت دیتی ہے۔ مسلمانوں کی طرح غیر مسلموں کی کفالت بھی ریاست کی ذمہ داری ہے۔ اگر کوئی کافر امداد کا محتاج ہے تو اسے اس لیے محروم نہیں کیا جائے گا کہ وہ غیر مسلم ہے۔ امام ابو یوسفؒ لکھتے ہیں: ''اسلامی ریاست میں بسنے والے چونکہ صرف مسلمان ہی نہیں، بلکہ غیر مسلم بھی ہوتے ہیں لہٰذا ریاست میں مقیم ہر مسلم و غیر مسلم کی کفالت اس نظام کا حصہ ہے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے عہد مبارک میں جب حیرہ فتح ہوا تو اس موقع پر ایک معاہدہ لکھا گیا جس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں کے لیے کفالتِ عامہ کا ذکر تھا۔ اس میں حضرت ابو بکر صدیقؓ نے لکھا: میں طے کرتا ہوں کہ اگر ذمیوں میں سے کوئی ضعیف ہو، کام نہ کر سکتا ہو، یا آسمانی یا زمینی آفات میں سے کوئی آفت اس پر آپڑے، یا ان کا کوئی مال دار محتاج ہو جائے اور اس کے اہل مذہب اس کو خیرات دینے لگیں، تو ایسے تمام افراد کا جزیہ معاف ہے۔ بیت المال سے ان کی اور ان کے اہل خانہ کی کفالت کی جائے گی۔ جب تک وہ دار الہجرۃ اور دار الاسلام میں مقیم رہیں گے۔'' دور فاروقی کا یہ واقعہ بھی اہم ہے: ایک بار حضرت عمرؓ نے ایک نابینا بوڑھے شخص کو بھیک مانگتے دیکھا، اس سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ وہ یہودی ہے۔ بھیک مانگنے کا سبب دریافت کیا تو اس نے جواب دیا کہ جزیہ کی ادائیگی، معاشی ضروریات اور پیرانہ سالی نے یہ حال کیا ہے۔ یہ سن کر آپؓ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے، جو کچھ وہاں موجود تھا اسے دیا اور پھر بیت المال کے خزانچی کے پاس فرمان بھیجا کہ اس کی اور اس جیسے دوسرے حاجت مندوں کی تفتیش کرو۔ اللہ کی قسم! ہم اس کے ساتھ انصاف نہیں کریں گے اگر اس کی جوانی کی محنت تو کھائیں مگر اس کے بڑھاپے میں اسے بھیک مانگنے کے لیے چھوڑ دیں۔ قرآن مجید میں ہے: إِنَّمَا ٱلصَّدَقَٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ وَٱلۡمَسَٰكِينِ، میرے نزدیک یہاں فقراء سے مراد مسلمان مفلس اور مساکین سے مراد اہل کتاب ہیں اور یہ سائل مساکینِ اہل کتاب میں سے ہے۔ اس کے بعد حضرت

عمرؓ نے اس کا جزیہ معاف کر دیا۔[20]

ایسے ہی واقعات حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دورِ خلافت میں بھی پیش آئے۔ امام ابو عبید قاسم بن سلامؒ لکھتے ہیں: حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے گورنر کو لکھا کہ لوگوں کے عطیے اور ہدیے ان کو دیدے۔ گورنر نے جواب دیا کہ میں نے عوام کے عطایا ان کو ادا کر دیے ہیں مگر بیت المال کی رقم بچی ہوئی ہے۔ تو آپ نے جواب بھیجا: ایسے مقروضوں کو تلاش کرو جنہوں نے کسی بے وقوفی یا فضول خرچی کے بغیر قرض لیا ہو، ان کا قرض ادا کر دو۔ گورنر نے جواب بھیجا: میں نے ایسے تمام افراد کے قرض ادا کر دیے ہیں، پھر بھی مسلمانوں کے بیت المال میں رقم بچ گئی ہے۔ آپ نے پھر لکھا: ایسے کنوارے تلاش کرو، جن کے پاس مال نہ ہو مگر وہ شادی کرنا چاہتے ہوں، ان کی شادی کرواؤ اور ان کا مہر ادا کرو۔ گورنر نے لکھا: میں نے جس کسی کو ایسا پایا، اس کا نکاح کرا دیا ہے۔ مگر پھر بھی بیت المال میں رقم باقی ہے۔ آپ نے فرمایا: ہر ایسے ذمی کو تلاش کرو جس پر جزیہ ہو اور اپنی زمین آباد کرنے سے عاجز ہو، اسے قرضہ دو تاکہ وہ اپنی زمین کا کام کرنے کے قابل ہو جائے، کیوں کہ ہم ان کو صرف ایک یا دو سال کے لیے ہی نہیں رکھنا چاہتے۔[21]

ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ایسے غیر مسلم جو بڑی عمر کو پہنچ چکے ہوں اور کمانے کی طاقت نہ رکھتے ہوں، ان کی کفالت بھی اسلامی حکومت کرے گی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے عدی بن ارطاۃ کے نام حکم نامہ جاری کیا کہ ذمیوں کے احوال جانیے، ان میں سے ایسے افراد جن کی عمر زیادہ ہو گئی ہے، طاقت جواب دے گئی ہے اور آمدنی ختم ہو گئی ہے، ان کو مسلمانوں کے بیت المال سے اتنا

---

[20] ابو یوسف القاضی یعقوب بن ابراہیم الانصاری البغدادی الفقیہ (۱۱۳-۱۸۲) کتاب الخراج، باب فی من یجب علیہ الجزیۃ، دار المعرفۃ، بیروت، ص ۱۶۲

[21] ابو عبید قاسم بن سلام بن عبداللہ الہروی البغدادی، کتاب الاموال، کتاب مخارج الفیء، باب تعجیل اخراج الفیء، دار الفکر، بیروت، ۱۴۰۸ھ، ج ۱، ص ۳۱۹، رقم ۶۲۵

روزینہ جاری کیجئے جوان کے لیے کافی ہو۔[22]

## غیر مسلموں کی ضیافت

حضور ﷺ کے پاس غیر مسلموں کا آنا جانا ہوتا تھا۔ آپؐ ان غیر مسلموں کا بھرپور اعزاز واکرام کرتے تھے۔ ایک بار ایسا ہی ایک مہمان آیا تو آپؐ نے اسے اپنی ساتوں بکریوں کا دودھ پلادیا جب کہ آپؐ نے خود بھی کچھ کھایا پیا نہ تھا۔[23]

حضور ﷺ کے پاس حبشہ کے عیسائیوں کا وفد بھی آیا۔ آپؐ نے اس وفد کو مسجد میں ٹھہرایا، ان کی مہمان نوازی خود کی اور فرمایا:

اِنَّهُمْ كَانُوا لِاَصْحَابِيْ مُكْرِمِيْنَ فَاِنِّيْ اُحِبُّ اَنْ اُكَافِئَهُمْ[24]

انہوں نے میرے ساتھیوں کا اعزاز واکرام کیا تھا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ میں بھی ان سے ایسا ہی سلوک رکھوں۔

فقہائے کرام نے اسی بنیاد پر بڑے واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ مسلمانوں پر لازم ہے کہ مہمان خواہ کافر ہو یا مسلمان، اس کو کھانا کھلائیں۔ امام احمد بن حنبل سے ان کے شاگرد حنبلؒ نے دریافت کیا کہ اگر مہمان کافر ہو تو؟ امام احمد بن حنبل نے جواب دیا، حدیث شریف میں ہے: مہمان کا ایک دن اکرام کرنا ہر مسلمان پر لازم ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مہمان خواہ مسلمان ہو یا

---

[22] ابو عبد اللہ محمد بن ابی بکر ابن قیم الجوزیۃ، احکام اہل الذمۃ، ذکر الجزیۃ، باب الجزیۃ، فصل لا یحل تکلیفھم مالا یقدرون علیہ، مکتبہ رمادی للنشر، بیروت، ۱۹۹۷، ج ۱، ص ۱۴۴

[23] مسلم بن حجاج القشیری، صحیح مسلم، کتاب ۳۶، باب المومن یاکل فی معی واحد، حدیث ۲۵۳

[24] احمد بن حسین البیہقی، شعب الایمان، فصل فی المکافاۃ بالصنائع، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۹۹۸، حدیث ۸۷۰۳

کافر، اس کی ضیافت اور دعوت کی جائے گی۔[25]

مدینہ منورہ میں پینے کے پانی کی قلت تھی۔ اکثر کنوؤں پر یہودیوں کا قبضہ تھا۔ ان میں سے قریب ترین بئر رومہ تھا، جس سے مسلمانوں کے پانی لینے پر سخت رکاوٹ ڈالی جاتی تھی۔ یہ کنواں حضرت عثمان غنیؓ نے چار ہزار دینار میں خرید کر وقف کر دیا اور مسلم و غیر مسلم سب اس سے بلا تفریق استفادہ کرنے لگے۔[26]

حضور ﷺ نے غیر مسلموں سے جس رواداری اور حسنِ اخلاق کی تعلیم دی ہے، وہ دنیا کے تمام مذاہب کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ ایک غزوہ میں جب صحابہ کرامؓ سے پانی دور تھا اور ایک غیر مسلم خاتون پانی سے بھرے مشکیزے لاتی دکھائی دی تو حضور ﷺ نے ان مشکیزوں سے پانی لے کر صحابہ کرام کو پلایا، جس سے اس کے پانی میں تو کچھ کمی نہ ہوئی لیکن آپؐ نے اس خاتون کو انعام و اکرام سے نوازا۔ اس کے بعد کسی بھی غزوہ کی صورت میں احسان شناسی کے طور پر مسلمان اس خاتون کے قبیلے سے اعراض نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اس حسنِ سلوک نے اس پورے قبیلے کو اسلام کی جانب مائل کر دیا۔[27]

اس حدیث سے مندرجہ ذیل اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں:

- غیر مسلم سے مدد لی جاسکتی ہے۔
- غیر مسلم کی مدد کرنی چاہیے۔
- جو غیر مسلم مسلمانوں پر احسان کرے، اس کا بدلہ دینا چاہیے۔

---

[25] ابو عبداللہ محمد بن ابي بكر ابن قيم الجوزية، احكام اهل الذمة، ذكر الشروط العمرية واحكامها وموجباتها، الفصل الخامس في احكام ضيافتهم، مكتبہ رمادي للنشر، بيروت، ۱۹۹۷، ج ۱، ص ۱۳۴۱

[26] محمد ابن سعد البغدادي، الطبقات، دار احياء التراث العربي، بيروت، ج ۱، ص ۳۹۲

[27] صحیح بخاری، کتاب التيمم، باب الصعيد الطيب وضوء المسلم، حدیث ۱۱

- مسلمانوں کی مدد کرنے والے غیر مسلم کی احسان شناسی کرتے ہوئے ممکن حد تک ان کی خیر خواہی کی جائے۔

## غیر مسلموں کی عیادت کرنا

غیر مسلم اگر بیمار پڑ جائے تو اس کی تیمار داری کی ترغیب بھی سیرت سے ملتی ہے۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ ایک یہودی لڑکا رسول اللہ ﷺ کی خدمت کیا کرتا تھا۔ وہ بیمار پڑا تو آپؐ اس کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ اس موقع پر یہ نوجوان اپنے والد کی اجازت سے مسلمان ہو گیا۔ آپؐ یہ کہتے ہوئے اس کے گھر سے باہر آئے کہ شکر اللہ کا جس نے اس لڑکے کو جہنم سے بچالیا۔[28]

انہی روایات کی بنیاد پر فقہ حنفی کا عمومی ضابطہ ہے:

وَلَا بَاسَ بعِيَادَةِ الْيَهُوْدِی، وَالنَّصْرَانِی، لِاَنَّه نوع بر فِی حقّھم وَمَا نهينا عَنْ ذٰلِكَ[29]

کسی یہودی یا نصرانی کی عیادت میں کوئی حرج نہیں کیونکہ یہ اس کے ساتھ ایک طرح کی بھلائی ہے جس سے ہمیں منع نہیں کیا گیا۔

امام اسحاق بن راہویہؒ بڑے مشہور محدث اور فقیہ ہیں۔ ان سے پوچھا گیا کہ مشرک کی عیادت کیسے کی جائے؟ آپ نے جواب دیا: اس طرح کہو کہ اللہ تعالی تمہارے مال اور اولاد میں اضافہ کرے۔[30]

---

[28] صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب اذا اسلم الصبی، حدیث ۱۰۹

[29] ابوالحسن علی بن ابو بکر المرغینانی، الہدایہ، ج ۴، ص ۴۷۲

[30] دکتور عبداللہ بن عبدالعزیز، التعامل مع غیر المسلمین، ص ۱۰۲

## غیر مسلم کے جنازے کا احترام

اسلام نے غیر مسلموں کی صرف زندگی میں ہی ان کا خیال رکھنے اور اعزاز واکرام کرنے کی تعلیم نہیں دی، بلکہ مرنے کے بعد بھی غیر مسلم کے جنازے کا احترام کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اسلامی اخلاق کا یہ پہلو اس قدر فرحت بخش اور کیف آگیں ہے کہ اس پر جتنا فخر کیا جائے، کم ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ ہمارے پاس سے ایک جنازہ گزرا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھڑے ہو گئے۔ ہم نے کہا: یا رسول اللہؐ یہ تو یہودی کا جنازہ ہے۔ آپؐ نے فرمایا: جب تم جنازہ دیکھو تو کھڑے ہو جایا کرو۔[31] دوسری حدیث میں اس سے بھی واضح انداز میں تعلیم ہے، جس کے مطابق جب آپ کو بتایا گیا کہ جس میت کے لیے آپ نے قیام فرمایا ہے، یہ ایک یہودی کا جنازہ ہے، تو آپؐ نے جواب دیا: کیا یہ انسان نہیں؟[32]

## غیر مسلم جنگی قیدیوں سے حسن سلوک

جنگ کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ اس میں ہر چیز جائز ہے۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ساتھ جنگ لڑنے کے لیے آنے والے دشمنوں کے ساتھ بھی حسن سلوک کی انمول مثالیں قائم کی ہیں۔ وہ دشمن جو خود مسلمانوں کا مثلہ کرتے، ان کے اعضاء کاٹ دیتے، آپؐ نے ان کے ساتھ بھی حسن سلوک کیا۔ سیرت النبیؐ کا یہ پہلو بہت سبق آموز ہے۔

غزوہ بدر میں جب قریش مکہ کے ۷۰ افراد قید ہوئے تو ان کو انصار صحابہ میں تقسیم کر دیا گیا۔ حضورؐ نے ہدایت دی تھی کہ قیدیوں کو نہایت آرام سے رکھا جائے۔ صحابہ کرامؓ اس حکم کی تعمیل میں خود کھجوریں کھاتے اور قیدیوں کو اچھا کھانا کھلاتے۔ حضرت مصعب بن عمیرؓ کے بھائی ابو عزیز بھی قید تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ جن انصار کے پاس مجھے رکھا گیا تھا، وہ خود کھجوروں پر گزارا کرتے اور

---

[31] صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب من قام لجنازۃ یهودی، ج ۲، ص ۸۵، حدیث ۶۹

[32] صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب من قام لجنازۃ یهودی، ج ۲، ص ۸۵، حدیث ۷۰

مجھے عمدہ کھانالا کر دیتے تھے۔اس سلوک کی وجہ سے میں سخت شرمسار ہوتا۔جن قیدیوں کے پاس لباس کم تھے،ان کو کپڑے دیے گئے۔ حضرت عباسؓ (جو اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے) کے بدن پر لمبے قد کی وجہ سے کوئی کرتہ پورا نہ آتا تھا،ان کے لیے عبداللہ بن ابی نے کرتہ بھجوایا۔

قیدیوں میں سہیل بن عمروؓ بھی تھے جو اس وقت تک اسلام کے شدید مخالف اور ایک بہترین مقرر تھے۔ یہ حضورؐ کے خلاف دھواں دار تقاریر کیا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے مشورہ دیا کہ ان کے دانت اکھڑوا دیے جائیں،تاکہ پر جوش تقریریں نہ کر سکیں۔ رحمت عالم ﷺ نے فرمایا: اگر میں اس کے بدن کے کسی حصے کو بگاڑوں تو میرے نبی ہونے کے باوجود اللہ تعالی بطورِ سزا میرے اس حصے کو بگاڑ دے گا۔ [۳۳]

جنگ میں گرفتار ہونے والوں پر کون رحم کھاتا ہے؟ مگر رحمت للعالمین ﷺ نے اس کی انمول مثالیں رہتی دنیا تک کے لیے قائم کر دیں۔ بدر کے قیدی لائے گئے تو ان کے ہاتھ پیٹھ کی جانب سختی سے باندھے گئے تھے۔ قیدیوں میں حضرت عباسؓ بھی تھے، جو رسیوں کی سختی سے کراہنے لگے۔ رات کو حضورؐ نے کراہنے کی آواز سنی تو اس بارے میں دریافت فرمایا۔ صحابہؓ نے سبب بتایا تو آپؐ نے فرمایا کہ میرے چچا عباس کے ساتھ تمام دوسرے قیدیوں کی رسیاں بھی ڈھیلی کر دی جائیں۔ [۳۴]

## غیر مسلموں پر انعامات کی بارش

حضور ﷺ نے غیر مسلموں پر انعامات کی اتنی بارش کی ہے کہ وہ بھی پکار اٹھے کہ اتنا سخی تو نبی ہی ہو سکتا ہے۔ حضورؐ کی بیویاں بھی تھیں، بیٹیاں بھی تھیں اور ان کی ضروریات بھی ہوتی تھیں، مگر آپؐ نے غیر مسلموں کو نوازنے کی انتہاء کر دی۔ سیرت النبیؐ کے اس پہلو پر غور کیا جائے تو نظر و فکر

[۳۳] علامہ شبلی نعمانی، سیرت النبی، دارالاشاعت، کراچی، ج۱، ص ۱۹۵

[۳۴] شرح المواہب اللدنیہ، محمد بن محمد القسطلانی، دار المعرفۃ، بیروت، ۱۹۹۳، ج۱، ص ۴۴۵

کے بہت سے دَر وا ہوتے ہیں۔

ایک بار ایک شخص آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔اس نے دیکھا کہ آپ کے پاس اتنی ساری بکریاں ہیں کہ ریوڑ دور تک پھیلا ہوا ہے۔اس نے آپؐ سے بکریاں دینے کی درخواست کی۔آپؐ نے سب کی سب بکریاں اسے دے دیں۔ وہ شخص اپنے قبیلے کے پاس واپس آیا اور کہنے لگا: لوگو اسلام قبول کرلو۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ایسے فیاض ہیں کہ مفلس ہو جانے کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔[۳۵]

فتح مکہ کے باوجود قریش کے وہ سردار جو اسلام نہیں لائے تھے، آپؐ نے ان کو اس قدر نوازا کہ ان کے سارے خدشات جاتے رہے۔ صفوان بن امیہ سردارانِ قریش میں سے تھے۔ان کی فیاضی اور مہمان نوازی مشہور تھی۔[۳۶] وہ ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے جب حضورؐ نے غزوہ حنین کے بعد ان کو بلایا اور انہیں ۳۰۰ اونٹ بطور ہدیہ دیئے۔ سعید بن مسیبؒ کہتے ہیں کہ صفوان کہا کرتے تھے کہ مجھے رسول اللہؐ نے اس قدر نوازا کہ وہ جو مجھے سب سے زیادہ ناپسند تھے اب وہی دنیا بھر سے عزیز تر ہو گئے۔[۳۷] حضورؐ نے حضرت ابوسفیان بن حرب، ان کے بیٹوں یزید اور معاویہ میں سے ہر ایک کو ۴۰ اوقیہ چاندی اور ۱۰۰ اونٹ دیئے۔ حکیم بن حزام کو ۱۰۰ اونٹ دیئے۔انہوں نے مزید ۱۰۰ اونٹ مانگے تو وہ بھی دے دیئے۔ نضر بن حارث بن کلدہ کو ۱۰۰ اونٹ عطا فرمائے۔ علاء بن حارثہ الثقفی کو ۵۰ اونٹ دیئے۔[۳۸]

---

[۳۵] صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب ما سئل رسول اللہ شیئا قط فقال لا، حدیث ۷۸

[۳۶] مولانا ادریس کاندھلوی، سیرۃ المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، اسلام صفوان بن امیہ الطاف اینڈ سنز، کراچی، ج ۲، ص ۱۶۹

[۳۷] صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب ما سئل رسول اللہ شیئا قط فقال لا، حدیث ۸۰

[۳۸] ابن قیم الجوزیۃ، زاد المعاد، فصل فی ترتیب سیاق ھدیہ مع الکفار والمنافقین، فصل فی سیاق مغازیہ، فصل فی غزوۃ حنین، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ص ۴۱۶

## غیر مسلموں کے ہدیے قبول کرنا

آپؐ نہ صرف غیر مسلموں کو ہدیہ دیتے یا کھانا کھلاتے تھے، بلکہ اگر کوئی غیر مسلم آپؐ کو ہدیہ دیتا یا کھانا کھلاتا تو آپؐ اس کی دعوت قبول فرمالیتے تھے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے ایک یہودی سے پینے کی کوئی چیز طلب کی۔ اس نے پیش کی تو آپؐ نے اسے دعا دی کہ اللہ تعالی تمہیں حسین و جمیل رکھے۔ چنانچہ مرتے وقت تک اس کے بال سیاہ رہے۔[39] ایک دوسرے موقع پر ایک یہودی نے آپؐ کی دعوت کی، جسے آپؐ نے قبول فرمایا۔[40]

عَنْ عَلِيٍّ عَنِ النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم أَنَّ كِسْرَى أَهْدَى إِلَيْهِ فَقَبِلَ مِنْهُ وَأَنَّ الْمُلُوكَ أَهْدَوْا إِلَيْهِ فَقَبِلَ مِنْهُمْ[41]

''حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ کسریٰ نے حضورؐ کی طرف ہدیہ بھیجا تو آپؐ نے اسے قبول فرمالیا یعنی بادشاہ حضورؐ کو ہدیہ بھیجا کرتے تھے، آپؐ انہیں قبول فرمالیتے تھے۔''

۹ ہجری میں غزوہ تبوک کے دوران ایلہ کے بادشاہ نے رسول اللہؐ کی خدمت میں بطور تحفہ ایک سفید خچر پیش کیا اور ایک چادر پہنائی۔[42] یہاں تک کہ ایک یہودی عورت نے دعوت کے نام پر آپؐ کو زہریلا کھانا کھلادیا مگر آپؐ نے اس سے بدلہ نہ لیا۔ اس تکلیف کا اثر آپؐ کی وفات تک رہا۔ آپؐ نے اس سے دریافت کیا کہ تم نے یہ حرکت کیوں کی؟ اس نے کہا: میں نے سوچا کہ اگر آپ سچے نبی ہوں گے تو اللہ آپ کو بچالے گا، اللہ آپ کو مطلع کردے گا اور اگر آپ نے جھوٹا دعوی کیا ہوگا تو لوگوں کو آپ سے نجات مل جائے گی۔ رسول اللہؐ نے اسے معاف کردیا۔ لیکن آپ کے ایک اور ساتھی بھی اس کھانے میں شریک تھے، جن کی اسی زہر کی وجہ سے موت ہوگئی تھی۔ ان

---

[39] عبدالرزاق، مصنف عبدالرزاق، ج ۱۰، ص ۳۹۲

[40] مسند الامام احمد، باقی مسند المکثرین، مسند انس بن مالک رضی اللہ عنہ، ح ۱۲۷۸۹

[41] جامع الترمذی، ابواب السیر، باب ما جاء فی قبول ھدایا المشرکین، حدیث ۳۷

[42] صحیح بخاری، کتاب الزکاۃ، باب خرص التمر، حدیث ۸۲

کے قصاص کے طور پر وہ عورت قتل کی گئی، کیونکہ قصاص معاف کرنے یا نہ کرنے کا تعلق اصل مقتول کے وارث سے ہوتا ہے، کوئی اور شخص اسے معاف نہیں کر سکتا۔[43]

## خدمتِ انسانیت، اسلام کا امتیاز

گزشتہ تفصیلی حوالہ جات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نہ صرف باہم انسانی تعلقات میں انسانی بنیادوں پر خیر خواہی کا رویہ اپنایا جائے گا بلکہ کسی بھی مصیبت میں گرفتار افراد کی مدد کرنا، ان کا سہارا بننا، مذہب و مسلک سے ماورا ہو کر مشکلات میں دوسروں کی مدد کرنا ہی اسلام کا اصل مزاج ہے۔

انسانیت تو بذاتِ خود ایک بہت بڑا رشتہ ہے، جب کہ اسلام نے جمادات اور حیوانات کے لیے بھی حقوق بتائے ہیں۔ یہاں تک کہ کسی بھی غیر متعین فرد کو فائدہ پہنچانے والے افعال کا بھی بڑا اجر بتایا ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

الإِيمَانُ بِضْعٌ وَسَبْعُونَ أَوْ بِضْعٌ وَسِتُّونَ شُعْبَةً فَأَفْضَلُهَا قَوْلُ لاَ إِلَهَ إِلاَّ اللَّهُ وَأَدْنَاهَا إِمَاطَةُ الأَذَى عَنِ الطَّرِيقِ وَالْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِنَ الإِيمَانِ[44]

ایمان کے ستر سے یا ساٹھ سے زائد حصّے ہیں، ان میں سے سب سے بہتر لا الہ الا اللہ ہے اور کم تر راستہ سے تکلیف کو دور کرنا ہے اور حیاء ایمان کا ایک حصہ ہے۔

ایک روایت کے مطابق آپؐ نے فرمایا کہ میں نے ایک شخص کو جنت میں پھرتا دیکھا، اس وجہ سے کہ اس نے راستہ میں موجود ایک ایسا درخت کاٹ دیا تھا، جو لوگوں کو تکلیف دیتا تھا۔[45]

پرندوں کے کھانے کے لیے پودے لگانے والے کے لیے بھی ثواب ہے:

[43] سلیمان بن اشعث السجستانی، سنن ابو داود، کتاب الدیات، حدیث ۱۹

[44] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان عدد شعب الایمان، حدیث ۶۰

[45] ابوزکریا النووی، ریاض الصالحین، کتاب المقدمات، حدیث ۱۲۷

مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَغْرِسُ غَرْسًا أَوْ يَزْرَعُ زَرْعًا فَيَأْكُلُ مِنْهُ طَيْرٌ أَوْ إِنْسَانٌ أَوْ بَهِيمَةٌ إِلاَّ كَانَ لَهُ بِهِ صَدَقَةٌ[46]

کوئی مسلمان جو درخت لگاتا ہے یا کھیتی اگاتا ہے تو اس سے پرندے یا انسان یا جانور کھاتے ہیں تو وہ اس کے لیے صدقہ ہے۔

## حاصلِ کلام

گزشتہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ اسلام نے غیر مسلموں کی مدد کرنے، ان کے کام آنے اور ان کے لیے آسانیاں پیدا کرنے کے بڑے واضح احکامات دیئے ہیں۔ غیر مسلموں کو کھانا کھلانا، ان کو تحائف دینا، مشکل حالات میں ان کے ساتھ کھڑا ہونا اور دشمنی کے باجود انسانیت کی بنیاد پر ان کو نوازنا اسلامی تعلیمات کا روشن چہرہ ہے۔ اسلامی تعلیمات کے اس رخ کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت ہے۔

[46] صحیح بخاری، کتاب المزارعۃ، باب فصل الزرع والغرس اذا اکل منہ، حدیث ا

# اسلام اور انسانی خدمات: امکانات و مسائل

مولانا عبداللہ کھوسو*

عملِ خدمت کو اسلام میں خصوصی تقدس حاصل ہے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

سَیِّدُ الْقَوْمِ فِی السَّفَرِ خَادِمُھُمْ فَمَنْ سَبَقَھُمْ بِخِدْمَۃٍ لَمْ یَسْبِقُوْہُ بِعَمَلٍ اِلَّا الشَّھَادَۃَ[1]

''ساتھیوں کا سرتاج وہ ہے جو ان کا خادم ہے، اگر ان میں کوئی اس سے سبقت لے جانا چاہتا ہے تو شہادت کے بغیر کسی اور عمل سے سبقت حاصل نہیں کر سکتا۔''

گویا خدمت کا عمل اللہ کے نزدیک شہادت کے رُتبے سے محض ایک درجہ کم ہے۔ آپؐ کے ساتھ ایک سفر میں کچھ صحابہ کرامؓ روزے سے تھے اور کچھ بلا روزہ سفر کر رہے تھے، راستے میں کہیں آپؐ نے پڑاؤ کیا تو جو صحابہ کرامؓ روزے سے تھے وہ آرام کرنے لگے اور جو روزے سے نہیں تھے اُنہوں نے خیمے کھڑے کیے، اونٹوں کو پانی پلایا اور دوسری خدمات انجام دیں۔ یہ منظر دیکھ کر آپؐ نے فرمایا:

ذَھَبَ الْمُفْطِرُوْنَ الْیَوْمَ بِالْاَجْرِ[2]

---

* مرکزِ تصنیف و تالیف، الہ باد کشمور

[1] ابو بکر احمد بن علی، شعب الایمان حدیث ۸۴۰۷

[2] ابو الحسین مسلم بن الحجاج القشیری، صحیح مسلم، کتاب ۱۳، حدیث ۱۲۸ ؛ محمد بن اسماعیل البخاری، الجامع الصحیح للبخاری، کتاب ۵۶، حدیث ۱۰۵

"جن لوگوں نے روزہ نہیں رکھا {اور اپنے ساتھیوں کی خدمت کی} وہ آج اجر کمانے میں بازی لے گئے۔"

## خدمت کی حقیقت

انسان جن لوازمات کو خود سے پورا نہیں کر سکتا یا بمشکل پورا کر سکتا ہے اُن میں اُس کا ہاتھ بٹانا یا کلی طور پر لوازمات مہیا کر دینا اصل خدمت ہے۔ معاوضہ پر خدمت کرنا بھی ایک قابل قدر عمل ہے۔ حضرت انسؓ بن مالک نے آپؐ کی دس سال خدمت کی۔ وہ دن اور رات، سفر اور حضر، ہر حالت میں آپؐ کے ساتھ رہتے تھے۔ جب کہ ان کا کھانا پینا، لباس اور اوڑھنا بچھونا سب کچھ آپؐ کے ذمہ تھا۔[۳]

حضرت انسؓ اور حضرت ابوذرؓ آپ کی خدمت کفافی سہولت کی بنیاد پر کرتے تھے۔ لیکن اگر خدمت بالکل ہی بلا معاوضہ ہو تو اس کی وجدانی کیفیت ہی کچھ اور ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے دو خواتین کے مویشی کو اس وقت پانی پلایا، جب انہیں احساس ہوا کہ یہ دونوں مجبوری کے تحت مویشی کو پانی پلانے آئی ہیں اور حیا کے باعث انتظار کرنے پر مجبور ہیں اور اس وقت تک پانی گدلا نہ ہو جائے۔ حضرت موسیٰؑ کی یہ خدمت رضاکارانہ اور نیکی کے اندرونی جذبے کے تحت تھی جب کہ خواتین نے حضرت موسیٰؑ سے اپنے مویشی کو پانی پلانے کی درخواست بھی نہیں کی تھی۔ حضرت موسیٰؑ نے ان سے نہ کوئی اجرت مانگی اور نہ ہی انہوں نے حضرت موسیٰؑ کو اجرت کی پیش کش کی تھی۔ لیکن حضرت موسیٰؑ کے اس عمل نے ان کو پردیس میں ایک مستقل رہائش فراہم کر دی۔

افراد کی انفرادی خدمت کا عمل اسلام کے شروع دور سے مروّج رہا ہے۔ حضرت عمرؓ، بصارت سے محروم ایک بڑھیا کے گھر کا کام صبح سویرے کر کے پھر اپنی مصروفیات میں لگ جاتے

---

[۳] ابوداؤد السجستانی، سنن ابی داؤد، کتاب ۴۳، حدیث ۲

تھے۔[4] حضرت ابو حُذیفہؓ نے اپنے آزاد کردہ غلام سَالمؓ کو اپنے گھر میں گھر کے دوسرے افراد کی طرح رکھا ہوا تھا۔ حضرت عائشہؓ یتیم بچیوں کی کفالت کیا کرتی تھیں، حتیٰ کہ ان کے نکاح اور رخصتیاں بھی حضرت عائشہ کے گھر سے ہوتی تھیں۔

## خدمت بطور فرض

خدمت فرد کی ہو یا معاشرے کی، معنوی ہو یا مادی، ان سب میں بنی نوعِ انسان کی خدمت ہر اُس شخص پر اخلاقاً فرض ہے جو بوقتِ ضرورت، خدمت انجام دے سکتا ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم لوگوں کے جسم کے ہر جوڑ پر ہر صبح کو ایک ایک صدقہ لازم ہے۔ دو لوگوں کے درمیان عدل سے صلح کروانا بھی صدقہ ہے، کسی کو اس کی سواری پر بٹھانے میں مدد کرنا یا اُس پر اس کا سامان لادنے میں تعاون کرنا بھی صدقہ ہے، کسی سے کوئی اچھی بات کہنا بھی صدقہ ہے۔ نماز کے لیے اٹھنے والا ہر قدم صدقہ ہے۔ راستہ سے تکلیف ہٹانا بھی صدقہ ہے۔[5]

واضح رہے کہ قرآن مجید میں عمومی طور پر احسان اور بِرّ کو خدمت کے مفہوم میں بھی لیا جاتا ہے۔ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا کا مطلب ہے کہ والدین کی خدمت کرو، حضرت عیسیٰؑ نے اپنے بارے میں فرمایا: وَبَرًّا بِوَالِدَتِي یعنی اللہ نے مجھے جو فضیلتیں دی ہیں ان میں یہ بھی ہے کہ میں اپنی والدہ کا خدمت گذار ہوں۔ اسی طرح احادیث میں بھی بعض اوقات صدقہ کو خدمت کے معنی میں لیا جاتا ہے، جیسا کہ ذکر ہوا۔

غزوۂ خیبر کے موقع پر آپؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا:

فَوَاللَّهِ لَأَنْ يَهْدِيَ اللَّهُ بِكَ رَجُلاً خَيْرٌ لَكَ مِنْ أَنْ يَكُونَ لَكَ حُمْرُ النَّعَمِ[6]

---

[4] اسماعیل بن عمر بن کثیر، البدایہ والنھایہ، بیروت، دار الکتب العلمیۃ ج ۷ ص ۱۳۱، سیرت عمر بن الخطاب
[5] صحیح بخاری، کتاب ۵۶، حدیث ۱۰۶؛ صحیح مسلم، کتاب ۱۲، حدیث ۷۲
[6] صحیح بخاری، کتاب ۵۶، حدیث ۲۱۸

”خدا کی قسم! اگر تمہارے ذریعہ اللہ ایک شخص کو بھی مسلمان کردے تو یہ تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔“

تلقین و تبلیغ کے ذریعے کسی کو راہ ہدایت پر لگا دینا اُس کی معنوی خدمت کرنا ہے۔ آپؐ نے کنیز کی تعلیم و تربیت کرنے پر اجر کا ذکر فرمایا،[7] یہ بھی معنوی خدمت ہے۔ کسی کو راہ ہدایت پر لگانا، کسی کو اسلام کی دعوت دینا، کسی کو اچھی نصیحت کرنا، کسی کے ساتھ بہتر سلوک کرنا جس سے وہ راہ ہدایت کی طرف مائل ہو جائے، یہ سب اعمال معنوی خدمت کے زمرے میں آتے ہیں۔

## خادم اور مخدوم کے اچھے تعلقات

انسانی خدمت جب بھی باقاعدہ شکل اختیار کرتی ہے تو اس میں پہلا مرحلہ اُجرت یا احکامات دینے والے اور وصول کرنے والے کے مابین تعلقات ہوتے ہیں۔ اسلام نے خادم اور مخدوم کے درمیان تعلقات کی ہدایات دی ہیں اور خادم کے بعض حقوق بیان کیے ہیں، جن کے مطابق مراتب کا یہ فرق عزت یا حقوق میں فرق کی بنیاد نہیں بن پاتا۔

حضرت مُعاوِیَہ بن سُوَیدؓ بیان کرتے ہیں: میں نے اپنے ایک آزاد کردہ غلام کو تھپڑ لگایا اور پھر بھاگ گیا۔ جب میں واپس آیا تو میرے والد نے غلام کو بلا کر اس سے فرمایا: اس سے اپنا بدلہ لے لو۔ تاہم غلام نے مجھے معاف کر دیا۔ ایک اور موقع پر ہمارے خاندان میں سے کسی نے اپنی خادمہ کو تھپڑ لگا دیا۔ جب یہ قضیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس گیا تو آپؐ نے فرمایا: اس کو آزاد کر دو۔ انہوں نے عرض کی کہ ہمارے پاس کوئی اور خادمہ نہیں ہے، آپؐ نے فرمایا: جب تمہیں کوئی خادمہ میسر ہو تو اس کو آزاد کرنا۔[8]

ایک یہودی لڑکا آپؐ کی خدمت کرتا تھا۔ جب وہ بیمار ہوا تو آپؐ اس کی طبع پرسی کے لیے اس

---

[7] صحیح بخاری، کتاب ۵۶، حدیث ۲۲۰

[8] ا صحیح مسلم، کتاب ۲۷، حدیث ۴۸

کے گھر تشریف لے گئے۔ اس موقع پر آپؐ نے اسے اسلام کی دعوت دی جسے اُس نے اپنے والد کی رضامندی اور اپنے دل کی رغبت سے قبول کر لیا۔ جس پر آپؐ نے فرمایا: اللہ کا شکر ہے کہ یہ لڑکا میری دعوت کی وجہ سے جہنم کے عذاب سے نجات پا گیا۔[9] یہ نوجوان جتنا عرصہ آپؐ کی خدمت میں رہا اس پر اپنا مذہب تبدیل کرنے کے لیے نہ تو کوئی دباؤ آیا اور نہ ہی انسانی بنیاد پر آپؐ کے حسنِ سلوک میں کوئی کمی آئی، تاہم جب اس کی شدید بیماری میں یہ خدشہ پیدا ہوا کہ وہ دل کے اسلام کی جانب مائل ہونے کے باوجود بغیر اسلام کے وفات پا سکتا ہے تو آپؐ نے اسے دعوت دی۔

آپؐ نے فرمایا: جب تمہارا خادم کھانا تیار کر کے لائے اور تمھارے پاس اس کو ساتھ بٹھا کر کھانا کھلانے کی گنجائش نہ ہو تو اس کو کم از کم چند لقمے ہاتھ میں تھما دو، کیونکہ اس نے اس کی گرمی اور تکلیف برداشت کی ہے۔[10] نیز فرمایا: خادم کا آقا پر حق یہ ہے کہ وہ اس کو کھانا دے، لباس دے اور اس کی طاقت سے زائد محنت کا بوجھ اس پر نہ ڈالے۔[11] ایک اور روایت میں ہے:

وَلاَ تُكَلِّفُوهُمْ مَا يَغْلِبُهُمْ فَإِنْ كَلَّفْتُمُوهُمْ فَأَعِينُوهُمْ عَلَيْهِ[12]

''خادموں پر ان کی قوت سے زیادہ محنت و مشقت کا بوجھ نہ ڈالو اگر ان سے ایسی محنت کرواؤ تو اس میں ان کی مدد کرو۔''

اسلام نے اپنے خادموں کی تعلیم و تربیت کی طرف متوجہ کیا ہے، آپؐ نے فرمایا: اپنی کنیز کی تعلیم و تربیت کر کے پھر اس کو آزاد کر کے اس سے نکاح کرنے والے کو دو اجر ملیں گے۔[13] معروف تابعی محدث اور حضرت امام مالکؒ کے اُستاد، حضرت نافعؒ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے غلام تھے۔

---

[9] صحیح بخاری، کتاب ۲۳، حدیث ۱۰۹

[10] صحیح مسلم، کتاب ۲۷، حدیث ۶۴

[11] صحیح مسلم، کتاب ۲۷، حدیث ۶۳

[12] صحیح مسلم، کتاب ۲۷، حدیث ۶۲

[13] صحیح البخاری، کتاب ۳، حدیث ۳۹

انہوں نے ان کی تعلیم و تربیت کی اور پھر آزاد کر دیا۔[۱۴]

اوپر بیان کردہ ہدایات و واقعات ان صورتوں سے متعلق ہیں جب خادم اور مخدوم کے متعلق باقاعدہ خدمت کا تعلق قائم ہو۔ اس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ جو افراد کسی کی بے لوث اور رضاکارانہ خدمت کریں انہیں کس قدر عزت دی جانی چاہیے۔ اسلام ہمیشہ خیر کو بڑھا کر لوٹانے کا حکم دیتا ہے یہاں تک کہ اگر کوئی سلام میں پہلے کرے تو اسے بہتر الفاظ میں سلام کرنے کا حکم دیا گیا ہے یا کم از کم اسی قدر دعا کے ساتھ۔[۱۵] مذکورہ بالا تفصیل اس لیے اہم ہے کہ انسانی خدمت میں مشغول بیشتر افراد اپنے دل کر رضامندی سے بے لوث انداز میں اپنا وقت، توانائیاں اور مال استعمال کر رہے ہوتے ہیں۔ ان کی عزت و تکریم کے ساتھ ساتھ ان کی ضروریات، جذبات اور حقوق کا خیال رکھنا ہر انسان دوست کاوش کا اہم عنصر ہونا چاہیے۔

## خدمت پر آمادہ کرنے والے عناصر

اللہ کی مخلوقات کی خدمت کرنا اللہ کی ایک نعمت ہے۔ جب کسی کا نصیب اچھا ہوتا ہے تو اللہ اس کا رجحان اچھائی کی طرف موڑ دیتا ہے۔ انسانوں میں ایک رویہ یہ ہے کہ کم وسائل کے باوجود حتی الامکان ضرورت مندوں کی مدد کی جائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے انصار صحابہ کرام کے بے لوث ایثار کا ذکر فرمایا،[۱۶] یا جیسے حضرت یوسفؑ کے اس عمل سے ظاہر ہے کہ انہوں نے دو ضرورت مند خواتین کو آگے بڑھ کر بے غرض مدد فراہم کی۔ اس کے مقابل قارون کا کردار ہے، جس نے اللہ کی رحمت کو اپنی کمائی سمجھا اور اسے مسکینوں پر خرچ کرنے سے انکار کر دیا۔[۱۷]

---

[۱۴] شمس الدین بن احمد بن عثمان الذھبی، سیر اعلام النبلاء، القاہرہ، دار الحدیث ج ۵ ص ۴۲۳، ترجمہ، ۶۴۹

[۱۵] النساء: ۸۶

[۱۶] الحشر: ۹

[۱۷] القصص: ۷۷

اللہ کی نوازشوں کی قدردانی یاناقدری دو مختلف بلکہ متضاد سوچیں ہیں، ایک سوچ انسان کو اس پر آمادہ کرتی ہے کہ وہ اللہ کی نوازشوں میں اس کے ضرورت مند بندوں کو شریک کرے اور اللہ تعالیٰ کا عملاً شکر کرے۔ ایک دوسرا رویہ اللہ کی عنایات کے انکار سے پیدا ہوتا ہے جب انسان دوسری مخلوقات کو درد اور تکلیف میں مبتلا دیکھ کر بھی مال کو زیادہ محبوب رکھتا ہے۔

خدمت کا جذبہ منکسر المزاج شخص میں ہوتا ہے، مغرور اور متکبر لوگوں میں یہ جذبہ کسی بھی طرح پیدا نہیں ہوتا۔ خادم مزاج شخص خدمت کو اپنی شان سمجھتا ہے، جبکہ مغرور اور متکبر شخص اس کو اپنی ذلت اور رسوائی گردانتا ہے۔

اسلام اس مقدس جذبے کو جو رنگ اور مزاج دیتا ہے، اس کے مطابق خدمت گذار شخص اپنی خدمت کا صلہ اپنے رب ہی سے چاہتا ہے۔ اس کو خلقِ خدا کی خدمت کرنے سے سکون ملتا ہے، اور وہ اس عمل میں روز بروز آگے بڑھتا جاتا ہے۔ یعنی اصل مسئلہ ارادے اور جذبے کا ہے۔ خادم مزاج شخص خدمت میں جو کیف و سرور محسوس کرتا ہے اُس کا صحیح اندازہ وہ خود ہی کر سکتا ہے، کسی اور کو یہ کیفیت چھو نہیں سکتی۔ عملِ خدمت صبر آزما جہد مسلسل کا نام ہے۔ اس عمل میں اپنی صلاحیتوں اور وسائل کا صَرف کرنا انسان کو روحانی طور پر پاکیزہ بناتا ہے بشرطیکہ اس کے اندر خلوص ہو، جذبہ پاکیزہ ہو، عمل خدمت کا تسلسل نہ ٹوٹتا ہو، عمل میں ربط ہو، ضرورت اور حالات کو سمجھ کر خدمت کا عمل جاری رکھا جاتا ہو، یہ سب اوصاف جس خادم اور اس کی خدمت میں ہوں تو اس میں جِلا آجاتی ہے، دور دور تک یہ کام از خود دکھائی دیتا ہے، اس میں ترقی ہوتی ہے اور روحانیت کو سکون ملتا ہے۔

## انسانی خدمات میں عدم تفریق

عقیدۂ توحید کی اساسی سوچ یہ ہے کہ اس پوری کائنات کا خالق، مالک اور اس کا مکمل نظام چلانے والا صرف اللہ ہے۔ وہ اس کائنات کی نعمتوں سے جس کو جتنا چاہے، نوازتا ہے۔ اس حوالے سے یہ محال ہے کہ ایک توحید پرست انسان بھلائی اور خدمت کے عمل میں رنگ و نسل یا مذہب و ملت کی وجہ

سے امتیاز برتے۔ خود اسلام کی تعلیمات اس باب میں واضح ہیں۔ اللہ تعالیٰ مالکِ کائنات ہونے کے باوجود اپنی نعمتیں سب کو عطا فرماتا ہے اور مومن و کافر سب اس کی نعمتوں سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے رزق کی تقسیم کی بنیاد کفر اور ایمان کو نہیں بنایا بلکہ سب کو اپنے رزق سے نوازا ہے۔ اس لیے خدمت کرنے والے کی سوچ بھی وسیع ہونی چاہیئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک غیر مسلم کی وفات کے بعد اس کے جنازہ کے لیے بھی تعظیم کا سبق دیا ہے۔[18] اللہ نے اپنے مومن بندوں کو حکم دیا کہ ان کے والدین اگر مشرک بھی ہوں، بلکہ اپنی اولاد کو شرک کا حکم دیتے ہوں تو بھی ان سے حسنِ سلوک کا رویہ ترک نہ کیا جائے۔[19] قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے پانچ مرتبہ والدین سے حسنِ سلوک کا حکم دیتے ہوئے فرمایا: وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا۔ ان میں سے تین مقامات پر عزیزوں، یتیموں، مسکینوں وغیرہ کا بھی ذکر کیا لیکن کسی مقام پر بھی یہ شرط نہیں لگائی کہ اگر وہ مومن ہوں تو ان سے حسن سلوک کرو، بلکہ ہر ایک سے حسن سلوک سے پیش آنے یعنی خدمت کرنے کا حکم دیا ہے۔

اسی عمومی سوچ کی بنیاد رکھتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اَلْخَلْقُ عَیَالُ اللہِ فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَی اللہِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰی عِیَالِہٖ[20]

"مخلوق اللہ کا کنبہ ہے، اللہ کے کنبے میں سے اللہ کو سب سے زیادہ محبوب وہ شخص ہے جو اللہ کے کنبے کی خدمت کرے۔"

آپؐ کے اس ارشاد میں لفظ "اَلْخَلْقُ" مطلق ہے جس میں ہر رنگ و نسل اور ہر مذہب و ملت کے لوگ شامل ہیں۔ آپؐ نے حضرت عمر کو نفیس کپڑے کا ایک جوڑا دیا جو شرعاً مسلمان مردوں کے لیئے جائز نہیں تھا۔ حضرت عمرؓ نے آپ کے اشارے سے وہ جوڑا مکہ مکرمہ میں مقیم

---

[18] صحیح بخاری، کتاب ۲۳، حدیث ۷۰

[19] لقمان: ۱۵

[20] ابو بکر احمد بن علی، شعب الایمان ح ۷۴۴۴

اپنے مشرک بھائی کو تحفتاً بھیج دیا۔[21]

آپؐ نے فرمایا: جو شخص اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے، اس کو اپنے مہمان کی بہتر خدمت کرنی چاہیئے۔[22] اس حدیث میں آپؐ نے مطلق مہمان کا ذکر کیا ہے، اس کو صفتِ ایمان سے متصف مہمان نہیں فرمایا۔ مہمان خواہ مومن ہو یا کافر، بہر حال خدمت کا حقدار ہے۔

اسلام ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کا خواہش مند ہے جس میں کوئی انسان کسی انسان کا محتاج نہ ہو، اور اس ہدف کو حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ انفرادی اور اجتماعی دائروں میں ہر انسان دوسرے انسان کی ایسی امداد پر ہر وقت آمادہ رہے جس کی بدولت نہ صرف فوری ضرورت پوری ہو بلکہ وہ فرد اپنے پیروں پر بھی کھڑا ہو جائے۔ ایسا ہونا اس صورت میں ناممکن ہے جب انسانوں کے درمیان طبقاتی لکیر کھینچ کر کسی طبقے کو حقدارِ خدمت قرار دیا جائے اور کسی طبقے کو حصولِ خدمت سے محروم کر دیا جائے۔

اسلام تو غیر موذی جانوروں تک سے بھلائی کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: بنی اسرائیل کی ایک فاحشہ عورت کو اللہ نے اس وجہ سے معافی دی کہ اس نے ایک پیاسے کتے کو پانی پلایا تھا۔[23] ایک اور روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ایک شخص کو اللہ نے کسی پیاسے کتے کو پانی پلانے پر معافی دی (اس خبر سے متعجب ہو کر) صحابہ کرام نے عرض کی:

وَإِنَّ لَنَا فِي الْبَهَائِمِ أَجْرًا قَالَ "فِي كُلِّ كَبِدٍ رَطْبَةٍ أَجْرٌ"[24]

"کیا ہمیں ان چوپایوں کی خدمت پر اجر ملے گا؟ آپؐ نے فرمایا: ہر جان دار کی خدمت پر اجر ملے گا۔"

[21] صحیح مسلم، کتاب ۳۷، حدیث ۱۶؛ صحیح بخاری، کتاب ۱۱، حدیث ۱۱

[22] صحیح بخاری، کتاب ۷۸، حدیث ۴۹

[23] صحیح بخاری، کتاب ۶۰، حدیث ۱۳۴

[24] صحیح بخاری، کتاب ۴۲، حدیث ۱۱

## خدمت کی ترجیحات

چونکہ انسانوں کی صلاحیت اور انہیں حاصل وسائل محدود ہیں اس لیے ہر اہم کام کی طرح انسانی خدمت کے عمل میں بھی ترجیحات قائم کرنا ضروری ہے۔ اگر ایسا نہیں کیا جائے گا تو اس کی افادیت متاثر ہو گی۔ مثلاً کہیں سڑک کا کوئی حادثہ ہوتا ہے اور اس میں لوگ ہلاک اور زخمی ہوتے ہیں، اس موقع پر عقل کا تقاضا یہ ہے کہ سب سے پہلے زخمیوں کو ہسپتال منتقل کرنے کا اہتمام کیا جائے تاکہ ان کی جان بچانے کی سعی کی جاسکے۔ ہلاک شدگان کی منتقلی کی باری بعد میں آتی ہے۔ دیگر انسانی خدمت میں بھی اسی طرح کے مواقع آتے رہتے ہیں جن میں خدمات کی ترجیحات کو ملحوظ رکھنا ہوتا ہے جو خدمت کی بہتر افادیت کا موجب بنتا ہے۔ خدمات کے تمام مواقع پر اسلام کی تعلیمات اس طرح کی ہیں کہ ان میں ترجیح کا تعین بھی کر دیا گیا ہے۔ لوگوں نے آپؐ سے دریافت کیا کہ وہ کیا خرچ کریں، تو اللہ عزوجل نے جواباً فرمایا کہ تم جو کچھ خرچ کرنا چاہو اُس کی ترتیب یہ ہے، پہلے والدین پھر عزیز واقارب پھر یتاما پھر مساکین اور پھر مسافروں پر خرچ کرو۔[25] اس کی عملی اور تفصیلی ترتیب صحیح مسلم (روایت ۹۹۷) میں کچھ اس طرح بیان ہوئی ہے:

"اِبْدَأْ بِنَفْسِكَ فَتَصَدَّقْ عَلَيْهَا فَإِنْ فَضَلَ شَيْءٌ فَلِأَهْلِكَ فَإِنْ فَضَلَ عَنْ أَهْلِكَ شَيْءٌ فَلِذِي قَرَابَتِكَ فَإِنْ فَضَلَ عَنْ ذِي قَرَابَتِكَ شَيْءٌ فَهَكَذَا وَهَكَذَا" يَقُولُ فَبَيْنَ يَدَيْكَ وَعَنْ يَمِينِكَ وَعَنْ شِمَالِكَ[26]

''اپنا مال خرچ کرنے کی ابتدا اپنے آپ سے کر، پھر اگر کچھ بچے تو اپنے اہل و عیال پر خرچ کر، اہل و عیال سے بھی بچے تو اپنے عزیز واقارب پر خرچ کر، ان سے بھی بچے تو یہاں وہاں یعنی دوسرے غیر عزیز واقارب پر خرچ کر۔''

ایک صحابیؓ نے آپؐ سے دریافت کیا: میں سب سے پہلے کس کی خدمت کروں؟ آپ نے

---

[25] البقرۃ: ۲۱۵

[26] صحیح مسلم، کتاب ۱۲، حدیث ۵۰

فرمایا: اپنی ماں کی پھر اپنی ماں کی پھر اپنی ماں کی پھر اپنے باپ کی، اس کے بعد اپنے عزیز و اقارب کی جو قرابت داری کی ترتیب میں تیرے قریب سے قریب تر ہوں۔

اگر کہیں بڑی تعداد میں لوگ کسی آفت میں مبتلا ہوں تو وہاں سب سے پہلے ان کے لیے خوراک کی فراہمی اور جان بچانے کے دیگر اقدامات کا انتظام کیا جائے گا۔ ان کی مستقل بحالی، تعلیم و تربیت اور دیگر ضروریات کی طرف بعد میں توجہ کی جائے گی۔

اسی طرح خدمت کی نوعیت میں بھی ترتیب ہوتی ہے، نوعیت کے اعتبار سے سب سے اہم خدمت کو نسبتاً کم اہم خدمت پر مقدم رکھا جائے گا، خدمت کی نوعیت، ہر موقع پر یکساں نہیں ہوتی، کسی موقع پر ایک قسم کی خدمت اہم ہوتی ہے تو کسی اور موقع پر دوسری قسم کی خدمت کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ بسا اوقات کوئی خدمت حفظِ ما تقدم کے طور پر اہمیت رکھتی ہے اور اس کے مقابل دوسری خدمات جو مستقل نوعیت کی ہوتی ہیں ان کو ثانوی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ حضور ﷺ کچھ لوگوں کی مالی معاونت فرماتے تھے، اُس وقت حضرت سَعد بن اَبی وَقاص رضی اللہ عنہ بھی آپؐ کی خدمت میں موجود تھے۔ حضرت سعدؓ بیان کرتے ہیں: آپ جن لوگوں کی مالی معاونت فرما رہے تھے اُن کے مقابل ایک اور ضرورت مند کی جانب میری طبیعت زیادہ مائل تھی، لیکن آپ اس کو کچھ بھی عطا نہیں کر رہے تھے۔ اس پر میں نے آپؐ کی توجہ اُس کی طرف مبذول کروائی تو آپ نے فرمایا:

إِنِّي لَأُعْطِي الرَّجُلَ وَغَيْرُهُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْهُ، خَشْيَةَ أَنْ يَكُبَّهُ اللَّهُ فِي النَّارِ[۲۷]

"میں بعض اوقات کسی شخص کی مالی معاونت کرتا ہوں، جبکہ اس کے مقابل کوئی اور مجھے زیادہ پسند ہوتا ہے (میں اس کی مدد) اس اندیشے سے کرتا ہوں کہ کہیں وہ مالی امداد نہ ملنے پر برگشتہ ہو جائے اور اللہ اسے جہنم میں جھونک دے۔"

---

[۲۷] صحیح بخاری، کتاب الایمان، حدیث ۲۰؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، حدیث ۲۸۶

یعنی مالی خدمات میں بھی بعض اوقات، ترجیحات ہوتی ہیں۔اس طرح آتشزدگی، سیلاب، زلزلہ،وباوغیرہ جیسی ناگہانی آفتوں میں بھی حالات کے مطابق ترجیحات کی حکمت عملی وضع کرنے سے خدمات کے بہتر نتائج مرتب ہوتے ہیں۔تاہم یہ ترجیح کسی شخصی امتیاز کے بغیر محض ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے متعین کی جانی چاہیے۔

## انسانی خدمات کی راہ میں رکاوٹیں

انسانی خدمات اور صالح اعمال کے تسلسل میں دو رکاوٹوں میں سے کوئی ایک رکاوٹ ہو سکتی ہے، ایک رکاوٹ داخلی اور دوسری بیرونی ہے۔

داخلی رکاوٹ بڑی خطرناک ہوتی ہے، خلوصِ نیت کی کمی اور جذباتی اور بے ہنگم عمل اس کے اہم اسباب ہوتے ہیں۔اس لیے جس شخص کا یہ کام مستقل طور پر کرنے کا ارادہ ہو تو اس کو اپنے آپ کو پوری طرح سے جانچ کر اس میدان میں اترنا چاہیے اور جذباتیت سے اپنے آپ کو کوسوں دور رکھنا چاہئے۔جذباتی اور ضعیف نیت کے لوگ صحیح طریقے سے کوئی کام نہیں کر سکتے اور ان کی محنت کا نتیجہ بر آمد نہیں ہوتا۔ حضرت سھل بن سعدؓ بیان کرتے ہیں: غزوۂ خیبر میں ایک شخص بڑے پُرجوش انداز میں یہودیوں سے لڑ رہا تھا۔لیکن جب اسے زخم پہنچے تو اپنی تکالیف پر صبر نہ کر سکا اور خودکشی کر کے خود کو عذاب کا مستحق کر لیا۔[۲۸] اسلام تو ہر کام خوش اسلوبی سے کرنے کا حکم دیتا ہے۔آپؐ نے فرمایا:

إِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ الإِحْسَانَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ[۲۹]

''اللہ نے ہر کام خوش اسلوبی سے کرنے کا حکم دیا ہے۔''

نیت میں اخلاص نہ ہونے سے انسان اپنے اچھے عمل کا بدلہ انسانوں سے چاہتا ہے اور اس کی

---

۲۸ صحیح بخاری، کتاب ۵۴، حدیث ۲۴۷

۲۹ صحیح مسلم، کتاب ۳۴، حدیث ۸۴

مدد اور معاونت انہی لوگوں تک محدود ہو جاتی ہے جن سے اسے اجر یا کم از کم تعریف کی امید ہوتی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے خالص بندوں کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ جب یہ کسی کو مال دیتے ہیں[30] یا ضرورت مند لوگوں کو کھانا کھلاتے ہیں[31] تو ان کا اصل محرک اللہ کی محبت ہوتی ہے، اور انہیں لوگوں سے نہ تو کسی اجر کی امید ہوتی ہے اور نہ ان کی احسان مندی اور شکریہ کی۔

عملِ خدمت میں دوسری رکاوٹ بیرونی ہے۔ انسانی زندگی میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں، کسی کے اچھے کام کی حوصلہ افزائی کرنے والے بھی اور اس کی راہ میں روڑے اٹکانے والے بھی۔ قرآن کا سبق یہ ہے کہ بھلائی اور خیر کی جانب پیش رفت کے دوران راہ اُلجھانے والوں سے دامن بچاتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھا جائے۔ اور مشکلات پر مثبت اندازِ فکر کے ساتھ جچا تُلا اور مناسب ردّ عمل دیا جائے۔ اس لیے فرمایا:

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ[32]

''ان کی باتوں کو احسن طریقے سے ٹال دو۔''

معاشرے کے غیر ذمہ دار لوگ انسانیت کی خدمت انجام دینے والوں پر طرح طرح کے الزامات دھرنے سے گریز نہیں کرتے اور نہ کریں گے، ان کا دفاع اپنے صاف شفاف کردار اور عملِ پیہم ہی سے کیا جاسکتا ہے۔ خدمت کا عمل تسلسل سے جاری رہے تو خدمت کرنے والے اور خدمت کے حاجت مندوں پر اس کے دوررس اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ[33]

بے شک اللہ بھلے لوگوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

---

[30] البقرة: ۱۷۷

[31] الانسان: ۸

[32] فصّلت: ۳۴

[33] التوبة: ۱۲۰

## انسانی خدمات کا ماحصل

انسانی خدمات کا ماحصل یہ ہے کہ انسانیت کے جذبے سے اللہ کی عطا کی ہوئی نعمتوں سے انسانوں بلکہ غیر موذی جانوروں کو بھی بہرہ ور کرنا چاہیے۔ایک انسان جب خدمت کے حاجت مند کسی انسان کی خدمت کرتا ہے تو ایک طرح سے خدمت کرنے والے اور خدمت سے استفادہ کرنے والے کے درمیان ایک مقدس تعلق قائم ہو جاتا ہے۔اس لیے ان دونوں کے ایک دوسرے پر کچھ حقوق عائد ہوتے ہیں جن کا ذکر پہلے حصہ میں کیا گیا ہے۔

اسلامی اخلاقیات میں خدمت، بالخصوص معنوی خدمت کے عمل کو ایک تقدس حاصل ہے اور مسلم معاشرہ اس کو بڑے احترام کی نظر سے دیکھتا ہے۔لوگوں کو اللہ کی بندگی کی طرف دعوت دینا اور دعوت قبول کرنے والوں کی تعلیم و تربیت کرنا جہاں ایک پاکیزہ عمل ہے وہاں ایک مربوط و منظم اسلامی معاشرہ بنانے کا عمل بھی ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا دین کی روح یہ ہے کہ خیر خواہی کی جائے، صحابہ کرامؓ نے عرض کی کہ کس کس کی؟ آپؐ نے فرمایا: اللہ کی، اللہ کی کتاب کی، اللہ کے رسول کی، مسلمانوں کے حکمرانوں کی اور عام مسلمانوں کی۔[۳۴] امام نوویؒ اس کی تشریح میں فرماتے ہیں: اللہ اور اس کے رسول پر صحیح ایمان لانا ان دونوں کی خیر خواہی ہے، حکمرانوں کو حق سچ بتانا اور ان کی خوشامدیں نہ کرنا ان کی خیر خواہی ہے اور عام مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کرنا ان کی خیر خواہی ہے۔امت مسلمہ کی اصل خدمت یہ ہے کہ انہیں صحیح اسلامی تعلیمات سے مزین کیا جائے اور ان پر عمل کروایا جائے، ان میں فکری وحدت کی روح پھونکی جائے، ان کو بحیثیت مہذب امت، تیار کیا جائے۔ان میں سنجیدگی اور متانت پیدا کی جائے۔ برے اخلاق سے ان کو دور رکھا جائے۔اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کا جذبہ ان میں ابھارا جائے۔انہیں مثالی امت کے طور پر تیار کیا جائے۔یہی دراصل امت کی حقیقی خدمت ہے۔انفرادی خدمتوں کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔یہ خدمات بھی ماحول سازی میں بڑا کردار ادا کرتی ہیں اور اجتماعی خدمت کو مفید سے مفید تر

[۳۴] صحیح مسلم، کتاب الایمان، حدیث ۱۰۳

بناتی ہیں لیکن محض انفرادی خدمت پر اکتفا کرنا مسلم معاشرے میں وہ تبدیلی نہیں لا سکتا جو اسلام کا ہدف ہے۔ ''خدمت کی ترجیحات'' میں ہم نے ذکر کیا کہ معنوی خدمت کی بہت اہمیت ہے، لیکن معنوی خدمات تب بار آور ہو سکتی ہیں جب لوگوں کی مادی ضروریات پوری ہوں۔ ایک مرتبہ آپؐ کی خدمت میں مضر قبیلے کے کچھ لوگ آئے جو خستہ حال اور بھوک سے نڈھال تھے۔ آپؐ اُن کو دیکھ کر کبیدہ خاطر ہوئے۔ آپؐ نے فوری طور پر ان کے لیے کھانے پینے کا بندوبست فرمایا۔ اس کے بعد ہی ان سے اسلامی تعلیمات کی بات ہوئی۔[۳۵]

خلاصہ یہ کہ خدمات معنوی ہوں یا مادی، دونوں میں مکمل منصوبہ بندی، سنجیدگی، خلوصِ نیت، فکری یکسوئی، عملی اتفاق اور تسلسل کا ہونا ضروری ہے اور ان اوصاف میں سے جس چیز کی کمی ہوگی، وہ خدمت کے ثمرات پر اثرانداز ہوگی۔

---

۳۵ صحیح مسلم، کتاب ۱۲، حدیث ۸۹

# اسلام میں انسانی خدمات کے بعض نظری و عملی پہلو

مولانا محمد یٰسین ظفر*

ایک خوبصورت معاشرے کی تشکیل میں بہت سے عوامل اور اسباب کار فرما ہوتے ہیں۔ ایک پائیدار معاشرہ، جو اپنی تہذیب و ثقافت کی روشنی میں تمام امور سرانجام دیتا ہے وہی تعمیر و ترقی کی راہ پر گامزن ہوتا ہے۔ اسی سے زندگی کے تمام شعبوں میں خوشحالی، بہتری اور ترقی نظر آتی ہے۔ اس کے برعکس جو معاشرہ اخلاقی انحطاط کا شکار ہو وہ ترقی نہیں کر سکتا۔

بہترین اور طاقتور معاشرہ کی تشکیل کی ایک اکائی باہمی تعاون ہے۔ ایسے معاشرے میں مقتدر اور مال دار طبقہ، غرباء، فقراء، بیوگان، یتیموں اور بیماروں کے لیے اپنا دستِ تعاون پیش کرتا ہے۔ خود پسماندہ طبقات بھی محتاجی سے بچنے کا رجحان رکھتے ہیں اور عملی شکل میں ایک دوسرے کے لیے مفید بننے کی جستجو میں رہتے ہیں۔ یہ طرزِ عمل اور خیر کا جذبہ تمام انسانی معاشروں میں پایا جاتا ہے۔

اسلام میں انسانی خدمت کی بہت اہمیت اور فضیلت ہے۔ مسلمانوں کو رغبت دلائی گئی ہے کہ وہ اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ قرآن حکیم اور احادیث مبارکہ میں جابجا اس کا بیان موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

---

* ناظمِ اعلیٰ، وفاق المدارس السلفیہ، پاکستان

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَآئِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّيْنَ وَآتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ[1]

"نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لیے یا مغرب کی طرف، بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو، یوم آخرت کو، ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتہ داروں اور یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے۔"

انسانی خدمت کے بے شمار میدان ہیں۔ ان میں سے کسی ایک پر بھی دولت وثروت خرچ کرنے پر اجر ملے گا۔ جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں صرف کرتے ہیں، اُن کے خرچ کی مثال ایسے بیان کی گئی ہے جیسے ایک دانہ نشو ونما پا کر سات سو دانے پیدا کر دے۔[2]

خدمت خلق میں وہ مقام نہایت پسندیدہ ہے جب کسی انسان سے کوئی مصیبت یا بوجھ دور کر دیا جائے۔ بدلے میں اللہ اس پر آئی مصیبتوں کو ٹال دیتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

"جو شخص دنیا کی تکالیف میں سے کسی بھائی کی تکلیف کو دور کرے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی تکلیف کو دور کر دے گا، اور جو کسی تنگ دست کے لیے راحت کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کے لیے دنیا و آخرت میں آسانیاں پیدا کرے گا۔ اور جو شخص کسی مسلمان کے عیبوں کو چھپائے گا اللہ اس کے عیبوں کو دنیا اور آخرت میں چھپائے گا۔ اللہ تعالیٰ بندے کی پشت پر ہوتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی پشت پر ہوتا ہے۔"[3]

---

[1] البقرۃ: ۱۷۷

[2] البقرۃ: ۲۶۱

[3] صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار، ح ۴۸

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سوال کیا۔ کون لوگ اللہ تعالیٰ کو محبوب ہیں اور کون سے اعمال اسے پسند ہیں۔ فرمایا ''اَحَبُّ النَّاسِ اِلَی اللہِ تَعَالٰی اَنْفَعُ لِلنَّاسِ'' یعنی جو لوگوں کو زیادہ نفع اور فائدہ بچائیں، وہی اللہ کے محبوب بندے ہیں۔ اور پسندیدہ اعمال کے بارے میں فرمایا ''سَرُوْرٌ تَدْخُلُهٗ عَلٰی مُسْلِمٍ''[۴] کوئی خوشی جو تم اپنے بھائی کو دے سکو۔

## انسانی خدمت کا مفہوم

انسانی خدمت (humanitarian action) کی اصطلاح جدید ہے۔ مسلم روایت میں اس کی جگہ نیکی، احسان، فعل الخیر وغیرہ کی اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں۔ انسان کی ضرورت کی تکمیل محض مالی تعاون ہی سے نہیں ہوتی بلکہ اس کی تمام بنیادی ضروریات کو پورا کرنا خدمتِ انسانیت میں شامل ہے۔ یعنی انسانی خدمت کا میدان بہت وسیع ہے۔

انسانی خدمت میں بعض کام فوری نوعیت کے ہوتے ہیں۔ جن میں حادثات میں زخمی ہونے والوں کو ہسپتال منتقل کرنا، قحط زدہ علاقوں میں خوراک فراہم کرنا، زلزلے کی صورت میں ملبے کے نیچے دبے لوگوں کو باہر نکالنا یا سیلاب میں گھرے ہوئے افراد کو بچانا شامل ہے۔ جبکہ بعض کام طویل عرصہ تک خدمات کے متقاضی ہوتے ہیں۔ جیسے بیماروں کا علاج، مکانات اور تعلیمی اداروں کی تعمیر، درس گاہوں، شفاخانوں اور عبادت گاہوں کی تعمیر و مرمت وغیرہ۔

اسلام نے انسانی خدمت کے جذبے کو عمل میں ڈھالا ہے۔ اسی لیے جب یہ آیت نازل ہوئی کہ: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ[۵] تو ابو طلحہؓ نے اپنا قیمتی باغ اللہ تعالیٰ کے لیے وقف کر دیا۔

---

[۴] مجمع الزوائد ۸/۱۹۴

[۵] ''تم نیکی کے اعلیٰ معیار کو نہیں چھو سکتے جب تک اپنی پسندیدہ چیز اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو'' آل عمران: ۹۲

اسلام کی تلقین یہ ہے کہ انسانی خدمات کا صلہ کسی انسان سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ سے ملے گا۔[6] نیز دشمن کی مجبوری و بے کسی کو انسانی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اسلام کے مزاج کے بالکل خلاف ہے۔ جب ثمامہ بن اثالؓ آپ ﷺ کے اخلاق حسنہ سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئے تو اہلِ مکہ کو ان کی بد تمیزی اور رسول اللہ ﷺ کی دشمنی کی سزا دینے کے لیے انہوں نے اپنے قبیلے بنو یمامہ سے مکہ آنے والی گندم بند کر دی۔ مکہ میں تنگی پیدا ہوئی تو ان کی درخواست پر آپؐ نے انسانی ہمدردی کے تحت گندم کی فراہمی کی اجازت مرحمت فرما دی۔[7]

اللہ نے انسان کو جو عزت و کرامت دی ہے،[8] اس کا تقاضا ہے کہ انسان کی بلا تفریقِ رنگ و نسل و قومیت و لسانیت اور مذہب مدد کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی وحدت اپنی ضروریات میں یکساں ہے۔ عقائد و نظریات کے بعد اہم ترین عمل انسانی خدمت ہے جسے نماز، زکوۃ، حج اور روزے کی بنیادی عبادات میں بھی سمو کر مسلم معاشرے کی انسانی تشکیل کی گئی ہے۔ اسی لیے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ایمان اور انسانی خدمت کو لازم و ملزوم قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً مجرم کے جرائم کو ایک جگہ یوں بیان کیا گیا ہے: ''یہ اللہ بزرگ و برتر پر ایمان نہ لاتا تھا اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا تھا۔''[9] نیز یہ فرمایا: ''کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جو (روزِ) جزا کو جھٹلاتا ہے؟ یہ وہی (بدبخت) ہے، جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور فقیر کو کھانا کھلانے کے لیے (لوگوں کو) ترغیب نہیں دیتا تو ایسے نمازیوں کی خرابی ہے جو نماز کی طرف سے غافل رہتے ہیں، جو ریا کاری کرتے ہیں اور برتنے کی چیزیں عاریتاً نہیں دیتے''۔[10]

انسانی خدمت میں قرابت دار سب سے زیاہ حق دار ہیں۔ خاوند کو لازم ہے کہ وہ اپنے بیوی

---

[6] ''تم اپنی عاقبت کے لیے جو کچھ آگے بھیجو گے، اللہ کے ہاں اسے موجود پاؤ گے''۔ البقرۃ: ۱۱۰

[7] زادالمعاد ۳/۲۷۷

[8] الاسراء: ۷۰

[9] الحاقۃ: ۳۰-۳۴

[10] الماعون

بچوں کی اپنی استطاعت کے مطابق کفالت کرے۔[11] اسی طرح شریعت نے والدین اور عزیزوں پر خرچ کرنے کا حکم دیا ہے۔[12]

## انسانی خدمات کا دائرہ کار اور امکانات

### دعوت کے میدان میں

اسلام میں انسانی خدمت کی کوئی حد مقرر نہیں بلکہ مختلف شعبہ ہائے زندگی اور مراحل میں یہ خدمت سرانجام دی جاسکتی ہے۔ اہلِ اسلام کو ترغیب دی گئی ہے کہ "فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ" "تو تم نیک کاموں میں آگے بڑھو"۔

انسانی خدمت کا ایک میدان دعوت کا بھی ہے۔ یہ انسانوں کی اہم ترین خدمت ہے کہ کوئی اللہ تعالی کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچا دے اور جہنم کی آگ سے انہیں بچا لے۔ آپؐ نے سیدنا علیؓ کو فرمایا تھا اگر اللہ آپ کے ذریعے ایک آدمی کو ہدایت دے تو یہ آپ کے پاس سرخ اونٹ ہونے سے بہتر ہے۔[13]

### تعلیم و تربیت کے ذریعے خدمت

اسلام کی یہ خوبی ہے کہ یہ اپنے ماننے والوں کو جاہل دیکھنا پسند نہیں کرتا بلکہ بار بار تلقین کرتا ہے کہ علم حاصل کرو۔ ہر مسلمان (مرد و عورت) پر علم حاصل کرنا لازم ہے۔[14] نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کا مقصد بھی تلاوتِ آیات، نفوس کا تزکیہ اور کتاب و حکمت کی تعلیم بیان کیا گیا ہے۔[15]

---

[11] الطلاق: ۷

[12] البقرۃ: ۲۱۵

[13] ریاض الصالحین، کتاب العلم، حدیث ۴

[14] سنن ابن ماجہ، کتاب المقدمہ، حدیث ۲۲۴

[15] آل عمران: ۱۶۴

آپ ﷺ نے فرمایا ''بُعِثتُ مُعَلِّماً ''[16] یعنی میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ آپ خود صحابہ کرام کو تعلیم دیا کرتے تھے اور دوسروں کو اس کی ترغیب دیتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس شخص کے لیے دوہرا اجر ہے جو اپنی باندی کو اچھی تربیت اور تعلیم دے اور پھر اسے آزاد کر کے اس سے نکاح کر لے۔[17]

تعلیم کے ذریعے انسانیت کی خدمت کی ایک مثال پاکستان میں موجود وہ دینی مدارس ہیں جن میں سے اکثر میں مختلف علوم کی تعلیم بھی دی جاتی ہے اور طلبہ و طالبات کو بنیادی ضروریات اور سہولیات بھی مفت فراہم کی جاتی ہیں۔

## صحت عامہ کے ذریعے خدمتِ عوام

غیر ترقی یافتہ ممالک میں ایک اہم مسئلہ صحتِ عامہ ہے۔ وسائل کی کمیابی اور غیر منظم و غیر مرتب کاموں کی وجہ سے وسائل ضائع ہو جاتے ہیں لہٰذا لوگ بیماری اور پریشانی کے عالم میں دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ غیر سرکاری علاج بالعموم اس قدر مہنگا ہے کہ ہر کوئی اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے انسانی خدمت کا خالص جذبہ ہو تو صحت کا میدان بہت اہم ہے۔ بالخصوص پاکستان میں ایسے بہت سے مواقع ہیں جہاں غریب و متوسط آبادی اس بات کی مستحق ہے کہ ان کے ساتھ پورا پورا تعاون کیا جائے۔

صحت کے میدان میں ایسے متعدد ادارے موجود ہیں جو لوگوں کی صحت و عافیت کے لیے مثالی خدمات سرانجام دیتے ہیں۔ ان میں ہسپتال، ابتدائی طبّی مراکز اور فری ڈسپنسریاں شامل ہیں جہاں مختلف امراض کا مفت علاج کیا جاتا ہے اور بعض ہسپتال معمولی فیسوں پر لوگوں کو علاج فراہم کرتے ہیں۔ پاکستان میں متعدد ادارے سینکڑوں ایمبولینسوں کے ذریعے ہنگامی حالات میں مریضوں کی مدد کرتے ہیں۔

---

[16] سنن ابن ماجہ، کتاب المقدمہ، حدیث ۲۲۹

[17] صحیح بخاری، کتاب العلم، حدیث ۳۹

صحت کے میدان میں خواتین کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ عہد نبوی ﷺ میں بھی خواتین مختلف مواقع پر طبّی سہولیات فراہم کرتی رہی ہیں۔ ان میں ربیعہ بنت معوذؓ، ام عطیہ الانصاریہؓ، ام سنان الاسلمیہؓ اور رسول ﷺ کی پھوپھی سیدہ صفیہؓ قابلِ ذکر ہیں۔

## فنی تعلیم کا اہتمام

اسلام نے محنت مزدوری اور ہاتھ کی کمائی کو پسند کیا ہے۔ کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے سے بہتر ہے کہ انسان محنت مشقت کرے اور روزی کمائے۔ کسی بے روزگار کو کوئی فن سکھلانا ایک قابلِ قدر کوشش ہے۔

## روزگار کے مواقع

اسی طرح کم وسیلہ افراد کو اپنے روزگار کے لیے بلا سود قرضے فراہم کرنا بھی ایک اہم انسانی خدمت ہے جس کا پاکستان میں دائرہ کافی وسیع ہے۔ ان اداروں کی کارکردگی اور حسنِ انتظام کو مختلف اعزازات کے ذریعے بین الاقوامی سطح پر سراہا گیا ہے۔

اسی طرح عوامی خدمات کے ایسے ادارے موجود ہیں، جو روزگار مہیا کرنے کے لیے قائم کیے گئے۔ روزگار کی فراہمی کا منظم نظام قائم کرنا خدمت انسانیت کی نادر مثال ہے۔

## فقراء و مساکین کی کفالت

اسلام میں اس بات کی بہت اہمیت ہے کہ معاشرے کے ان طبقات کی کفالت کی جائے جو مالی اعتبار سے بہت کمزور ہیں، ان میں فقراء اور مساکین بالاولی شامل ہیں۔ اسلام کے خصائص میں یہ بات شامل ہے کہ وہ محتاجوں اور بے کسوں کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا۔ یہی وجہ ہے کہ زکاۃ کے مصارف میں فقراء و مساکین بھی شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللهِ وَاللهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ [18]

''صدقات (یعنی زکوٰۃ وخیرات) تو مفلسوں اور محتاجوں اور کارکنان صدقات کا حق ہے اور ان لوگوں کا جن کی تالیف قلوب منظور ہے اور غلاموں کے آزاد کروانے میں اور قرضداروں (کے قرض ادا کرنے میں) اور خدا کی راہ میں اور مسافروں (کی مدد) میں (بھی یہ مال خرچ کرنا چاہیے) یہ خدا کی طرف سے مقرر کر دیئے گئے ہیں اور خدا جاننے والا (اور) حکمت والا ہے۔''

خلافت راشدہ کے عہد میں بیت المال سے ایسے لوگوں کی باقاعدہ کفالت کی جاتی تھی اور ماہانہ وظائف جاری ہوتے تھے۔ خلفائے راشدین اور ان کے مقرر کردہ گورنر اپنے اپنے علاقوں میں عوامی مسائل کا جائزہ لیتے اور لوگوں کے ذاتی مسائل کو جان کر ان کی براہِ راست مدد فرماتے تھے۔ اسلامی معاشرے میں حکومت کے ساتھ وہ لوگ بھی ذمہ دار ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے مال واسباب، دولت وثروت سے نواز رکھا ہے۔

## یتیموں کی تعلیم وتربیت

وہ بچہ جس کے والد فوت ہوگئے ہوں، خصوصی سلوک اور حقوق کا حق دار ہے۔ حضرت سہیل بن سعد سے روایت ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح ساتھ ہوں گے۔ آپ نے اپنی شہادت کی اور درمیانی انگلی سے اشارہ کیا۔[19] آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے مسلمانوں کے کسی یتیم بچے کے کھانے پینے کی ذمہ داری لی، اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل فرمائے گا۔[20]

---

[18] التوبۃ: ۶۰

[19] صحیح بخاری، کتاب الطلاق، باب اللعان، ۴۹۷/۳، ح ۵۳

[20] ترمذی، کتاب البر والصلۃ، باب ما جاء فی رحمۃ الیتیم و کفالتہ، ۳۶۸/۳، حدیث ۲۳

## حادثات میں متاثر ہونے والوں کے ساتھ تعاون

پر امن زندگی سکون کا باعث ہے اور عافیت بڑی نعمت ہے لیکن دنیا میں حادثات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ انفرادی حادثات کے علاوہ انسان اجتماعی طور پر قدرتی آفات مثلاً زلزلہ، سیلاب، سمندری طوفان، لینڈ سلائیڈنگ، جنگل کی آگ وغیرہ سے بڑی تعداد میں متاثر ہوتے ہیں۔ اسی طرح انسانی افعال سے پیدا کردہ جنگ جیسے بعض عوامل بڑے المیے کو جنم دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں ہمدردی کے فطری جذبے کے تحت انسانی بنیاد پر متاثرہ افراد کی مدد کی جاتی ہے۔

پاکستان میں حادثات پر لوگوں کا ردعمل بہت متاثر کن ہوتا ہے۔ اکتوبر ۲۰۰۵ کے شدید زلزلے، اور ۲۰۱۰ میں وسیع رقبے پر آنے والے سیلاب نے بڑی تعداد میں لوگوں کو متاثر کیا۔ ان مواقع پر ہر علاقے میں حکومتی امداد سے پہلے عوام متحرک تھے اور انہوں نے بھرپور جوش و خروش سے ضروریاتِ زندگی تقسیم کیں، امدادی کیمپ قائم کیے، عارضی ہسپتال، رہائش گاہیں اور اسکولز قائم کر دیئے۔ انسانی یگانگت کے یہ مظاہر پاکستانی معاشرے میں بار بار نظر آئے ہیں۔

## جنگ سے متاثر افراد کی بحالی

جنگ کبھی بھی پسندیدہ عمل نہیں رہی۔ جنگ دراصل ایک معاشرتی اور سیاسی مسلح تصادم ہے جس کے سنگین نتائج سے معاشرے کو بے پناہ نقصان پہنچتا ہے۔ اسلام نے ناگزیر حالات میں جنگ کی اجازت دی ہے لیکن اس دوران بھی انسانوں کی تکریم کو ملحوظ رکھنے کے لیے تفصیلی ہدایات دی ہیں۔

دورِ جدید کی جنگیں انتہائی تباہ کن ہیں اور ان سے کروڑوں لوگ بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ ایسے میں بے سروسامان اور مصیبت زدہ افراد کی ذمہ داری اسلام نے ریاست پر ڈالی ہے۔ عہدِ نبوی اور اس کے بعد کی اسلامی حکومتوں نے یہ ذمہ داری خوب نبھائی اور جنگ میں شہید ہونے والے افراد کے بیوی بچوں کو اپنی کفالت میں لیا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ عمل کمزور ہو گیا ہے۔ یہ کام بھی بعد ازاں مختلف تنظیموں نے سنبھال لیا۔ آئی سی آر سی بھی ایسی

ہی ایک عالمی تنظیم ہے۔

جنگ کا ایک نتیجہ بڑی تعداد میں مہاجرین و پناہ گزینوں کی شکل میں بھی سامنے آتا ہے۔ اسی طرح ہجرت کی بعض وجوہات سیاسی، مذہبی اور معاشی بھی ہو سکتی ہیں۔ ان میں کسی خاص طبقے پر ظالم حکمرانوں کا ظلم یا قدرتی آفات بھی شامل ہیں۔ اگرچہ مہاجرین کے ساتھ انفرادی اور اجتماعی تعاون کا سلسلہ دنیا بھر میں قائم ہے، لیکن ایسے افراد کی مشکلات ہمہ پہلو ہوتی ہیں اور ان کی بحالی ایک دیرپا اور کٹھن عمل ہے، جس میں کردار ادا کرنا انسانیت کی ایک بڑی خدمت ہے۔

## انسانی خدمات میں حائل مشکلات اور مسائل

انسانی خدمت کی عظمت کے عمومی احساس اور انسانوں کی تکلیف سے آگاہی کے باوجود دوسروں کی مدد کرنا ہر جگہ اور ہر وقت آسان نہیں ہوتا۔ خاص طور پر رضاکارانہ خدمت میں بہت سی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ ان میں سے چند ایک کی نشاندہی مفید ہو گی۔

رفاہی اور خدمت کے کام میں ایک بڑی رکاوٹ لوگوں میں اِن سے متعلق پائی جانے والی منفی سوچ ہوتی ہے۔ عام گمان یہ ہوتا ہے کہ خدمت میں مصروف رضاکار یقیناً کسی خفیہ مفاد کی جستجو میں ہیں۔ بدگمانی اور بدظنی کے شکار افراد اور معاشرے، رضاکاروں کے ساتھ تعاون کرنے کی بجائے انہیں بُرا جانتے ہیں۔

حق دار تک حق پہنچانا عام حالات میں بھی مشکل ہے لیکن مصائب و مشکلات کی کیفیت میں یہ عمل مشکل تر ہو جاتا ہے۔ ایسے میں یہ امکان ہوتا ہے کہ جھوٹ فریب کی چادر میں لپٹی کہانی انسان کو متاثر کر دے مگر سادہ لوح ضرورت مند افراد تعاون سے محروم رہ جائیں۔

یہ بھی المیہ ہے کہ انسانی خدمت سرانجام دینے والے بعض ادروں اور تنظیموں نے عوامی اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ بعض ذمہ داران اور کارکنان میں امانت و دیانت کا فقدان دیانت داری سے خدمت کرنے والوں کے لئے پریشانی اور مشکلات کا باعث بن جاتا ہے۔

مذہب کو موجودہ عالمی ماحول میں ایک منفی اور ناپسندیدہ رنگ دے دیا گیا ہے۔ بالخصوص اسلام کو عالمی سیاسی ماحول میں کئی مشکلات کا سامنا ہے۔ اسی لیے تعلیم و خدمت کا ایک وسیع نیٹ ورک ہونے کے باوجود پاکستان کے دینی مدارس کو متعدد انتظامی مسائل کا سامنا ہے، جن کو حل کرنا ضروری ہے۔

انسانی خدمت میں بنیادی چیز لوگوں کا اعتماد ہے۔ دین کی بنیاد پر مصروفِ عمل اداروں کو عوامی اعتماد تو حاصل ہے لیکن ان کی رجسٹریشن میں کافی مسائل ہیں، جو توجہ طلب ہیں۔ ان کے حسابات کی شفافیت کا معقول انداز میں جائزہ لینا اور اس کے لیے احترام و آسانی پر مبنی نظام تشکیل دینا متعلقہ اداروں کی ذمہ داری ہے۔

دیانت داری سے انسانی خدمت کرنے والے اداروں کو سہولت فراہم کی جانی چاہیے کیونکہ وہ اپنے اپنے دائرہ ہائے کار میں حکومت کی ذمہ داریاں ادا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حکومت کے پاس موجود سرکاری زمین میں سے مکمل تصدیق اور اطمینان کے بعد حسبِ ضرورت زمین کی مفت فراہمی ایک بڑی مدد ہو گی۔ اسی طرح بجلی و گیس کے بِل میں عائد ٹیکسوں پر چھوٹ ان اداروں کے انتظامی اخراجات میں کمی کا ایک بڑا ذریعہ ہو گی۔

# سوالات وجوابات

**سوال:** ایسے افراد جو اپنا ملک چھوڑنے پر مجبور ہو گئے ہوں، ان کے لیے امداد و تعاون کے جذبے کو کیسے ابھارا جاسکتا ہے ؟ یہ سوال اس لیے اہم ہے کہ موجودہ عالمی حالات میں ایسی صورتِ حال بالعموم مسلمانوں ہی کو درپیش ہے، جب کہ اسلام اور مسلمانوں سے متعلق جو تصوّر عام کیا گیا ہے اس کی بنا پر مسلم پناہ گزینوں کو مشکلات کا سامنا بھی رہتا ہے۔

**جواب از مولانا یٰسین ظفر:** آج سے چار سال قبل مجھے جرمنی جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں مجھے براہِ راست یہ جاننے کا موقع ملا کہ جرمن حکومت نے شام کے مہاجرین کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا ہے اور تقریباً ۱۰ لاکھ کے قریب افراد کو پناہ اور دیگر مراعاتِ زندگی فراہم کی گئی ہیں۔ طبعی طور پر جرمن عوام میں سے ایک طبقہ اس حوالے سے شکوہ کناں بھی تھا کہ ہم سے زیادہ سہولیات ان مہاجرین کو دی گئی ہیں، تاہم جس تاثر کا ذکر آپ نے کیا اور مقامی سطح پر موجود مزاحمت کے باوجود جرمن حکومت کا یہ جذبہ قابلِ قدر ہے۔ لہٰذا عمومی طور پر یہ سمجھنا بھی درست نہیں ہے کہ مغرب کلی طور پر اسلام اور مسلمانوں کے لیے عدم برداشت یا دشمنی پر مصر ہے۔ اصولاً، اس حوالے سے اجتماعی کاوشوں کی ضرورت ہے مثلاً اس میدان میں او آئی سی کو کردار ادا کرنا چاہیے، اور مہاجرین پر مسلم ممالک کی سرحدیں بند کرنے کی بجائے ان کے ساتھ باہم تعاون کیا جانا چاہیے۔ یہ درست ہے کہ مہاجرین میزبان ممالک میں بعض مشکلات کا باعث بھی بنتے ہیں لیکن ان کی ضرورت اور مجبوری کا احساس کرتے ہوئے ان کی مدد بھی کی جانی چاہیے اور مہاجرین کو بھی ضروری تربیت فراہم کی جانی چاہیے۔ بالخصوص مسلم ممالک اور اداروں کو مل کر ایک ایسی پالیسی

بنانی چاہیے کہ وہ اپنے دین کا تقاضا سمجھ کر تمام مظلوم مہاجرین کی آگے بڑھ کر مدد کریں، چاہے ان کا تعلق کسی بھی ملک یا مذہب سے ہو۔

**سوال:** یہ تو درست ہے کہ اسلام نے ہر ایک سے حسنِ سلوک کا سبق دیا ہے لیکن یہ بھی اسلام کا سبق ہے کہ اللہ کی اطاعت نہ کرنے والوں کو قیادت کا منصب نہ دیا جائے۔ انسانی خدمات کے میدان میں آئی سی آر سی یا دیگر غیر مسلم یا غیر مذہبی تنظیموں کے ساتھ اشتراکِ عمل کے حوالے سے مسلم افراد یا تنظیموں کا مناسب طرزِ عمل کیا ہو گا؟

**جواب از مفتی عبد المنعم:** یہ درست ہے کہ سیرت سے معلوم ہوتا ہے کہ دشمنانِ دین سے بھی حضورؐ کا رویہ مثالی تھا مگر یہ بھی فقہی قانون ہے کہ اسلام کو نمایاں تر مقام دیا جانا بھی اسلام کے مزاج کا حصہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر مذہب و نظریہ اپنے لیے ایسا ہی نمایاں تر مقام چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ آئی سی آر سی ایک انٹرنیشنل فورم ہے جس میں اسلام سمیت تمام نظریات، مذاہب اور فرقوں کے لوگ شامل ہیں۔ اس کا مقصد ایسا ہے جس پر یہ تمام مکاتبِ فکر متفق ہیں۔ اس مقصد کے لیے آپ حلف الفضول اور اس سے متعلق رسول اللہ ﷺ کا ارشاد سامنے رکھیں تو آپ کو احساس ہو گا کہ مظلوم و مجبور کی خدمت ایک بلند تر انسانی مقصد ہے اور اس سطح پر کسی ایک مکتبہ فکر کا فتویٰ سامنے رکھ کر فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرا یہ کہ مسلم فکر میں حالیہ عرصے کے دوران الولاء والبراء کے نظریے کے تحت غیر مسلموں سے ترکِ تعلق کی سوچ ایک چیلنج کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ اس سلسلے میں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ کسی فرد کے دوسری جماعت یا گروہ سے تعلق کی بنا پر اس کو مخالف گروہ میں شامل کر دینا کسی طور درست نہیں۔ فرقہ پرستی سے قطع نظر انسانی بنیادوں پر تمام افرد کے ساتھ تعاون کے رجحان کو عام کیا جانا چاہیے۔ اس مقصد کی خاطر وسعتِ ظرف پیدا کرنے اور سب کو عزت دینے کی ضرورت ہے۔

**سوال:** بعض اوقات حکومتی ضابطے مختلف رفاہی تنظیموں کے لیے مشکل کا باعث بنتے ہیں جب کہ یہ بھی درست ہے کہ انسانی خدمت کے اس مقدس کام کے دوران بھی کئی طرح کی بدعنوانی یا قابل گرفت امور کا امکان رہتا ہے۔ایسے میں حکومت و اداروں کے لیے درست حکمتِ عملی کیا ہو گی؟

**جواب از مولانا یٰسین ظفر:** یہ درست ہے کہ حکومت کی ضرورت ہے کہ وہ رفاہی تنظیموں کی سرگرمیوں کے مطابق جانچ پڑتال کرے اوراس کے مطابق انہیں کام کرنے کی اجازت دے۔ تاہم رجسٹریشن اور آمدن اور خرچ کی پڑتال کے نام پر ان اداروں کے لیے مشکلات کو بڑھا دیا گیا ہے۔ ایسی صورت میں جہاں اصلاحِ احوال کے لیے مسلسل کوشش جاری رہنی چاہیے وہاں دستیاب مواقع کے اندر اس نیک کام کو ترک نہیں کیا جانا چاہیے۔ جس جانب آپ نے توجہ دلائی ہے اس کا ایک بڑا اور اہم پہلو عوام کا کردار ہے۔ عوام کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ جن اداروں یا تنظیموں سے وہ تعاون کر رہے ہیں کیا ان کے مقاصد اور طرزِ عمل اس قدر شفاف ہیں کہ ان پر اعتماد کیا جا سکے۔ عوام، حکومت، اور رفاہی تنظیموں کا مثبت و فعال کردار ہی بہتر حکمتِ عملی ہے۔

# صدارتی کلمات

## سید ابرار حسین

کانفرنس کے ابتدائی سیشن میں ہم نے تین فاضل مقررین کی جانب سے پر مغز گفتگو سنی ہے۔ ہمیں معلوم ہوا کہ اسلام میں انسانی بنیاد پر خدمت اور مدد کے لیے مذہب کی کوئی تخصیص نہیں ہے بلکہ غیر مسلم کی بھی اسی پیمانے پر مدد کی جا سکتی ہے۔ اس نسبت سے یہ پہلو بھی بہت اہم ہے کہ انسانی خدمت کا تصور صرف مالی یا مادی نہیں بلکہ روحانی طور پر بھی انسانی خدمت ضروری ہے۔ ہمیں ان بے شمار صورتوں میں سے بعض کا اندازہ بھی ہوا جو انسانیت کی خدمت کے لیے اپنائی جا سکتی ہیں۔ دراصل اسلام زندگی گزارنے کے لیے ایک جامع نظام فراہم کرتا ہے، جس کا عملی نمونہ رسول اللہ ﷺ کے اسوہ کی شکل میں ہمارے سامنے موجود اور محفوظ ہے۔ آپ ؐ کا یہ ارشاد کس قدر متاثر کن ہے کہ: اِنَّمَا بُعِثۡتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الۡاَخۡلَاقِ یعنی مجھے بہترین اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہے۔

مکارمِ اخلاق میں یہ بات بھی شامل ہے کہ انسان کی مدد، اس سے ہمدردی اور حسنِ سلوک برتا جائے۔

یہ پہلا سبق تھا کتابِ ہدیٰ کا
کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا

الخلق عیال اللہ کے اصول کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تمام انسانیت کی مدد کا جذبہ مسلمانوں میں خاص طور پر زیادہ ہونا چاہیے کیونکہ ان کا ایمان خدائے رب العالمین اور رسول رحمت للعالمین ﷺ پر ہے اور ان کی شناخت اور افعال کی اُنہی سے نسبت ہے۔ اس جذبے کو ابھارنے کے لیے بنیادی سطح کی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک، نصاب میں خدمتِ انسانیت کے جذبے کو ایک ذمہ داری کے طور پر شامل کرنے کی اور اسے فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ اللہ کرے کہ ہم سب کو یہ جذبہ ودیعت ہو۔ آمین

# اسلام اور انسانی خدمات

# شرعی و قانونی نقطۂ نظر

# بین الاقوامی انسانی امداد اور ریاستی قانون

## ممکنہ تعارض اور حل کے لیے تجاویز


محمد رفیق شنواری*


بین الاقوامی قانونِ انسانیت کا موضوع مسلح تصادم کے دوران تصادم اور جنگ کے اثرات کو صرف جنگ میں براہِ راست حصہ لینے والوں تک محدود کرتا ہے۔ لیکن بد قسمتی سے آج جہاں بھی مسلح تصادم برپا ہے وہاں کے عام شہری، شہری علاقے اور غیر مقاتلین اس کے اثرات سے محفوظ نہیں ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ان کے بنیادی حقوق کی خلاف ورزی ہو رہی ہے بلکہ عام افراد مسلح تصادم سے براہِ راست متاثر بھی ہو رہے ہیں۔ ایسے میں ضروری ہے کہ عام شہریوں اور تمام غیر مقاتلین کے بنیادی حقوق اور بین الاقوامی قانونِ انسانیت میں مذکور دیگر تمام حقوق کی فراہمی کے لیے اہتمام کیا جائے۔ چنانچہ دنیا بھر میں اب ایسی کئی تنظیمیں وجود میں آگئی ہیں جو مسلح تصادم میں گھرے لوگوں کو انسانی بنیادوں پر مدد پہنچانے کے لیے کام کر رہی ہیں۔ ان تنظیموں کو انسانی خدمات فراہم کرنے میں کئی طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں ان تمام مشکلات کا احاطہ کرنا مقصود نہیں، بلکہ ان میں سے صرف ایک مشکل اور اس کے لیے اسلامی قانون کی روشنی میں ممکنہ حل کے لیے تجاویز مرتب کرنے پر توجہ مرکوز رکھی جائے گی۔ وہ مشکل انسانی خدمات کی بین الاقوامی نوعیت اور مقامی قوانین کے تعامل سے پیدا ہوتی ہے۔ مقالہ کئی حصوں میں تقسیم ہے اور ہر حصے میں سہولت کے لیے مزید عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔

---


* لیکچرار، شیخ زید اسلامک سینٹر یونیورسٹی آف پشاور

# حصہ اوّل

## بین الاقوامی انسانی امداد اور ریاست کی ذمہ داری

بین الاقوامی قوانین اور نظام میں مذکور انسانی امداد کو یقینی طور پر قابل وصول بنانے کے لیے ریاستوں کی کچھ ذمہ داریوں کا ذکر بین الاقوامی قانونِ انسانی حقوق میں بھی ملتا ہے، اور بین الاقوامی قانونِ انسانیت میں بھی۔ دنیا بھر میں جاری مسلح تصادم بالخصوص گذشتہ دو دہائیوں کے دوران بین الاقوامی قوانین کے تحت عام شہریوں اور غیر مقاتلین کو امداد کی فراہمی میں جن چیلنجز کا سامنا رہا ہے ان میں سے ایک چیلنج، ریاستی قوانین کی پیروی کا مسئلہ ہے۔[1] بعض صورتوں میں انسانی خدمت کی تنظیموں کا عام شہریوں کو امداد پہنچانے کا ہدف ریاستی قوانین سے اعراض کیے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ اگر یہ تنظیمیں امداد بہم پہنچانے پر اپنی توجہات مرکوز رکھیں تو ریاستی قوانین کی خلاف ورزی لازم آتی ہے اور اگر ریاستی قوانین کی پیروی کا خیال رکھا جاتا ہے تو امداد کی فراہمی ممکن نہیں رہتی۔ اس کی ایک مثال دہشت گردی سے متعلق قوانین ہیں۔ دہشت گرد تنظیم جو ریاستی نظام کو چیلنج کرتی ہے، اس تنظیم کو حکومت ہر قیمت پر کمزور اور اپنے عزائم سے پسپا کرنا چاہتی ہے۔ اس لئے حکومت کی کوشش رہتی ہے کہ ایسی تنظیم کو بیرونی دشمنوں سے رابطہ اور وہاں سے کسی بھی طرح کا تعاون حاصل کرنے کے لیے تعلقات استوار کرنے کا موقع نہ ملے۔ اس دوران خالص انسانی امداد پہنچانے والی تنظیمیں بھی اس دوہری مشکل سے دوچار ہوتی ہیں کہ اگر محارب گروہوں کو تعاون پہنچایا جائے تو ریاستی قوانین اور پالیسیوں کی مخالفت لازم آتی ہے اور اگر ریاستی قوانین اور پالیسیوں کی پاسداری کی جائے تو اپنے مشن پر سمجھوتہ کرنا ہوگا۔ اس چیلنج کے پیچھے درحقیقت دو وجوہات ہیں۔

**اولاً:** حالیہ عرصے کے جنگی رجحانات میں مسلح تصادم کے دوران اجرت وصول کر کے کسی فریق کی جانب سے لڑنے والی کارپوریشنز کو ٹھیکہ دے دیا جاتا ہے جن کی دلچسپی اس تصادم کو پایۂ تکمیل تک

---

[1] Rogier Bartels, "The Relationship between International Humanitarian Law and the Notion of State Sovereignty." *Journal of Conflict & Security Law* 23, no. 3 (2018): 461-486.

پہنچانے کی بجائے اسے دوام دے کر اپنا ٹھیکہ اور کاروبار جاری رکھنے میں ہوتی ہے۔ چنانچہ ریاستیں ایسے مسلح گروہوں سے نمٹنے کے لیے اپنے ریاستی قوانین تشکیل دیتی ہیں جنہیں عموماً دہشت گردی سے نمٹنے کے قوانین کہا جاتا ہے۔ اس دوران بین الاقوامی انسانی امداد کے لیے قائم تنظیموں کے امداد پہنچانے کے عمل میں رکاوٹ ڈالی جاتی ہے۔[2]

ثانیاً: مسلح تصادم میں ملوث گروہ اپنی کارروائیوں کو خود مختار ریاست / حکومت کے قیام کے عزائم سے بھی جواز فراہم کرتے ہیں۔ مثلاً داعش نے شام اور عراق میں اپنی تمام تر کارروائیوں کو آزاد و خود مختار خلافت کے قیام سے جواز فراہم کیا۔ چنانچہ ان تنظیموں سے نمٹنے والی ریاستیں ان سے متعلق گروہوں کو بین الاقوامی انسانی امداد کا مستحق نہیں سمجھتیں۔[3] ایسی حالت میں ریاستوں کی جانب سے بے لچک رویوں کی بناء پر عام شہری بھی اس طرح کی امداد سے محروم رہ جاتے ہیں اور ان ریاستوں کو بین الاقوامی قوانین اور معاہدوں کی تکمیل میں ناکامی کے الزام کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حالانکہ ریاستوں کی ذمہ داری ہے کہ اپنے شہریوں کے بنیادی حقوق کی فراہمی یقینی بنائیں۔ اسی طرح کچھ ذمہ داریاں بین الاقوامی انسانی حقوق کے تحت بھی عائد ہوتی ہیں۔ ذیل میں ایسے کچھ قوانین کی نشاندہی کی جاتی ہے جن کے تحت ریاستوں پر اپنے شہریوں کے لیے چند بنیادی حقوق اور ذمہ داریاں عائد کی جاتی ہیں۔

## بین الاقوامی انسانی امداد سے متعلق ریاست کی ذمہ داری

الف۔ بنیادی انسانی حقوق سے متعلق نو ایسے معاہدات ہیں جن کی رو سے حالتِ جنگ و امن دونوں میں یکساں طور پر ریاستوں کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اپنی سرزمین کے باشندوں کے لیے

---

[2] Mary Kaldor, *New and Old Wars: Organized Violence in a Global Era*. (Cambridge: Polity Press, 2012).

[3] Anna Leander, "The Market for Force and Public Security: The Destabilizing Consequences of Private Military Companies," *Journal of Peace Research* 42, no. 5 (2005): 605-622.

بنیادی انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے اقدامات کریں۔[4] چند مستثنیات کے ساتھ[5] انسانی حقوق سے متعلق دستاویزات میں ''بین الاقوامی انسانی امداد'' کے عنوان سے کسی بنیادی حق کا ذکر نہیں۔ اس بنیاد پر چند ماہرین کا خیال ہے کہ بین الاقوامی قوانین میں ایسا بنیادی کوئی حق نہیں جسے ''بین الاقوامی انسانی امداد کا حق'' کہا جاسکے۔[6] تاہم بنیادی حقوق سے متعلق دستاویزات میں درج کچھ حقوق، جیسے جینے، خوراک، کپڑے اور صحت کے حقوق[7] وغیرہ، اور ان سے متعلق ریاستوں کی ذمہ داریوں کو دیکھ کر بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان حقوق کی پاسداری کے مفہوم میں ''بین الاقوامی انسانی امداد'' بھی شامل ہے۔ انسانی حقوق سے متعلق مقتدر اداروں کے مطابق ریاستوں کی تین طرح کی ذمہ داریاں ہیں:

احترام کی ذمہ داری (Duty to Respect): تمام ریاستیں ان حقوق کا احترام کریں گی یعنی ریاستیں خود ان حقوق کی پامالی کا ارتکاب نہیں کریں گی؛ تحفظ کی ذمہ داری (Duty to protect): ریاستیں ان حقوق کو تحفظ فراہم کریں گی یعنی کسی بھی شخص کو ان حقوق کو پامال کرنے نہیں دیں گی؛ تکمیل کی ذمہ داری (Duty to fulfill): ریاستیں ان حقوق کی تکمیل کے لیے قانون سازی سمیت تمام ضروری اقدامات کریں گی۔

[4] UN Office of the High Commissioner for Human Rights (OHCHR), "Applicable International Human Rights and Humanitarian Law Framework," in *Manual on Human Rights Monitoring* (Geneva: OHCHR, 2011), https://www.ohchr.org/Documents/Publications/Chapter05-MHRM.pdf.

[5] اس قسم کی مستثنیات ''سافٹ لا'' میں پائی جاتی ہیں۔ چند ایسے قوانین کی نشاندہی کے لیے دیکھیے:
David Fisher, "Domestic regulation of international humanitarian relief in disasters and armed conflict: A comparative analysis," *International Review of the Red Cross*, Vol. 89, No. 866 (June 2007): 345-372, 347.

[6] Yoram Dinstein, "The right to humanitarian assistance in peacetime," *Naval War College Review*, Vol. 53 (Autumn 2000): 77.

[7] ملاحظہ ہو: بین الاقوامی دستاویز برائے انسانی حقوق، دفعہ ۲۵

مثلاً جینے کے حق سے متعلق ریاست کی ذمہ داری میں نہ صرف یہ شامل ہے کہ وہ ریاست کسی باشندے کی جان نہیں لے گی، بلکہ یہ بھی شامل ہے کہ ہر طرح کے تشدد اور جھگڑے، جس سے کسی کی جان جانے کا خدشہ ہو، کو ختم کرے گی، اور اس کے ساتھ ساتھ بیماریوں اور آفات سے بچاؤ کی تدبیر بھی کرے گی تاکہ تمام باشندوں کی جان محفوظ رہ سکے۔[8] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جینے کے حق کے لیے اگر بین الاقوامی انسانی امداد کی ضرورت پڑے تو ریاستوں کو اسے سہولت فراہم کرنا ضروری ہوگا[9] تاکہ شہریوں کے جینے اور ضروری خوراک کے حقوق محفوظ رہیں۔ مزید یہ کہ اقتصادی، ثقافتی اور سماجی حقوق سے متعلق کمیٹی نے اپنی تجاویز میں مزید صراحت کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ ''خوراک کا حق'' سے متعلق ریاست کی ذمہ داری بنتی ہے کہ ریاست کے کسی حصے میں بھی بھوک موجود نہ ہو۔ اگر کہیں پر بھی لوگ بھوک میں مبتلا ہوں اور انھیں خوراک میسر نہ ہو تو یہ ''خوراک کے بنیادی حق'' کی خلاف ورزی ہوگی؛[10] لہٰذا حالتِ جنگ میں یا کسی بھی حالت میں کوئی ایسی پابندی عائد کرنا جس سے لوگوں کو خوراک کی صورت میں امداد کے حصول میں رکاوٹ ہو تو یہ اس بنیادی حق کی خلاف ورزی کہلائے گی۔[11] یہ تو چند مثالیں ہیں، ورنہ اگر تمام حقوق اور ان کی متعلقہ کمیٹیوں کی سفارشات کا جائزہ لیا جائے تو بآسانی اس امر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ریاست کی ذمہ داری میں ان حقوق کی فراہمی کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی امداد کا بندوبست کرنا بھی شامل ہے۔ اگر اس کے اپنے وسائل ان حقوق کے لیے کافی نہ ہوں تو بین الاقوامی سطح پر امداد کس سے کس قدر لی جانی چاہیے اور اس کو کس طرح سے منظم کرنا چاہیے؟ ان تمام امور میں ریاست کی

---

[8] Human Rights Committee General Comment No. 6, The right to life (Article 6), 1982, para 5, accessed October 18, 2021, https://www.globalhealthrights.org/wpcontent/uploads/2013/10/HRC-General-Comment-No.-6-Article-6-Right-to-Life.pdf.

[9] Ibid.

[10] Committee on Social, Economic and Cultural Rights, General Comment No. 12, The right to adequate food (1999), paras 6 and 17, accessed October 18, 2021, https://www.refworld.org/pdfid/4538838c11.pdf.

[11] Ibid., para. 19.

خود مختاری مسلم ہے۔

ب۔بنیادی انسانی حقوق کے قانون کی طرح بین الا قوامی انسانی قوانین میں بھی انسانی امداد سے متعلق ہدایات اور ریاستوں کی ذمہ داریوں کا ذکر موجود ہے۔ان متعلقہ دفعات کی درست تفہیم کے لیےان کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور ہر حصے کو ہم ایک علیحدہ اصول کے طور پر ذکر کریں گے۔

## اوّل:انسانیت کا اصول

اس اصول کے مطابق تصادم کے کسی فریق کو ہر اس تباہ کاری، قتل، زخمی کر دینے اور نقصان دینے سے احتراز لازمی ہے جس کا جنگی مقصد کے حصول سے کوئی واسطہ نہ ہو۔[12] جن لوگوں کو بین الا قوامی انسانی قوانین کے تحت جنگی اثرات سے تحفظ حاصل ہےان کے ساتھ تصادم میں شامل تمام فریق ریاستیں انسانیت کا برتاؤ کریں گی، ان پر ظلم یا تشدد کرنے کی اجازت نہیں،[13] نیز ایسے لوگ تحفظ اور امداد فراہم کرنے والی کسی تنظیم کو تحفظ اور امداد کے لیے درخواست دے سکتے ہیں، اور ریاست و حکومت کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ ایسی تنظیموں کو سیکیورٹی امور کو مد نظر رکھ کر امداد کی فراہمی کی خاطر ہر طرح کی سہولت مہیا کریں۔[14] اگر ان لوگوں کی جانب سے درخواست نہ کی گئی ہو یا وہ ایسی تنظیموں کے نمائندگان سے رابطہ نہ کر پاتے ہوں اور انھیں اس امداد کی ضرورت ہو تو ریاست خود امداد بہم پہنچانے یا کسی انسانی امداد کے لیے قائم تنظیم کی جانب سے امداد پہنچانے کا بندوبست کرے گی۔[15] انسانیت کے اصول کو بین الا قوامی انسانی امداد کے جواز کے لیے ایک اہم بنیاد

---

[12] جنیوا معاہدہ چہارم، دفعہ ۳

[13] جنیوا معاہدہ چہارم، دفعہ ۲۷

[14] جنیوا معاہدہ چہارم، دفعہ ۳۰

[15] جنیوا معاہدہ چہارم، دفعہ ۵۹۔ بین الا قوامی عدالت برائے انصاف نے بھی اپنے ایک فیصلے میں ریلیف کے لیے کام کرنے والی تنظیموں کی جانب سے کسی ریاست میں ریلیف پہنچانے کی خاطر داخلے کو غیر قانون دخل اندازی نہیں قرار دیا۔ ملاحظہ ہو: *Nicaragua v. U.S.A* International Court of Justice 1986

کی حیثیت حاصل ہے۔[16]

## دوم: غیر جانب داری کا اصول

تصادم کے دوران بین الاقوامی انسانی امداد بہم پہنچانے کے لیے دوسرا بڑا اصول غیر جانب داری کا اصول ہے۔اس اصول کے مطابق امداد مہیا کرنے والی تنظیمیں یا دیگر افراد غیر جانب دار ہو کر امداد بہم پہنچائیں گے۔ جہاں، جتنی اور جس قدر جلدی امداد کی ضرورت ہو گی صرف انہی اصولوں کے مطابق امداد بہم پہنچائیں گے۔[17] ان تنظیموں کے ساتھ ساتھ افراد بھی اپنے بساط کے مطابق ضرورت مندوں کو امداد مہیا کر سکتے ہیں۔[18] نیز امداد کی فراہمی کی ذمہ داری صرف اس ریاست کی ذمہ داری نہیں جہاں تصادم برپا ہے بلکہ ہمسایہ ممالک، جہاں اس طرح کی امداد کی گزرگاہیں ہوں ،ان کی بھی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ بھی امداد بہم پہنچانے میں مدد کریں۔[19]

## سوم: ریاستی خود مختاری کا اصول

بین الاقوامی انسانی امداد جن تین اصولوں کے ضمن میں ہے ان میں تیسرا اصول ''ریاستی خود مختاری کا اصول'' ہے۔اس کے مطابق تمام تنظیموں کو متاثرین تک امداد پہنچانے کے لیے ریاست سے اجازت لینا ہو گی اور ریاست کے قوانین کا احترام کرنا ہو گا۔ ریاست کی مرضی کے بغیر تنظیموں کو امداد کی فراہمی کا اختیار حاصل نہیں۔[20] تاہم اگر ریاست اجازت نہ دیتی ہو اور صورتِ حال ایسی ہو

---

[16] Larissa Fast, "Unpacking the principle of humanity: Tensions and implications," *International Review of the Red Cross* Vol. 97, Issues 897-898 (2015): 111–131.

[17] پہلا اضافی ملحق، دفعہ ۷۰؛ اور دوسرا اضافی ملحق، دفعہ ۱۸

[18] دوسرا اضافی ملحق، دفعہ ۱۸

[19] جنیوا معاہدہ چہارم، دفعہ ۲۳؛ پہلا اضافی ملحق، دفعہ ۷۰۔اے، اور دفعہ ۸۱؛ اور

Jean-Marie Henckaerts and Louise Doswald-Beck, *Customary International Humanitarian Law, Rules,* (Cambridge: Cambridge University Book Press - ICRC, 2005), 1: 198-199.

[20] جینیوا معاہدہ چہارم، دفعہ ۲۳؛ پہلا اضافی ملحق، دفعہ ۷۰۔اے، اور دفعہ ۸۱

کہ امداد کی عدم فراہمی سے خوراک کی قلت کا خطرہ ہو تو ایسی صورت میں سمجھا جائے گا کہ ریاست کے پاس انکار کے لیے کوئی معقول قانونی بنیاد نہیں۔[21] لہذا پہلے اور دوسرے اصول پر عمل ہی تیسرے اصول کی پاسداری کو ممکن بنائے گا اور تنظیمیں ریاست کی مرضی اور سہولیات کے بغیر اپنی مدد آپ کے تحت متاثرین کو امداد بہم پہنچائیں گی۔ اس سے ریاست کی[22] یہی ذمہ داری سامنے آتی ہے کہ وہ ممکن حد تک تنظیموں کو امداد کی فراہمی کے لیے سہولیات فراہم کرے، ہاں اپنی قومی سلامتی کی خاطر ریاست کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنی تشفی ضرور کرے۔[23] اسی طرح ایک ریاست کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ وہ دیکھے کہ کیا یہ تنظیمیں ریاست کے نظریے یا مفادات سے متصادم کسی سرگرمی میں تو مصروف نہیں ہیں۔

الغرض بین الاقوامی قوانین اگرچہ متاثرین کے حقوق کے لیے قواعد طے کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ریاستی خود مختاری اور سلامتی کے بارے میں خدشات کو بھی یکسر نظرانداز نہیں کرتے۔ اس لیے تصادم کے وقت انسانی تعاون کے لیے قائم تنظیمیں اس دوہری مشکل کا سامنا کرتی ہیں۔ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ ایسے حالات میں امداد اور تعاون کے نام پر ریاستی خود مختاری کا اصول نہیں توڑنا چاہیے۔[24]

تمام تنظیموں کو امداد اور تعاون بہم پہنچانے سے قبل ریاستی خود مختاری کے اصول کا خیال

---

[21] پہلا اضافی ملحق، دفعہ ۵۴(۱)؛ اور دوسرا اضافی ملحق، دفعہ ۱۴

[22] Jérémie Labbé and Pascal Daudin, "Applying the humanitarian principles: Reflecting on the experience of the International Committee of the Red Cross," *International Review of the Red Cross* Vol. 97, Issues 897-898 (2005): 183-210.

[23] پہلا اضافی ملحق، دفعہ ۸۱(۱) و (۳)۔

[24] Erwin Biersteker, Julie Ferguson, Peter Groenewegen, and Kees Boersma, "Humanitarian support in a denial of access context: Emergent strategies at interface of humanitarian and sovereign law," *Biersteker et al. Journal of Humanitarian Action*, Vol. 6, No.14 (2021): 3.

رکھتے ہوئے متعلقہ ریاست و حکومت کی مرضی اور اجازت حاصل کرنا ہو گی اور یہ ریاست کا حق ہو گا کہ امداد اور تعاون کی ماہیت اور طریقہ کار کے بارے میں تفصیلات معلوم کرنے کے بعد اجازت دے۔ جب ریاست مطمئن ہو جائے کہ امداد اور تعاون غیر جانبدارانہ طریقے سے محض ضرورت کے بقدر اور ضرورت کی شدت کو دیکھتے ہوئے ہی پہنچایا جائے گا تو وہ اجازت دینے کی پابند ہو جاتی ہے۔[۲۵]

تاہم بین الاقوامی قانون کی ایسی تعبیر جس میں ریاست کی خود مختاری کے اصول پر زیادہ توجہ مرکوز کی جائے، اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ریاست بنیادی حقوق کے حوالے سے اپنی ذمہ داریوں کا بھرپور خیال رکھے، اور اس ذمہ داری کو نہ نبھا سکنے کی صورت میں تنظیموں کو امداد کے لیے کام کرنے کی اجازت دے۔[۲۶]

## حصہ دوم

# اسلامی قانون کی روشنی میں ممکنہ حل اور تجاویز

انسانی حقوق کے قانون اور بین الاقوامی قانون انسانیت کی روشنی میں مسئلہ کی قانونی نوعیت سامنے آنے کے بعد اب اس دوسرے حصے میں اسلامی قانون کی روشنی میں غور و فکر کیا جائے گا۔ قرآن و سنت کی متعلقہ نصوص اور فقہی واصولی قواعد کی روشنی میں اس مسئلے پر غور و خوض کے دوران کئی اصول سامنے آتے ہیں۔ زیر نظر سطور میں ان اصولوں کا مختصر جائزہ اور زیر بحث مسئلے کے پہلوؤں پر اس کی تطبیق کی کوشش کی جائے گی۔

---

[25] Dapo Akande and Emanuela-Chiara Gillard, "Arbitrary Withholding of Consent to Humanitarian Relief Operations in Armed Conflict," OCHA, August 2014, https://www.unocha.org/sites/unocha/files/dms/Documnts/Arbitrary%20Withholding%20of%20Consent.pdf.

[26] Jacob D. Kurtzer, *Tackling Access Challenges in an Evolving Humanitarian Landscape* (USA: Center for Strategic & International Studies-CSIS, 2019): 7.

## غیر مقاتلین کی جان کا تحفظ

جنگ کے دوران غیر مقاتلین کو نشانہ نہ بنانے کی ہدایات متعدد بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوئی ہیں۔ نیز قرآنِ کریم نے بھی اس ضمن میں بنیادی اصول کی جانب جامع اشارے کیے ہیں۔ ان تمام اصولوں کا مطالعہ کر کے ایک ایسا فقہی و اصولی بیانیہ ترتیب دیا گیا ہے جس کی مدد سے کسی بھی پیچیدہ صورتِ حال کا شرعی لحاظ سے جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا[27]

''اور ان لوگوں سے اللہ کے راستے میں جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں، اور زیادتی نہ کرو''۔

وَلَا تَعْتَدُوا کی تفسیر میں امام جصاصؒ نے لکھا ہے کہ اس سے مراد غیر مقاتلین کا لحاظ کرنا ہے۔[28] معروف مالکی فقیہ قاضی ابن العربیؒ نے لکھا ہے کہ اس میں چھ طرح کے لوگ شامل ہیں۔ اول: خواتین؛ دوم: بچے؛ سوم: عبادت گذار؛ چہارم: معذور؛ پنجم: بوڑھے؛ ششم: مزدور افراد۔[29]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

وَلَا تَعْتَدُوا اَغْزُو بِاسْمِ اللَّهِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ، قَاتِلُوا مَنْ كَفَرَ بِاللَّهِ، اغْزُوا وَلَا تَغُلُّوا، وَلَا تَغْدِرُوا، وَلَا تَمْثُلُوا، وَلَا تَقْتُلُوا وَلِيدًا[30]

---

[27] البقرۃ: ۱۹۰

[28] ابو بکر احمد بن علی الرازی الجصاص، احکام القرآن (بیروت: دار الکتب العلمیہ، ۲۰۰۷)، ۱: ۳۱۳۔

[29] ابو بکر محمد بن عبداللہ المعروف ابن العربی، احکام القرآن (بیروت: دار الکتاب العربی، ۲۰۱۰)، ۱: ۱۳۶-۱۳۹۔ یہاں ابن العربی نے ان چھ طرح کے لوگوں کا ذکر کر کے اس پہلو پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے کہ اگر ان لوگوں کی جانب سے مسلمانوں کو اذیت کا امکان ہو یا کسی بھی طرح سے مسلمانوں کے خلاف جنگ میں شرکت کر رہے ہوں تو انھیں قتل کیا جاسکتا ہے۔

[30] مسلم بن الحجاج القشیری، صحیح مسلم، کتاب الجهاد: بَابُ تَأْمِيرِ الْإِمَامِ الْأُمَرَاءَ عَلَى الْبُعُوثِ، وَوَصِيَّتِهِ إِيَّاهُمْ بِآدَابِ الْغَزْوِ وَغَيْرِهَا، حدیث ۳

"اللہ تعالی کا انکار کرنے والوں سے لڑو، خیانت نہ کرنا، عہد شکنی نہ کرنا، لاشوں کی بے حرمتی نہ کرنا، اور بچوں کو قتل نہ کرنا"۔

امام سرخسی ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر ایک خاتون کی لاش کو دیکھا جسے مسلمانوں کی جانب سے قتل کیا گیا تھا تو آپ ﷺ نے اس کو ایک غیر معمولی غلطی قرار دیا اور فرمایا: هاهٖ مَا كَانَتْ هٰذِهٖ تُقَاتِل[۳۱] (افسوس! یہ عورت تو جنگ نہیں لڑ رہی تھی)۔

امام شیبانیؒ نے اپنی معرکہ آرا تصنیف کتاب السیر الکبیر میں کئی اہم قواعد ذکر کئے ہیں اور امام سرخسیؒ نے اپنی بے مثال فقہی بصیرت کے ساتھ دیگر فقہی قواعد و اصولوں کی روشنی میں ان کی جامع تشریح کی ہے۔ مثلاً ایک قاعدہ یہ ہے کہ بچے اور مجنون کو نشانہ نہیں بنایا جائے گا؛ کیوں کہ وہ مکلف نہیں ہیں۔ لہذا وہ احکام یا سزا کے مخاطب نہیں۔[۳۲] دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ صرف مسلمانوں کے خلاف جنگ میں لڑنے والوں کو ہی قتل کیا جائے گا، جو جنگ میں حصہ نہیں لیتے انھیں نشانہ بنانا جائز نہیں۔[۳۳] غیر مسلموں میں سے جو اسلام قبول کرے اسے بھی قتل نہیں کیا جائے گا؛ کیوں کہ اسلام امن دینے والا مذہب ہے۔[۳۴]

## بنیادی انسانی حقوق اور ریاست کی ذمہ داری

کسی بھی مذہب یا تہذیب میں جس بنیادی اور مقدس حق کا سوال سب سے پہلے آتا ہے وہ زندگی سے متعلق ہے۔ اسلام کی نگاہ میں ہر شہری کا سب سے اوّلین حق یہ ہے کہ اس کی جان اور ناموس محفوظ رہے۔ قرآن نے ایک انسان کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیا ہے، اور ایک انسانی جان کی

---

[۳۱] ابو بکر محمد بن احمد بن ابی سہل السرخسی، المبسوط (لبنان و کویت: دار النوادر، ۲۰۱۳)، ۱۰: ۵

[۳۲] ابو بکر محمد بن احمد بن ابی سہل السرخسی، شرح کتاب السیر الکبیر (بیروت: دار الکتب العلمیہ، ۱۹۹۷)، ۴: ۱۸۷؛ ابن العربی، أحکام القرآن ۱، ۱۳۷

[۳۳] سرخسی، شرح کتاب السیر الکبیر، ۴: ۱۹۶

[۳۴] مرجع سابق، ۳: ۱۲۶

حفاظت کو پوری انسانیت کی حفاظت کا درجہ دیا ہے۔[35] ناحق کسی غیر مسلم کا قتل بھی اتنا ہی سنگین نوعیت کا جرم ہے جتنا کسی مسلمان کا قتل۔

قرآنِ کریم نے جہاں انسانی جان کی حرمت بیان کی ہے وہاں صرف ''حق'' کا لفظ استعمال کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ''حق'' کے علاوہ ریاست اور حکمران کے لیے کسی انسان کی جان لینے کی اجازت نہیں۔ ارشاد باری تعالی ہے:

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ[36]

''اور جس جان کو اللہ نے حرمت عطا کی ہے اسے قتل نہ کرو''۔

بے شمار نصوص کی رو سے یہ بات اسلامی قانون کے طلبہ کے لیے واضح ہے کہ ریاست کو مذکورہ تین اسباب، قتلِ عمد، احصان کی حالت میں زنا اور ارتداد، کے علاوہ کسی بھی صورت میں کسی کی جان لینے کی اجازت نہیں۔ نیز مذکورہ تین صورتوں میں بھی جان لینا یا سزائے موت دینا ریاست اور ملکی قانونی نظام کے مطابق ہوگا، کسی فرد کو انفرادی حیثیت میں یہ کام سرانجام دینے کی اجازت نہیں۔ پھر جس طرح بین الاقوامی قوانین کی رو سے صرف ریاست کے لیے کسی کی جان لینے کی اجازت نہیں بلکہ ہر کسی کی جان کے تحفظ کے لیے اقدامات کرنا بھی لازمی ہیں، اسی طرح اسلامی قانون کی رو سے بھی لوگوں کی جان کے تحفظ کے لیے ہر ممکن حد تک اقدامات کرنا ضروری ہیں، کیوں کہ جان کی حفاظت شریعت کے پانچ مقاصد میں سے ہے۔ ایک جگہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ قیامت کے روز سب سے پہلے خون کا فیصلہ کیا جائے گا۔[37] دوسری جگہ ارشاد ہے کہ پوری دنیا

---

[35] المائدۃ: ۳۲

[36] الاسرا: ۳۳

[37] محمد بن إسماعيل البخاري، صحيح بخاري، کتاب الرقاق: بَابُ الْقِصَاصِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ. حديث ۱۱۲

کی تباہی اللہ تعالی کے نزدیک ایک مسلمان کے خون کے مقابلے میں ارزاں ہے۔[38] اسلام کی نظر میں انسانی جان کا احترام صرف مسلمان کے لیے نہیں، بلکہ غیر مسلموں کی جان بھی اتنی ہی محترم ہے۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

الْمُؤْمِنُ مَنْ أَمِنَهُ النَّاسُ عَلَى أَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ[39]

''مومن وہ ہے جس کے شر سے دوسرے لوگوں کے جان ومال محفوظ ہوں''۔

اس حدیث میں صرف مسلمان کی جان ومال محفوظ رہنے کی بات نہیں کی گئی بلکہ تمام لوگوں بشمول مسلم وغیر مسلم کی جان ومال محفوظ ہونا ضروری ہے۔ ایک جگہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

[40] لَنْ يَزَالَ الْمُؤْمِنُ فِي فُسْحَةٍ مِنْ دِينِهِ، مَا لَمْ يُصِبْ دَمًا حَرَامًا

''مسلمان تب تک اپنے دین میں ہے جب تک کہ وہ حرام خون نہ بہائے''۔

ایک جگہ آپ ﷺ نے فرمایا:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا مُعَاهَدًا لَمْ يَرِحْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ، وَإِنَّ رِيحَهَا لَيُوجَدُ مِنْ مَسِيرَةِ أَرْبَعِينَ عَامًا[41]

''جس نے کسی معاہد (جو مسلمانوں سے بر سرِ پیکار نہ ہو) کو قتل کیا وہ جنت کی خوشبو تک نہیں سونگھے گا، حالانکہ جنت کی خوشبو چالیس سال کے فاصلے سے محسوس کی جاسکتی ہے''۔

---

[38] أبو عيسى محمد بن عيسى بن سَوْرة الترمذي، سنن الترمذي، أبواب الديات: بَابُ مَا جَاءَ فِي تَشْدِيدِ قَتْلِ الْمُؤْمِنِ. حدیث ١٠

[39] سنن ترمذي، کتاب ٤٠، حدیث ٢٢

[40] صحیح بخاري، کتاب الديات، حدیث ٢٨٦٢

[41] صحیح بخاري، کتاب الديات: بَابُ إِثْمِ مَنْ قَتَلَ ذِمِّيًّا بِغَيْرِ جُرْمٍ، حدیث ٥٢؛ مولانا امین احسن اصلاحی، اسلامی ریاست (لاہور: دار التذکیر، ٢٠٠٦)، ص ٢٠٧ ومابعدہ؛ مولانا سید ابو الاعلی مودودی، اسلامی ریاست (لاہور: اسلامک پبلیکیشنز، سن اشاعت ندارد)، ص ٥٤٥ ومابعدہ۔

انسانی جان کی حرمت اور احترام کے پیش نظر صرف یہ کافی نہیں کہ ریاست کسی کی جان لینے سے گریز برتے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ریاست کی جانب سے ہر شہری کی جان کی حفاظت کی خاطر تمام ضروری اقدامات کیے جائیں۔

## دیگر حقوق

دیگر حقوق جن کی حفاظت ریاست کی ذمہ داری ہے ان میں مذہبی آزادی، شخصی آزادی، ذاتی ملکیت کا حق، قانونی و معاشرتی مساوات وغیرہ شامل ہیں۔ اسلامی ریاست کی ذمہ داری اس اجتماعی حق کے بدلے میں عائد کی گئی ہے جس کی رو سے ریاست ہر اس شخص کی وارث ہے جس کا کوئی وارث نہ ہو۔ لہذا میراث کے حق کے بدلے ریاست پر ہر اس شخص کی کفالت کی ذمہ داری بھی ہو گی جس کا کوئی کفیل نہ ہو۔[۴۲] علامہ ابن قیم نے اس حوالے سے لکھا ہے کہ: یہ حکم نبی اکرم ﷺ کے بعد امرا اور حکمرانوں کے لیے بھی ہے۔ لہذا حکمران ہی ان مسلمانوں کے قرضے ادا کرے گا جو وفات پا کر قرضہ جات کی ادائیگی کے لیے کوئی مال وغیرہ نہ چھوڑ کر گئے ہوں۔ حکمران ان قرضوں کی ادائیگی کا بیت المال سے اہتمام کرے گا۔ نیز حکومت جس طرح اس شخص کی وارث ہوتی ہے جس نے کوئی وارث نہ چھوڑا ہو، اسی طرح وہ اس کا قرض ادا کرنے کی بھی ذمہ دار ہے جو قرض کی ادائیگی کے لیے کوئی چیز چھوڑے بغیر مر جائے۔ نیز وہ اس کی زندگی میں اس کی کفالت کے لیے بھی ذمہ دار ہو گی جب کہ کوئی اس کی کفالت کرنے والا نہ ہو۔[۴۳]

ایک مرتبہ سیدنا عمرِ فاروقؓ بازار کی طرف نکلے۔ ایک نوجوان عورت آئی اور کہنے لگی کہ امیر المومنین میرے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے، اور اتنے چھوٹے بچے چھوڑ کر گیا ہے کہ وہ اپنا لقمہ بھی اپنے ہاتھوں سے نہیں اٹھا سکتے۔ ان کے باپ نے زمین چھوڑی ہے اور نہ کوئی مویشی۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ بچے کسمپرسی کا شکار نہ ہو جائیں۔ پھر اس عورت نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے عرض کیا کہ

---

[۴۲] ابوداود سلیمان بن الأشعث السّجستاني، سنن أبي داود، کتاب الفرائض: باب فی میراثِ ذوی الأرحام، حدیث ۱۵

[۴۳] محمد بن أبي بکر ابن قیم الجوزیة، زاد المعاد في هدي خیر العباد (بیروت: مؤسسة الرسالة، ۱۹۹۴)، ۱:۱۵۶۔

میں خفاف بن ایماء کی بیٹی ہوں۔ میرا باپ حدیبیہ کے موقع پر رسالت مآب ﷺ کے ساتھ شریک تھا۔ سیدنا عمرؓ نے اس کی بات سنی اور تعلق پر خوشی کا اظہار بھی فرمایا۔ پھر اسی موقع پر گیہوں کی چند بوریاں اونٹ پر لدوائیں، نقد رقم کے ساتھ کچھ کپڑے بھی اس پر رکھوائے اور اس اونٹ کی باگ اس خاتون کو پکڑوا کر فرمایا کہ اسے لے جاؤ اور اس کے ختم ہونے سے پہلے پہلے مزید سامان بھی آپ کے پاس پہنچ چکا ہوگا۔"[44]

مذکورہ نصوص کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شہریوں کی جان و مال کی حفاظت ریاست کی ذمہ داری ہے۔ ذاتی ملکیت کے تحفظ کے ساتھ ساتھ ناقابل ادا قرضوں کی ادائیگی تک بھی ریاست کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ ان تمام ذمہ داریوں کو ریاست حالتِ امن و جنگ دونوں میں یکساں طور پر نبھائے گی۔ اور جب بھی کسی ایسی صورتِ حال کا سامنا ہو کہ ریاست خود یہ ذمہ داری نہ نبھا پائے اور دوسری تنظیموں، افراد یا ریاستوں کی جانب سے پیشکش آئے کہ متاثرینِ جنگ کے ان بنیادی حقوق کا تحفظ کیا جائے اور اس پیشکش میں قومی سلامتی کے پیشِ نظر ریاست کے لیے خطرہ بھی نہ ہو تو ریاست کو ایسی پیشکش ٹھکرانی نہیں چاہیے۔ بلکہ اس سے فائدہ اٹھانا ایسا ہی ضروری ہے جس طرح خود اس ریاست کے لیے ان فرائض و واجبات کی تکمیل لازمی ہے۔

## تیسرا حصہ

## انسانی تعاون کا فریضہ: فقہی و اصولی قواعد کا جائزہ

شریعت کے تمام احکام مصلحتوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ لہٰذا مصلحت سے متعلق قواعد کی روشنی میں ریاستی قوانین کی پاسداری کا فرض اور انسانی تعاون فراہم کرنے کے فرض کو دیکھا جائے گا۔ ذیل میں چند معروف فقہی و اصولی قواعد کو ذکر کیا جاتا ہے جن کا ترجمہ اور مختصر وضاحت پیش کرنے کے بعد مسئلہ زیرِ بحث کے کسی ایک پہلو سے متعلق انھی قواعد پر مبنی ایک بیانیہ مرتب کیا جائے گا۔

---

[44] صحیح بخاري، کتاب المغازي: باب غزوۃ الحدیبیۃ.

- مَالَا یَتِمُّ الْوَاجِبُ اِلَّا بِہٖ فَھُوَ وَاجِبٌ[45] ایک واجب کی ادائیگی جس چیز پر منحصر ہو وہ چیز بھی واجب ہو جاتی ہے۔ مثلاً مسئلہ زیرِ بحث میں ریاست کے باشندوں کو تحفظ فراہم کرنا ریاست کی ذمہ داری ہے۔ اب اگر یہ ذمہ داری دیگر افراد، تنظیموں یا ریاستوں کی مدد کے بغیر ممکن نہ ہو تو ریاست پر لازم ہے کہ ان افراد، تنظیموں یا ریاستوں کی مدد حاصل کرے، اگر کوئی شرعی عذر مانع نہ ہو۔

- تَصَرُّفُ الْاِمَامِ عَلَى الرَّعِیَّۃِ منوط بِالْمَصْلِحَۃ[46] اپنی رعایا پر حاکم کا تصرف مصلحت پر مبنی ہے۔ حکمران کی اطاعت قرآنی تعلیمات کی روشنی میں واجب ہے۔[47] تاہم ایک شرط تو یہ ہے کہ حاکم کا حکم مباحات سے تعلق رکھتا ہو، دوسرا یہ کہ نص سے متصادم نہ ہو، تیسرا یہ کہ اس حکم پر عمل سے کسی دوسرے شخص پر ظلم لازم نہ آتا ہو، اور چوتھا، جس کا ذکر اس قاعدے میں بھی ہے، یہ کہ وہ حکم مصلحت کے مطابق ہو۔[48]

اس قاعدے کی حکمت پر روشنی ڈالتے ہوئے مصطفی الزرقا لکھتے ہیں: حکمران اور اس کے ماتحت دیگر سرکاری افسران کا تقرر محض اپنی ذات کے لیے نہیں ہوتا، بلکہ عوام کی بھلائی کے لیے ہی ہوتا ہے۔ اس لئے ان سے امید یہی ہے کہ وہ عدل کریں گے، ظلم کا راستہ روکیں گے، امن عامہ اور لوگوں کے حقوق کا تحفظ یقینی بنائیں گے، معاشرے سے ہر نوع کا فساد اور بدامنی ختم کریں گے۔ نیز حال اور مستقبل دونوں میں امت کی بھلائی کے لیے تمام تر وسائل بروئے کار لا کر کام کریں

---

[45] اس قاعدے کی تفصیلات اور متعلقہ دیگر تفریعات کے لیے ملاحظہ ہو: محمد صدقی بورنو، الوجیز في إیضاح القواعد الکلیۃ (بیروت: مؤسسۃ الرسالہ، ۱۹۹۶)، ص ۳۹۵-۳۹۳۔

[46] مفتی شاد محمد شاد، فقہی قواعد کا تحقیقی مطالعہ (صوابی: دار الصدیق، ۲۰۲۰)، ص ۵۶۶۔

[47] النساء: ۵۹

[48] مفتی تقی عثمانی، اسلام اور جدید معاشی مسائل (لاہور: ادارہ اسلامیات، ۲۰۰۸)، ۸: ۳۱۔

گے،اوراسی کو ''مصلحت عامہ'' کہا جاتا ہے۔[۴۹]

اس قاعدے کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ اگر ریاستی قوانین اور فیصلے انسانی امداد پہنچانے میں رکاوٹ کا باعث ہوں تو دیکھا جائے گا کہ اس فیصلے یا قانون میں عوام کی کون سی مصلحت ملحوظ ہے۔ اگر کوئی مصلحت نہ ہو اور یہ انسانی امداد پہنچنے میں رکاوٹ ہو تو اس قانون کی پاسداری لازم نہیں۔

شرعی احکام پر عمل کے وقت مصالح اور مفاسد کا اگر تعارض آجائے تو کیا کیا جائے گا؟ یعنی اگر کسی حکم پر عمل کی صورت میں مصلحت کے حصول کے ساتھ ضرر بھی لازم آتا ہو، تو کیا ایسی مصلحت کا حصول لازم ہو گا؟ اس سے متعلق کئی فقہی قواعد ہیں جو اس سوال کا جواب دیتے ہیں:

دَرْءِ مَفَاسِد مُقَدَّمٌ عَلی جَلْبِ الْمَصَالِح[۵۰] مفاسد کا ازالہ اور مصالح و منافع کا حصول شریعت کے اہم مقاصد میں شامل ہے۔ لیکن اگر کہیں مصلحت و ضرر میں تعارض آجائے، یعنی اگر مصلحت کے حصول کی کوشش کی جائے تو ضرر بھی ساتھ لازم آتا ہو، اور ایسا ممکن نہ ہو کہ مصلحت کا حصول بھی ہو اور ضرر کا ازالہ بھی ہو جائے۔ اسی طرح ضرر غالب بھی ہو یا مصلحت و ضرر برابر ہوں تو اس صورت میں کیا کیا جائے گا؟ مذکورہ قاعدے کے مطابق ضرر سے بچنے کو مصلحت و منفعت کے حصول پر ترجیح دی جائے گی۔ اس قاعدے اور اس کے اطلاقات کو دیکھ کر مسئلہ زیر بحث سے متعلق ریاست اگر اپنی خود مختاری کو یقینی بنانے پر مصر رہے اور بیرونی افراد یا تنظیموں کو امداد بہم پہنچانے کی اجازت نہ دے تو اس سے باشندوں کو ان کی زندگی اور دیگر بنیادی حقوق کے حوالے سے ضرر لاحق ہو گا؛ اس لئے اس ضرر کا ازالہ ضروری ہے، اگرچہ خود مختاری کے اصول پر مکمل عمل نہ ہو پائے۔ لہٰذا عوام کو لاحق ضرر کے ازالے کی خاطر ریاست کے لیے امداد مہیا کرنے

[۴۹] مصطفی الزرقاء، المدخل الفقهي العام (بیروت: دار القلم، ۲۰۱۲)، ص ۱۰۵۰۔

[۵۰] محمد صدقي بن أحمد بن محمد آل بورنو، موسوعة القواعد الفقهية (بیروت: مؤسسة الرسالة، الطبعة: الأولی، ۱۴۲۴ھ-۲۰۰۳م)، ۴: ۳۱۵ اور مفتی شاد محمد شاد، فقہی قواعد کا تحقیقی مطالعہ، ص ۳۷۷ و ما بعدہ۔

کے لیے سہولیات فراہم کرنا ایک شرعی ذمہ داری ہوگی۔

## مصلحت کے حصول سے متعلق قواعد

جب یہ متعین ہو گیا کہ فقہی و شرعی احکام مصالح کے حصول کے لیے دیے جاتے ہیں۔ اگر مصلحت اور ضرر میں تعارض آئے تو ضرر کا ازالہ پہلے کیا جائے گا۔اس کے بعد اگلا مرحلہ آتا ہے کہ مصلحت کے حصول کا کیا طریقہ کار ہوگا؟اس بارے میں فقہی قواعد کیا رہنمائی فراہم کرتے ہیں؟ ذیل میں چند ایسے قواعد کا ذکر کیا جاتا ہے:

۲۔اَلْمَوَازَنَةُ بَيْنَ الْمَصَالِحِ إذ انَّهَا لَيْسَت فِي رتْبَة وَّاحِدَة مقاصد و مصالح کا حصول بلا شبہ شرعی ذمہ داری ہے۔تاہم مصالح کے مختلف درجات ہیں۔کسی بھی شرعی حکم کو دیکھ کر اس میں پنہاں مصلحت اور اس کے ساتھ ساتھ مختلف پہلوؤں کو بھی دیکھنا ضروری ہے کہ کس پہلو پر عمل کی صورت میں کون سی مصلحت اور کس درجے کی مصلحت کا حصول ممکن ہوگا۔[۵۱] علامہ عزالدین بن عبد العزیز بن عبد السلام نے اپنی مشہور کتاب قَوَاعِدُ الْأَحْكَامِ فِي مَصَالِحِ الْأَنَامِ میں اس پہلو پر سیر حاصل گفتگو کی ہے،اور واضح کیا ہے کہ مصالح و مفاسد کے مختلف درجات ہیں،اور اسی اعتبار سے اجر و ثواب یا سزا کا مستحق ہوا جاتا ہے۔[۵۲]

- تَقَدّمِ الْمَصْلِحَة المتيقنة عَلَى الْمَصْلِحَةِ الْمَظْنُوْنَةِ اَوِالْموْهُوْته[۵۳] مقاصد و مصالح

---

[۵۱] مقاصد شریعت کے اس پہلو پر غور و خوض ایک مستقل علم ''فقہ الأولویات'' کی شکل میں سامنے آیا ہے جس پر کئی نامور اہل علم و قلم نے لکھا ہے۔ مثلا ملاحظہ ہو: ڈاکٹر یوسف القرضاوی، فقہ الأولویات دراسة جديدة في ضوء القرآن والسنة (قاہرہ: مکتبہ وھبہ، طبع دوم، ۱۹۹۶)؛ عبد السلام عبادہ علی الکربولی، فقہ الأولویات في ظلال مقاصد الشريعة الإسلامية (دمشق: دار طیبہ، ۲۰۰۸)۔

[۵۲] سلطان العلماء العز بن عبد العزیز بن عبد السلام، قواعد الأحكام في مصالح الأنام (بیروت: دار الکتب العلمیہ، ۱۹۹۱)، ۱: ۲۲و۲۹۔

[۵۳] یوسف القرضاوی، فقہ الأولویات، ص ۲۸۔

کے حصول کے دوران اس بات کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ اگر کہیں دو مختلف احکامات کا امکان ہو اور دونوں میں مقاصد کا حصول ممکن ہو، تو جس پہلو میں مصلحت کا حصول یقینی ہو اسی حکم پر عمل کیا جائے گا۔ اور اس کے مقابلے میں جو مصلحت ظنی ہے، اس کے حصول یا حاصل نہ ہونے کے امکانات برابر ہوں تو اس پر عمل نہیں کیا جائے گا۔

- **تقدّم الْمَصْلِحَة الْكَبِيرَة عَلَى الْمَصْلِحَةِ الصَّغِيْرَةِ**[54] اسی طرح جہاں دو ممکن مصالح میں سے کوئی مصلحت بڑی ہو تو چھوٹی مصلحت والے حکم کے مقابلے میں بڑی مصلحت والے حکم پر عمل کیا جائے گا۔
- **تُقَدَّمُ الْمَصْلِحَةُ الْجَمَاعَةُ على الْمَصْلِحَةِ الْمُفْرَدِ**[55] دو یا کئی ممکنہ مصالح میں اسی مصلحت والے حکم پر عمل کیا جائے گا جو عمومی نوعیت کی ہو اور جس سے زیادہ لوگوں کو فائدہ ہو رہا ہو۔ کسی فرد یا مخصوص طبقے تک محدود مصلحت والے حکم کو چھوڑ دیا جائے گا۔

**تَقَدّم الْمَصْلحَة الدَّائِمَة عَلَى الْمَصْلحَةِ الْعَارِضَةِ**[56]- **تَقَدّم الْمَصْلِحَة الْمُسْتَقبلِيّة الْقَوِيَّة عَلَى الْمَصْلَحَةِ الْآنِيَةِ الضَّعِيفَةِ**[57] جس حکم پر عمل میں وہ مصلحت حاصل ہوتی ہو جو دائمی اور مستقل نوعیت کی ہو تو اسی حکم پر عمل کیا جائے گا۔ برخلاف اس حکم کے جس پر عمل سے وقتی اور عارضی مصلحت حاصل ہوتی ہو۔

## ضرر کے ازالے سے متعلق قواعد

۳۔ **اَلْمَوَازَنَةُ بَيْنَ الْمَصَالِحِ إِذَا أَنَّهَا لَيْسَت فِي رَتْبَة وَّاحِدَة** مصالح و منافع کی طرح جن مفاسد کے ازالے کے لیے شریعت جو احکام دیتی ہے وہ مفاسد بھی مختلف نوعیت اور درجات کے ہوتے

---

[54] مرجع سابق۔

[55] مرجع سابق۔

[56] مرجع سابق۔

[57] مرجع سابق۔

ہیں۔ لہٰذا ایسے کسی حکم پر عمل کرتے وقت اس پہلو پر بھی غور کرنا ضروری ہوگا کہ کہاں، کس نوعیت اور کس درجے کے ضرر کا ازالہ ہو رہا ہے تاکہ متعلقہ فقہی قواعد پر عمل کیا جائے اور شریعت کے مقاصد کا حصول ممکن ہو سکے۔

- الضَّرر یدْفع بقَدرِ الْاِمْکَان[58] اس قاعدے کے مطابق شرعی احکام کے مطابق ضرر کو واقع ہونے سے پہلے حتی الامکان روک دیا جائے گا کیوں کہ ضرر ظلم ہے اور ظلم کا راستہ شریعت میں بند ہے۔ کسی ایسے حکم پر عمل کی شریعت میں ہدایت کبھی بھی نہیں دی جاتی جس سے کسی کو ضرر پہنچے۔
- الضَّرَرُ یُزَالُ[59] اس قاعدے کے مطابق اگر کسی کو ضرر پہنچ گیا ہو تو اس کو باقی نہیں رہنے دیا جائے گا بلکہ اس کا مقدور بھر ازالہ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔
- یُتَحَمَّلُ الضَّرَرُ الْخَاصِ لِدَفْعِ الضَّرَرِ الْعَامِ[60] چنانچہ اگر ایک ضرر کو وقوع سے پہلے یا وقوع کے بعد اس کے ازالے کے دوران کوئی دوسرا ضرر لازم آئے، تو دیکھا جائے گا کہ ان دونوں میں کون سا ضرر ایسا ہے جس سے محض ایک ہی فرد یا کم سے کم لوگ متاثر ہو رہے ہیں اسی کو برداشت کیا جائے گا اور جس ضرر سے زیادہ تعداد میں لوگ متاثر ہوں اس کو ختم کرنے یا روکنے کے لیے کوشش کی جائے گی۔
- الضَّرَرُ الْاَشَدّ یُزَالُ بِالضَّرَرِ الْاَخفِّ[61]-یُخْتَارُ أَھْوَنُ الشَّرَّیْنِ[62]-اِذَا تَعَارَضَ مُفْسِدَتَانِ رُوْعِیَ اَعْظَمُھُمَا ضَرَرًا بِاِرْتِکَابِ أَخَفِّھُمَا[63] اسی طرح یہ بھی دیکھنا ضروری

[58] مرجع سابق، ص ۳۹۲۔

[59] مفتی شاد محمد شاد، فقہی قواعد کا تحقیقی مطالعہ، ص ۳۲۲۔

[60] مرجع سابق، ص ۳۶۳۔

[61] مرجع سابق، ص ۳۶۶۔

[62] مرجع سابق، ص ۳۷۵۔

[63] مرجع سابق، ص ۳۷۹۔

ہے کہ کون ساضرر نوعیت میں زیادہ ہے یا کون سانقصان زیادہ متاثر کن ہے۔اسی سے بچنے کے لیے اقدامات کیے جائیں گے۔اس دوران اس نوعیت کے نقصان یاضرر کو برداشت کیا جائے گا جو کم متاثر کن ہو۔اور کوشش کی جائے گی کہ بڑے ضرر کے ازالے کے مقابلے میں ممکن حد تک کم از کم ضرر کو برداشت کیا جائے۔[۶۴]

## فقہی قواعد کا حاصل

ان قواعد کو مد نظر رکھ کر ریاست کی کیا حکمت عملی ہونی چاہئے؟ اسے امداد بہم پہنچانے کے لیے تنظیموں اور افراد کو کام کرنے کی اجازت دینی چاہئے یا نہیں؟ دونوں صورتوں میں ممکنہ مصالح ومنافع یا نقصانات کا جائزہ لینے کے بعد یہی صورت سامنے آتی ہے کہ متعلقہ تنظیم اسلام یا مسلمانوں کے خلاف کسی سرگرمی میں ملوث نہ ہو تو انسانی تعاون مہیا کرنے کے لیے اجازت نہ دینے سے عام باشندوں کے بنیادی حقوق متاثر ہوں گے۔ مثلاً درکار علاج اور ادویات یا مناسب خوراک نہ ملنے کی صورت میں بہت سوں کی جان چلے جانے یا شدید بیماری میں مبتلا ہونے کے خدشات یقینی ہوتے ہیں، یہ ضرر جہاں بڑااور عمومی نوعیت کا ہے وہاں یقینی بھی ہے، جب کہ سیکیورٹی کے نام پر پبلک سیفٹی کا فائدہ یقینی نہیں۔اسی طرح اجازت دینے کی صورت میں لوگوں کی جان محفوظ ہونے اور دیگر بنیادی حقوق کے تحفظ کی مصلحت یقینی ہے۔ نیز یہ مصلحت عمومی نوعیت کی ہے اور شریعت کی دیگر نصوص کی بنیاد پر اس کا لزوم بھی زیادہ ہے۔اس لئے ریاستوں کے لیے ضروری ہے کہ ریاستی قوانین اور پالیسیوں کے نام پر بیرونی تنظیموں اور افراد کو انسانی تعاون کے لیے کام کرنے کی نہ صرف اجازت دیں بلکہ انھیں ہر طرح کی سہولیات بھی فراہم کریں۔ کیونکہ شہریوں کی جان ومال کی حفاظت ریاست اور حکومت کی اولین ذمہ داری ہے۔اس فرض کو نبھانے میں عمومی نوعیت کی مصلحت ہے جب کہ اجازت نہ دینے یا سہولیات فراہم نہ کرنے کی صورت میں ان کی جانوں کو ضرر

---

[۶۴] سراج الدين أبو حفص عمر بن علي الأنصاري المعروف ابن الملقن، قواعد ابن الملقن أو الأشباه والنظائر في قواعد الفقه (الرياض: الرياض، تحقيق ودراسة: مصطفى محمود الأزهري، الطبعة: الأولى، ۱۴۳۱ھ-۲۰۱۰م)، ۱: ۳۰۔

لاحق ہوگا جس کا ازالہ ضروری ہے۔ نیز اس ضرر کے مقابلے میں انسانی امداد پہنچانے میں جو مصلحت حاصل ہوگی وہ یقینی بھی ہے۔

## خلاصہ

بین الاقوامی قوانین کے مختلف اصول و قواعد کی مطابق ریاستوں کو تصادم کے دوران اور حالتِ امن میں بھی ''بین الاقوامی انسانی امداد'' کے لیے قائم تنظیموں کو امداد پہنچانے دینا چاہئے۔ البتہ سیکیورٹی خدشات اور امداد کو منصفانہ انداز میں رکھنے کے لیے متعلقہ ریاست کی مرضی اور اجازت کا حصول بھی ضروری ہے۔ تاہم ریاست کے پاس یہ حق ہر گز نہیں کہ وہ ایسی تنظیموں کو بلا کسی معقول وجہ کے روکے رکھے اور انھیں محتاج باشندوں کو امداد پہنچانے نہ دی جائے۔ اسی طرح شرعی نقطۂ نظر سے اگر متعلقہ فقہی اصولوں اور قواعد کا جائزہ لیا جائے تو اجازت دینے اور نہ دینے، دونوں صورتوں میں ممکنہ مصالح و منافع یا نقصانات کا جائزہ لینے کے بعد یہی صورت سامنے آتی ہے کہ اجازت نہ دینے میں باشندوں کے بنیادی حقوق متاثر ہوں گے۔ درکار علاج اور ادویات نہ ملنے یا پھر مناسب خوراک نہ ملنے کی صورت میں بہت سوں کی جان جانے یا شدید بیماری میں مبتلا ہونے کے خدشات یقینی ہیں، جب کہ سیکیورٹی کے نام پر پبلک سیفٹی کا فائدہ یقینی نہیں۔ اسی طرح اجازت دینے کی صورت میں لوگوں کی جان محفوظ ہونے اور دیگر بنیادی حقوق کے تحفظ کی مصلحت بڑی اور یقینی ہے۔ اس لئے ریاستوں کو ریاستی قوانین اور پالیسیوں کے نام پر بیرونی تنظیموں اور افراد کو انسانی تعاون کے لیے کام کرنے کی نہ صرف اجازت دینی چاہئے بلکہ انھیں ہر طرح کی سہولیات بھی فراہم کرنی چاہئے۔ تاہم جہاں قومی سلامتی کے منافی سرگرمیوں کے شواہد موجود ہوں وہاں شفاف طریقِ کار کے مطابق ایسا طرزِ عمل اپنانا چاہیے جس سے مشکل میں مبتلا افراد کے حقوق متاثر نہ ہوں۔

# جنگی قیدیوں کے حقوق اور قید ختم ہونے کے اسالیب

## اسلام اور بین الاقوامی قانون میں

ڈاکٹر محمد طارق رمضان*

گزشتہ دو صدیوں میں عالمی سطح پر تباہی کی وجوہات میں ایک بڑی وجہ عسکری محاذ آرائی رہی ہے۔ ان جنگوں میں انسانی جانوں کے ضیاع کے ساتھ ساتھ، قید ہو جانے والے انسانی نفوس کی بھی ایک معتدبہ تعداد مصائب سے دوچار رہی۔ قید ہو جانے والے جنگجوؤں کے مصائب کو کم کرنے اور ان کی رہائی کے لیے عالمی سطح پر قانون سازی کی جاتی رہی ہے جس پر عالمی قوتیں ایک دوسرے سے باہم متفق و مختلف رہی ہیں۔ مزید برآں، جنگی قید کو ختم کرنے کے لیے زمانہ قدیم سے ہی مختلف اسالیب رہے ہیں۔ اسلام سے قبل ان اسالیب میں سے سزائے موت اور غلامی کو اختیار کیا جاتا تھا۔ ریاستِ مدینہ کی تشکیل کے بعد جنگی قید کی تحلیل کے لیے اسلام نے اپنا ضابطۂ اخلاق پیش کیا جو انسانی فلاح اور ترحّم کی اساس پر قائم ہے اور یہ پانچ اسالیب پر مشتمل ہے۔ ان میں سے دو اسالیب بلا معاوضہ آزادی اور تاوان (مشروط و غیر مشروط) نصوصِ قرآنی سے ثابت ہیں جب کہ تین اسالیب: جنگی قیدیوں کا باہمی تبادلہ، قیدیوں کو غلام بنانا اور سزائے موت سنتِ نبوی ﷺ سے ثابت ہیں اور ان پر صدرِ اسلام سے ہی عمل ہوتا چلا آیا ہے۔ عہدِ حاضر میں اسلام کے اس ضابطۂ اخلاق کی اہمیت اس اعتبار سے بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس وقت جنگ زدہ علاقوں کی اکثریت مسلم آبادی والے

---

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علومِ اسلامیہ، یونیورسٹی آف لاہور

خطوں پر مشتمل ہے اوران لڑائیوں میں جنگی قیدی بننے والوں کی اکثریت اسلام سے تعلق رکھتی ہے۔اسی لیے اس مقالہ کا بنیادی محور جنگی قیدیوں کی قید ختم کرنے کے لیے اسلام کے ضابطۂ اخلاق کا مطالعہ ہے۔ چونکہ مسلمان آبادی والے علاقوں پر جنگ عالمی قوتوں کی طرف سے مسلط کی گئی ہے اس لیے اس مقالہ میں جنگی قید ختم کرنے کے لیے اسلامی انسانی قوانین اور بین الاقوامی قانونِ انسانیت کا تقابلی مطالعہ بھی شاملِ متن ہے۔

## تعارف

اس وقت دنیا میں رائج قوانین کے مطابق ہر انسان فطرتاً آزاد ہے اور اپنی معاشی و معاشرتی سرگرمیوں کے لیے آزادانہ فیصلہ کر سکتا ہے۔اس کی آزادی کو بلاوجہ سلب نہیں کیا جاسکتا۔البتہ مخصوص حالات میں اس کی آزادی اور کچھ حقوق عارضی طور پر سلب کیے جاسکتے ہیں۔ معاشرے کے جن افراد کے حقوق عارضی طور پر سلب کیے جاسکتے ہیں ان میں ایک طبقہ جنگی قیدیوں کا بھی ہے۔اسیرِ حرب (prisoner of war) ایسا شخص ہے جو اپنے ملک کی دفاعی یا اقدامی سرگرمی میں حصہ لینے پر میدانِ جنگ سے یا کسی اور مقام سے گرفتار ہوا ہو۔اسیرِ حرب، اسیر ہونے کے باوجود بطور انسان، حقوق سے محروم نہیں ہوتا اور اس کے بنیادی حقوق سلب نہیں کیے جاسکتے۔ بین الاقوامی سطح پر جنگی قیدیوں کے حقوق کی بحث انیسویں صدی سے خاصی اہمیت حاصل کر چکی ہے۔

دورانِ جنگ دشمن سے مبارزت اور اسے قیدی بنانا نصوصِ اسلامیہ کی روشنی میں قانونی فعل ہے۔ سورۃ الانفال کی آیات میں دورانِ جنگ دشمن کا گھیراؤ کرنے اور قیدی بنانے کی ترغیب دی گئی ہے۔[1] اسی طرح سورۃ محمد میں دشمن کو زندہ گرفتار کرنے کی ترغیب بھی دی گئی ہے۔[2] تاہم

---

[1] التوبۃ:۵

[2] محمد:۴

اسلام نے جنگی قیدیوں کے حوالے سے بھی حدود متعین کر کے انسان کو تکریم دی ہے،[3] اور دشمنی میں بھی انصاف کا حکم دیا ہے۔[4]

## موضوع پر موجود مواد کا جائزہ

اسلام میں بین الاقوامی تعلقات اور معاہدات پر اوّلین کتاب 'السیر الصغیر' ہے جسے امام محمد بن حسن الشیبانیؒ نے لکھا۔ یہ بین الاقوامی تعلقات پر ایک مختصر کتاب تھی۔ بعد ازاں امام شیبانیؒ نے بین الاقوامی تعلقات اور معاہدات پر مفصل کلام 'السیر الکبیر' میں کیا ہے۔ اس موضوع پر معاصر محقق ڈاکٹر مجید خدوری نے اسلام کے قانونِ جنگ پر مباحث کو منضبط کیا،[5] اور پھر اسلام اور مغرب کے قوانین جنگ پر ایک تقابلی مطالعہ بھی مرتّب کیا۔[6] Karima Bennoune نے اسلام کے فلسفۂ انسانی حقوق اور مغربی فلسفہ ہیومن ازم پر سیر حاصل بحث کی ہے۔[7] احمد زکی یمنی نے انسانی حقوق سے متعلق اسلامی نقطۂ نظر کو جامعیت سے پیش کیا۔[8] اسلام کے فلسفۂ انسانی حقوق اور عالمی انسانی قانون کے تقابل پر مشتمل یہ مقالہ جنگی قیدیوں کے حقوق سے متعلق اہم ہے۔ ڈاکٹر محمد منیر نے جنگی قیدیوں کے حقوق پر اہم مباحث کو یکجا کیا ہے۔[9] اپنے مقالہ میں ڈاکٹر محمد منیر نے جنگی قیدیوں کے

---

[3] وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی ہے۔) بنی اسرائیل: ۷۰

[4] وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ (اور کسی قوم سے دشمنی کے باعث انصاف کو ہر گز نہ چھوڑو۔ عدل کرو یہی بات زیادہ نزدیک ہے تقویٰ کے) المائدہ: ۸

[5] Majid Khadduir, *War and Peace in the Law of Islam*, Baltimore, The John Hopkins Press, 1955

[6] Majid Khadduir, "Islam and the Modern Law of Nations" *American Journal of International Law*, 50: 2 (1956), 353-372

[7] Karima Bennoune "As-Slamu 'Alaykum? Humanitarian Law in Islamic Jurisprudence" *Michigan Journal of International Law*, 15, No. 4 (1993-1994), 605-643

[8] Ahmad Zaki Yamni "Humanitarian Law in Islam: A General Outlook", *Michigan Yearbook of International Legal Studies*, 7 (1985), 189-215

[9] Muhammad Munir, "Debates on the Rights of Prisoners of War in Islamic Law" Islamic Studies, 49, No. 4 (2010): 463-492

حقوق اور آزادی پر نہ صرف اسلامی موقف پیش کیا بلکہ جنیوا معاہدہ کی مختلف شقوں کو زیرِ بحث لاتے ہوئے افغانستان میں طالبان کے طرزِ عمل پر پُر مغز گفتگو کی ہے۔ڈاکٹر محمد منیر نے افغانستان میں عسکری تصادم اور مجاہدین کے لیے لائحہ عمل پر ایک مفصل گفتگو اپنے ایک دوسرے مقالہ میں پیش کی ہے۔[۱۰] مصری محقق ڈاکٹر احمد داؤدی نے شام میں ہونے والے عسکری تصادم پر اسلامی قوانین اور عالمی انسانی قوانین کا تعارفی اور تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔[۱۱] اس میں اسلامی عسکری قوانین، مقامی شہری آبادی کی حفاظت، جنگ میں روایتی اور ممنوعہ ہر دو قسم کے ہتھیاروں کے استعمال اور ان کی نوعیت، جنگجوؤں کا مثلہ کرنے کی ممانعت اور جنگ میں ہلاک ہونے والوں کی باقیات کی باعزت طریقے سے تنظیم وغیرہ جیسے موضوعات پر گفتگو کی گئی ہے۔انگلستان کے محقق Anisseh Van Engeland نے بھی اسلام کے قانون انسانی حقوق اور بین الاقوامی انسانی قانون کا ایک تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔[۱۲] سید مصطفیٰ محقق نے اسی موضوع پر اپنی گزارشات پیش کی ہیں۔[۱۳] عمومی حوالے سے سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا انسانی حقوق سے متعلق مرتّب کردہ کام اس موضوع پر ایک عمدہ حوالہ ہے۔[۱۴]

---

10 Muhammad Munir, “The Layha for the Mujahideen: an analysis of the code of conduct for the Ṭālibān fighters in Afghanistan under Islamic law” *International Review of the Red Cross,* 93, No. 881 (March 2011): 1-40

11 Dr. Ahmed Al-Dawoody, “Islamic law and international humanitarian law: An introduction to the main principles” *International Review of the Red Cross,* 99, No. 3, (2017), 995–1018

12 Anisseh Van Engeland “The difference and similarities between international humanitarian law and Islamic humanitarian law: Is there ground for Reconciliation?”, Journal of Islamic Law and culture, 10, no. 1 (2008): 81-99

13 Sayyid Muṣṭafā Muḥaqqiq, *“Islamic views on Human Rights”* Tehran, Centre for Cultural-International Studies, 2003

14 Sayyid Abul A‘ala Maudūdī, *“Human Rights in Islam”*, Islamabad, *Da‘wah* Academy, 1998

## مقاصد و تحدیدِ موضوع

اس مقالہ کا بنیادی مقصد اسارتِ حرب کی تحلیل کے لیے اسلام کے ضابطۂ اخلاق کی وضاحت ہے۔ چونکہ اس مختصر مقالہ میں جنگی قیدیوں کے تمام حقوق کا احاطہ نہیں ہو سکتا اسی لیے اس میں جنگی قیدیوں کے صرف وہی حقوق مذکور ہیں جو ان کی آزادی یعنی اسارت کی تحلیل میں معاون ہو سکتے ہیں۔ رائج قانون کے تناظر میں عالمی قانونِ انسانیت کی شقوں کو بھی شاملِ مطالعہ کیا گیا ہے۔

## اسلامی فقہی ادب میں جنگی قیدی سے مراد

ابن تیمیہؒ نے جنگی قیدی کی تعریف یوں کی ہے: كل من يؤخذ فى الحرب مع الكفار أو فى نهايتها فى القتال أو غير القتال مثل أن تقليه السفينة إلينا أو يضل الطريق أو يوخذ بحيلة (جنگی قیدی ہر وہ شخص ہے کہ جسے کفار کے ساتھ جنگ کے وقت یا اس کے اختتام پر پکڑا جائے، چاہے لڑائی کے دوران یا بغیر لڑائی کے مثلاً اگر کشتی سے وہ ہماری طرف گر جائے یا راستہ بھول جائے یا اس کو حیلہ سے گرفتار کیا جائے)۔[15] اسی طرح علامہ کاسانیؒ کے مطابق جنگی قیدی کا اطلاق ہر اس شخص پر ہوتا ہے جو حربی ہو اور دار الاسلام میں بغیر امان (یعنی ویزہ) کے داخل ہو یا مرتدین اور باغیوں کے ساتھ مسلمانوں کی لڑائی کے دوران گرفتار کر لیا جائے۔[16] اسی طرح علامہ ابن رشدؒ کے مطابق جنگی قیدی کا اطلاق فقہاء کرام کے ہاں اس مسلمان پر بھی ہوتا ہے جس کو دشمن قوت (کفار) نے جنگ کے دوران گرفتار کیا ہو۔[17] ڈاکٹر وھبہ الزحیلیؒ کے مطابق قانون وضعی میں جنگی قیدی وہ شخص ہے جس کو کسی ارتکابِ جرم کی وجہ سے نہیں بلکہ عسکری وجوہات کی بناء پر جنگ

---

[15] تقی الدین احمد بن عبد الحلیم ابن تیمیہ، السیاسۃ الشرعیۃ، مصر، دار الکتب، سن اشاعت ندارد، ص ۱۲۴

[16] علاء الدين أبو بكر بن مسعود بن أحمد الكاساني الحنفي الكاسانی، بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع، الرياض، مكتبۃ الرشيد، ۱۴۲۰ھ، ج۷، ص۱۰۹

[17] محمد بن احمد ابن رشد القرطبی، بدايۃ المجتهد ونهايۃ المقتصد، بیروت، دار المعرفۃ، ۱۴۰۲ھ، ج۲، ص۲۵۸

کے دوران گرفتار کیا گیا ہو۔[۱۸]

## اسلام کی عسکری روایت کا سنہرا اصول

عہدِ نبویؐ میں اسلامی حکومت کو جب کسی آبادی سے مقابلہ درپیش آیا تو اس علاقے کی ساری آبادی اور قبیلے کے تقریباً تمام ہی لوگ براہِ راست جنگ میں شریک تھے۔ بعد ازاں عہدِ صحابہ میں عموماً مسلمانوں کا مقابلہ منظم افواج سے ہوا۔ ایسے میں مجاہدین نے اس ملک میں فاتحانہ داخل ہونے کے بعد عوامی املاک یا باشندوں کے مال و جان پر دست درازی نہیں کی، بلکہ مفتوحہ علاقوں کے مقامی لوگوں نے مسلمانوں کے حسنِ سلوک، رواداری اور انصاف پر مبنی طرزِ عمل کو دیکھ کر کئی موقعوں پر مسلمانوں کے ساتھ مختلف حوالوں سے تعاون کیا۔[۱۹]

## اسارتِ حرب کی تحلیل کے اسالیب

آغازِ اسلام سے قبل اسارت جنگ کی تحلیل کے لیے پانچ اسالیب رائج تھے جو کہ بلا معاوضہ آزادی، تاوان (مشروط و غیر مشروط)، جنگی قیدیوں کی ایک دوسرے کے ساتھ تبدیلی، قتل اور غلامی تھے۔ لیکن جوشِ انتقام میں اور اپنی دھاک بٹھانے کی خاطر ان میں سے اکثر غلامی اور قتل کو اختیار کیا جاتا تھا اور جنگی قیدیوں سے غیر انسانی سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ اسلام میں بھی تحلیلِ اسارت کے لیے یہی پانچ اسلوب اپنائے گئے ہیں لیکن ان کی تہذیب اور اصلاح کر دی گئی۔ چنانچہ ترجیحی بنیادوں پر قرآن مجید میں اسارتِ جنگ کی تحلیل کے دو طریقے بیان کیے گئے ہیں: بلا معاوضہ رہائی اور تاوان (مشروط یا غیر مشروط)۔[۲۰] ان کے علاوہ تین اسلوب جنگی قیدیوں کی ایک دوسرے سے تبدیلی، استرقاق اساریٰ (غلام بنانا) اور سزائے موت کا ذکر احادیث میں موجود ہے۔ جنگی قیدیوں کی ایک دوسرے کے ساتھ تبدیلی سنت سے ثابت ہے، جبکہ سزائے موت کا اسلوب استثنائی

---

[۱۸] الدکتور وھبۃ الزحیلی، آثار الحرب، دمشق، دار الفکر، ۱۴۱۸ھ/۱۹۹۷ء، ص ۳۷۹

[۱۹] الدکتور محمد سلام مدکور، مناھج الاجتہاد، قاھرۃ، دار النھضۃ العربیۃ، مصر، ۱۹۶۰ء، ص ۱۱۰-۱۲۹

[۲۰] محمد: ۴

حیثیت رکھتا ہے۔غلامی کا اسلوب مقابلہ بالمثل کی قبیل سے ہے۔ان تمام اسالیب پر ذیل میں تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔

## سربراہِ ریاست کے اختیارات اور فقہی آراء

اسلام کے فقہی ادب میں اس بات پر تو اتفاق ہے کہ سربراہِ ریاست کو اسارتِ جنگ کی تحلیل کے لیے اختیارات حاصل ہیں۔ لیکن مزید تفصیل میں بنیادی طور پر تین فقہی آراء پائی جاتی ہیں:

**پہلی رائے:** حنفی فقہاء کے نزدیک تین اختیارات سربراہِ ریاست کو حاصل ہیں۔[21] فقیہ عبدالغنیؒ نے اپنی کتاب اللباب فی شرح الکتاب میں لکھا ہے: **وَهُوَ فِي الْاَسرى بِالْخِيَارِ: اِنْ شَاءَ قَتَلَهُمْ اِنْ شَاءَ اسْتَرَقهم وَاِنْ شَاءَ تَرَكهم اَحرَارًا ذِمَّةً لِلْمُسْلِمِيْنَ وَلَا يَجُوْز اَنْ يَّردّهم اِلى دَارِ الْحَرْبِ**[22] (اور سربراہِ ریاست کو قیدیوں کے بارے میں اختیار حاصل ہے: چاہے تو انہیں سزائے موت دے دے، چاہے تو ان کو غلام بنا لے اور اگر مناسب سمجھے تو ان کو مسلمان کا ذمی بنا کر آزاد کر دے لیکن ان کو دارالحرب کی طرف لوٹانا مناسب نہیں ہے۔)

**دوسری رائے:** حنبلی اور شافعی فقہاء کے نزدیک سربراہ کو چار اسالیب میں اختیار حاصل ہے۔[23] جیسا کہ معروف فقیہ موفق الدین ابن قدامہ نے الشرح الکبیر میں درج کیا ہے: **انّ اِمَام يخير فِي الْأسرى بَيْنَ الْقَتل وَالْمَنّ والْفِدَاء وَالْاَسْتِرْقَاق**[24] (جنگی قیدیوں کے بارے میں امام کے پاس سزائے موت، احساناً آزادی، تاوان اور غلام بنانے میں اختیار موجود ہے)۔ابن قدامہؒ نے

---

[21] ابو بکر بن مسعود بن احمد الکاسانی، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، بیروت، دار الکتاب العربی، ۱۹۸۲، ج ۷، ص ۱۱۷-۱۲۰

[22] عبدالغنی المیدانی، اللباب فی شرح الکتاب، مصر، مکتبۃ محمد علی صبیح، طبعۃ الرابعۃ، سن اشاعت ندارد، ج ۴، ص ۱۲۴

[23] ابو الحسن علی بن محمد الماوردی، الاحکام السلطانیہ، مصر، مطبعۃ الاتحاد المصری، الطبعۃ الاولی، ۱۹۰۹، ص ۱۴

[24] موفق الدین ابو محمد عبداللہ بن احمد بن محمود ابن قدامۃ، المغنی ویلیہ الشرح الکبیر، بیروت، دار الکتاب العربی، لبنان، ۱۹۸۳ء، ج ۲، ص ۲۰۵

اہلِ کتاب اور اہلِ مجوس کے اسیران کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: فَيخير الْإِمَامِ فِيهِمْ بَيْنَ أَرْبَعَةِ أَشْيَاءِ الْقَتلِ وَالْمنّ بِغَيْرِ عِوَضٍ وَالْمَفَادات بِهِمْ وَاسترْقَاقِهِم[25] (سربراہِ ریاست کو چار امور: سزائے موت، بلا معاوضہ آزادی، تاوان اور غلامی میں اختیار ہے)۔

تیسری رائے: مالکی فقہاء کے مطابق سربراہِ ریاست کو پانچ اسالیب میں اختیار حاصل ہے: ذَهَبَ مَالِكٍ وَ جُمهُوْر اَهْلِ الْعِلْم أن الْإِمَام مُخير فِي الْأَسرى بَيْن خَمْسَة أَشْيَاء فَإِمَّا أن يّقتل وَإمَّا أن يأسر وَيسْتعبد وَإِمَّا أن يعْتق وَإمّا أن يّاخذ فِيهِ الْفِدَاءِ وَإمَّا أن يعقد عَلَيْهِ الذِّمَّة وَيضْرب عَلَيْهِ الْجِزْيَة[26] (امام مالک اور جمہور ائمہ کی رائے ہے کہ سربراہ ریاست کو جنگی قیدیوں کے بارے میں پانچ اختیارات حاصل ہیں: سزائے موت دی جائے یا ان کو قید بامشقت میں رکھا جائے یا ان کو غلام بنالیا جائے یا ان سے تاوان وصول کیا جائے یا ان کو ذمی قرار دے کر ان پر جزیہ (ٹیکس) لگا دیا جائے۔)

ان تمام اسالیب کو نبی کریمؐ اور صحابہ کرامؓ کے عہد مسعود میں استعمال کرتے ہوئے اسارتِ حرب کو تحلیل کیا گیا۔ اس لیے سربراہِ ریاست کسی ایک ہی صورت کا پابند نہیں ہے اور بہبودِ ریاست کو مدّنظر رکھتے ہوئے ان میں سے کسی بھی اسلوب کو اپنا سکتا ہے۔[27] البتہ اہلِ فقہ میں اسارتِ حرب کی تحلیل کے اسالیب کی ترجیحات میں اختلاف ہے۔[28]

## بلا معاوضہ آزادی

اسارتِ حرب کو تحلیل کرنے کے لیے اسلام کے ضابطۂ اخلاق میں عمومی اسلوب بلا معاوضہ آزادی ہے۔ نصوصِ اسلامیہ میں اعلیٰ ترین ضابطہ اخلاق اسی کو قرار دیا گیا ہے۔ سورۃ محمد کی آیت

[25] المغنی ویلیہ الشرح الکبیر، ج ۱۰، ص ۴۰۰

[26] محمد بن یوسف العبدری، التاج والاکلیل لمختصر خلیل، بیروت، دار الفکر، ۱۳۹۸ھ، ج ۳، ص ۳۵۸

[27] التاج والاکلیل لمختصر خلیل، ج ۳، ص ۳۵۸

[28] الدکتور وھبۃ الزحیلی، آثار الحرب فی فقہ الاسلامی، دمشق، دار الفکر، سن اشاعت ندارد، ص ۴۳۰

نمبر ۴ میں بلا معاوضہ آزادی کو بیان کیا گیا ہے۔ صدرِ اسلام سے ہی اس پر عمل ہوتا چلا آیا ہے۔ اس کی متعدد مثالیں عہد نبویؐ اور عہد صحابہؓ سے ملتی ہیں۔ اس مختصر مقالہ میں تمام کا احاطہ تو نہیں کیا جا سکتا لیکن چند نظائر ذیل میں مذکور ہیں:

غزوہ بدر کے موقع پر مسلمان عددی اور معاشی اعتبار سے کمزور تھے اس کے باوجود اس موقع پر تاوان کے ساتھ ساتھ بلا معاوضہ آزادی کا اسلوب بھی اپنایا گیا۔ اس موقع پر آپ ﷺ نے ابو العاص بن ربیع، المطلب بن حنطب، صیفی بن ابی رفاعۃ اور ابو عزۃ جمحی وغیرہ کو بلا معاوضہ آزادی سے سرفراز کیا۔[29]

غزوہ بنی مصطلق کے موقع پر تقریباً سات سو محاربین کو جنگی قیدی بنایا گیا اور انہیں دستور کے مطابق مجاہدین میں تقسیم کر دیا گیا۔ ان میں قبیلہ بنو مصطلق کے سردار حارث بن ضرار کی دختر حضرت جویریہؓ بھی تھیں جو ثابت بن قیس کے حصہ میں آئی تھیں۔ انہوں نے حضرت ثابتؓ سے مکاتبت کرنا چاہی لیکن ان کے پاس دینے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اس پر حضرت جویریہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو آپؐ نے اپنی طرف سے ان کا معاوضہ ادا کر کے آزاد کر دیا۔ اس حسنِ سلوک سے متاثر ہو کر حضرت جویریہؓ نے آپ ﷺ سے نکاح کو پسند کیا۔ ان کی تکریم کرتے ہوئے صحابہؓ نے ان کے قبیلے کے تمام جنگی قیدی بلا معاوضہ آزاد کر دیے۔[30]

- غزوہ بنی قریظہ کے موقع پر بھی آپ ﷺ نے بعض افراد کو بلا عوض رہا کیا۔[31]
- غزوہ حنین میں چھ ہزار جنگجو مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔ جب یہ جنگجو میدانِ جنگ سے گرفتار ہوئے تو آپ نے اُن سب کو مقام جعرانہ میں بڑی حفاظت کے ساتھ رکھا اور اس بات کا انتظار کرتے رہے کہ ان کے اعزّا و اقربا ان سے متعلق گفتگو کرنے کے لیے آپؐ کے

[29] احمد بن یحیٰ البلاذری، انساب الاشراف، مصر، دار المعارف، سن اشاعت ندارد، ج ۱، ص ۳۰۲-۳۰۳

[30] ابو داؤد سلیمان بن الاشعث، سنن ابی داؤد، بیروت، دار الکتاب العربی، سن اشاعت ندارد، ج ۴، ص ۳۴

[31] ابو عبید قاسم بن سلام الھروی، کتاب الاموال، لاہور، مکتبۃ اثریۃ، س۔ن، ص ۱۳۰

پاس آئیں۔ قبیلہ ہوازن کا چودہ افراد پر مشتمل وفد، زبیر بن صرد کی زیر قیادت آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور قیدیوں کو آزاد کرنے کی درخواست کی۔ آپؐ نے انہیں یہ اختیار دیا کہ وہ چاہیں تو مال واپس لے لیں اور اگر چاہیں تو اپنے قیدیوں کی بلا معاوضہ آزادی حاصل کر لیں۔ اس پر انہوں نے جنگی قیدیوں کی آزادی کو ترجیح دی۔ رسول اللہ ﷺ صحابہ کرامؓ کو ان قیدیوں سے متعلق سفارش کرتے ہوئے ذیل کے الفاظ میں مخاطب ہوئے:

فإنَّ إخوانكُم هؤلاءِ جاءُوا تائبين، وإنِّي قَدْ رَأيت أنْ أَرُدَّ إليهِمْ سبيَهُم، فَمَنْ أحبَّ مِنْكُمْ أن يطيِّبَ ذلِكَ فَلْيَفْعَل، ومَنْ أحبَّ مِنْكُمْ أن يَكونَ على حظِّهِ حَتّى نُعْطيَهُ إيَّاهُ من أوَّلِ مَا يفيءُ اللّهُ عَلَيْنا فَلْيَفْعَلْ [۳۲]

تمہارے بھائی مطیع ہو کر آئے ہیں۔ میرا ارادہ ان کو آزاد کرنے کا ہے۔ آپ میں سے جو اس (بلا معاوضہ آزادی) کو پسند کرے تو وہ ایسا کر گزرے اور جو کوئی تاوان لینا چاہے تو میں انہیں ادا کر دوں گا جیسا کہ اللہ نے پہلے ہم پر یہی انعام کیا ہے۔

اس کے بعد تمام مجاہدین جنگی قیدیوں کو بلا معاوضہ رہا کرنے پر رضامند ہو گئے۔ آپ ﷺ نے نہ صرف اپنے حصے کے تمام قیدی خود آزاد فرمائے بلکہ صحابہؓ کو بھی ترغیب دی اور چونکہ قیدی تقسیم ہو چکے تھے لہٰذا اگر کچھ لوگ بغیر عوض کے اپنے قیدی چھوڑنا نہیں چاہتے تو آپؐ نے ان کو مالِ غنیمت سے فدیہ دینے کا وعدہ فرمایا۔[۳۳]

صلح حدیبیہ کے موقع پر ۸۰ آدمی فجر کی نماز کے وقت آپؐ اور آپؐ کے صحابہ پر حملہ آور ہوئے تو سب کے سب قیدی بنا لیے گئے۔ تاہم آپؐ نے ان سب کو بلا معاوضہ رہا کر دیا۔[۳۴]

---

[۳۲] صحیح بخاری، ج۴، ص۱۵۶۹

[۳۳] عبداللہ بن محمد ابن ابی شیبہ، مصنف ابن ابی شیبہ، کراتشی، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، ۱۹۸۶ء، ج۱۴، ص۹

[۳۴] ابوداؤد سلیمان بن الاشعث، سنن ابی داؤد، ج۳، ص۱۳

نبی کریم ﷺ نے متعدد غزوات میں قیدیوں کو اجتماعی طور پر از راہِ احسان بلاعوض رہا کیا، اس کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ نے انفرادی طور پر بھی بعض اسیران کو اسی طرح رہا کیا۔ آپؐ نے اہل یمامہ کے سردار ثمامہ بن اثال کو بھی بلاعوض رہا فرمایا تھا جس کے بعد انہوں نے برضا و رغبت اسلام قبول کر لیا۔[35] عرب کے معروف سخی حاتم طائی کی بیٹی جب قیدی بنا کر لائی گئی تو آپ ﷺ نے اُسے اس کی درخواست پر نہ صرف از راہِ احسان بغیر عوض کے آزاد فرمایا بلکہ اسے کچھ تحائف بھی دیئے۔[36]

مندرجہ بالا تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کہ آپؐ نے اپنی حیات طیبہ میں اسیرانِ جنگ کے لیے جس قدر اس اسلوب کو اختیار فرمایا، کسی اور اسلوب کو اس قدر اختیار نہیں فرمایا۔ دورِ نبوی میں جو قیدی مجموعی طور پر نبی اکرم ﷺ کے اختیار میں آئے ان کی تعداد ایک تحقیق کے مطابق چھ ہزار پانچ سو چونسٹھ ہے، جن میں سے آپؐ نے چھ ہزار تین سو چوہتر کو از راہِ لطف و احسان بلا کسی شرط کے آزاد فرمایا۔[37] گویا آپ ﷺ نے کل تعداد کے ۹۷ فیصد سے زائد افراد کو بلا معاوضہ آزاد فرما دیا۔

نبی اکرم ﷺ کے بعد صحابہؓ کے دور میں بھی بطورِ احسان بلاعوض قیدیوں کو آزاد کرنے کی مثالیں متعدد اور مسلسل نظر آتی ہیں۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اشعث بن قیس کندی کو رہا کیا[38] اور حضرت عمرؓ نے ہرمزان کو بلاعوض رہا کیا۔[39] اسی طرح حضرت عمرؓ کے دور میں جب مناذر فتح کیا

---

[35] مسلم بن الحجاج القشیری، صحیح مسلم، ج۵، ص۱۵۸

[36] السیرۃ النبویۃ لابن ھشام، ج۲، ص۵۷۹

[37] قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری، رحمۃ للعالمین، لاہور، مکتبہ اسلامیہ، ۲۰۰۶ء، ج۲، ص۲۰۴

[38] فتوح البلدان، ص۱۴۱

[39] محمد بن حسن الشیبانی، کتاب السیر الکبیر، بیروت، دار الکتب العلمیۃ، ۱۹۹۷ء، ج۲، ص ۴۹؛ فتوح البلدان، ص ۵۳۷-۵۳۸

گیا تو ان کے گرفتار اسیر ان کو بھی رہا کر دیا گیا۔ مہلب بن ابی صفرہ کہتے ہیں کہ ہم نے مناذر کا محاصرہ کیا اور وہاں کے لوگوں کو گرفتار کر کے لونڈی یا غلام بنا لیا۔ جب حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے لکھ بھیجا: ان مناذر قریۃ من قری السواد فردوا علیھم ما أصبتم [40]

''بے شک مناذر بڑی آبادی والی جگہ ہے لہذا جو کچھ بھی آپ نے وہاں سے حاصل کیا ہے اسے واپس کر دیا جائے''۔

ابو عبید القاسم بن سلام (م ۲۲۹ھ / ۸۳۷ء) کی رائے ہے کہ اسارتِ حرب کی تحلیل کے لیے عزیمت بلا معاوضہ رہائی ہے البتہ مخصوص حالات میں رہائی کے بدلے تاوان بھی لیا جا سکتا ہے اور باقی اسالیب کو بھی اپنایا جا سکتا ہے۔ غزوہ بدر کے موقع پر مسلمان عددی اور معاشی لحاظ سے کمزور تھے۔ اس وقت سورۃ الانفال کی آیت ۶۷ اور ۶۸ پر عمل کرتے ہوئے قیدیوں سے تاوان وصول کیا گیا، لیکن جب مسلمانوں کا یہ عددی و معاشی ضعف نہ رہا تو اس وقت احسان کرتے ہوئے بلا معاوضہ رہائی کا اسلوب ہی بالعموم اپنایا گیا۔[41] اس حقیقت کے باوجود کہ نوزائیدہ اسلامی ریاست پر جنگِ بدر مسلط کی گئی تھی، نبی کریم ﷺ نے جنگِ بدر کے ستر قیدیوں کو دورانِ اسارت مہمانوں کی طرح رکھا، اور اہلِ مدینہ نے ان کے ساتھ نہایت ہی اچھا برتاؤ کیا۔ ایک رات آنحضرت ﷺ کو بدر کے قیدیوں کے کراہنے سے اس قدر تکلیف ہوئی کہ آپؐ تمام رات سو نہ پائے، اور پھر آپؐ کے حکم سے تمام قیدیوں کی بندشیں ڈھیلی کر دی گئیں۔[42] جنگی قیدیوں کے ساتھ صحابہ کرامؓ کے حسنِ سلوک کی تعریف قرآنِ مجید میں بھی موجود ہے۔[43]

---

[40] فتوح البلدان، ص ۵۴۳

[41] ابو عبید القاسم بن سلام، کتاب الاموال، بیروت، المکتبۃ العصریۃ، ۲۰۰۲ء، ص ۱۱۶

[42] ابو الحسن علی بن اسماعیل المرسی ابن سیدۃ، المحکم والمحیط الاعظم، تحقیق، عبد الحمید هنداوي، بیروت، دار الکتب العلمیۃ، ۱۴۲۱ھ / ۲۰۰۰

[43] الدھر: ۸

## تاوان (مشروط و غیر مشروط)

جنگی قیدیوں سے تاوانِ جنگ لے کر آزاد کرنے کا قانون ترجیحات میں دوسرے درجے میں نظر آتا ہے۔ اس اسلوب میں جنگی قیدیوں سے بطور فدیہ مال یا خدمات لے کر آزاد کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اسیرانِ بدر کے متعلق مشورے کے بعد آپ ﷺ نے فدیہ کے بدلے رہائی کا فیصلہ فرمایا، لیکن اس پر عمل درآمد میں بھی سراپا رحمتؐ نے قیدیوں کی حیثیتوں کا لحاظ رکھا۔ جو قیدی اہلِ ثروت تھے، ان کا فدیہ مال طے ہوا۔ جو اہلِ علم و فن تھے ان کی رہائی کا معاوضہ یہ طے ہوا کہ مسلمانوں کو لکھنے پڑھنے کی تعلیم دیں۔ جو بالکل تہی دست تھے ان کو کچھ عرصہ قید میں رکھ کر رہا کر دیا گیا۔ [۴۴]

## تاوان میں فقہی آراء

امام ابو حنیفہؒ اسیرانِ حرب کو احساناً آزاد کرنے یا بالمعاوضہ آزاد کرنے سے اختلاف کرتے ہیں۔ اس کی دو وجوہات ہیں: اوّل یہ ہے کہ سورۃ الانفال کی آیت نمبر ۵ کے مطابق دشمن کو قتل کرنا ایک عمومی حکم ہے لہٰذا اس حکم کو اس کے عموم پر ہی رکھا جائے گا۔ دوم: دشمن کو فدیہ لے کر آزاد کرنے کا فعل دشمن کو مضبوط کرتا ہے جبکہ حکم دشمن کو کمزور کرنے کا ہے۔ تاہم امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک اسیرِ حرب کو احساناً آزاد کرنا یا تاوان لے کر آزاد کرنا، دونوں اسالیب جائز ہیں۔ اسی طرح جنگی قیدیوں کا ایک دوسرے کے ساتھ تبادلہ بھی جائز ہے۔ [۴۵] امام مالک بن انسؒ اور محمد بن ادریس الشافعیؒ کے نزدیک جنگی قیدیوں سے ان کی آزادی کے عوض تاوان لینا ایک اختیار ہے جسے اسلامی ریاست کی سیاسی انتظامیہ استعمال کر سکتی ہے۔ سفیان بن سعید الثوریؒ اور ابو عبدالرحمٰن الاوزاعیؒ کی رائے بھی یہی ہے۔ ابو عبید القاسم بن سلامؒ اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ ابو عبیدؒ کی رائے یہ ہے کہ اسیران کو احساناً (بلا معاوضہ) رہائی دی جا سکتی ہے اور یہی اصل اسلامی

[۴۴] الدکتور مصطفیٰ احمد زرقاء، الفقہ الاسلامی فی ثوبہ الجدید، دمشق، دار الفکر، ۱۹۶۷ء، ص ۹۰-۱۱۸

[۴۵] الکاسانی، بدائع الصنائع، ج ۶، ص ۹۵

عسکری دستور ہے، البتہ مخصوص حالات میں دیگر اسالیب بھی اپنائے جا سکتے ہیں۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے جنگ بدر کے قیدیوں کے ساتھ کیا۔ اسی طرح کا موقف عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرؓ، حسن بصریؒ اور عطاء بن ابی رباحؒ کا بھی ہے۔[46] یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ نبی کریم ﷺ نے صرف غزوہ بدر میں ہی اسیرانِ بدر سے تاوان وصول کیا تھا لیکن اس کے بعد کبھی کسی جنگ میں تاوان وصول نہیں کیا گیا۔

## اسیرانِ حرب کا باہمی تبادلہ

اسلامی فقہی ادب میں اسیرانِ جنگ کی آزادی کا تیسرا اسلوب یہ بھی ہے کہ مملکت کی سطح پر اسلامی ریاست کے شہریوں کو دشمن کی حراست سے آزادی دلانے کے لیے اسیران کی ایک دوسرے کے ساتھ تبدیلی بھی جائز ہے۔ لیکن اس کا اختیار سربراہِ مملکت اور متعلقہ مقننہ کے پاس ہے جنہیں قوتِ نافذہ تسلیم کیا جاتا ہو۔ اس سلسلے میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ تبادلۂ اسیران کے ضمن میں فریقین کے قیدیوں کی تعداد کا برابر ہونا بھی ضروری نہیں۔ نبی کریم ﷺ کے عہد مسعود میں قبیلہ فزارہ کی قیدی لڑکی کو واپس کر کے اس کے بدلے میں کئی مسلمان قیدیوں کو آزاد کروایا گیا۔[47] حضرت عمران بن حصین کی روایت ہے:

أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ فَدَى رَجُلَيْنِ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ بِرَجُلٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ مِنْ بَنِي عَقِيْلٍ[48]

"رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کے دو مردوں کے بدلے میں بنی عقیل کے ایک مرد کو آزاد کیا"۔

---

[46] زرقاء، الفقہ الاسلامی فی ثوبہ الجدید، دمشق، دارالفکر، ۱۹۶۷ء، ص ۹۰-۱۱۸

[47] صحیح مسلم، بیروت، دارالجیل، س ن، ج ۵، ص ۱۵۰

[48] حافظ ابو بکر ابن ابی شیبہ، مصنف ابن ابی شیبہ، دہلی، ادارہ فکر اسلامی، حدیث ۳۳۹۲۰، مزید دیکھئے: محمد مبشر نذیر، اسلام میں ذہنی و جسمانی غلامی کے انسداد کی تاریخ، آن لائن پرنٹ، ۲۰۰۸، ص ۱۷۴

## اسیرانِ حرب کے باہمی تبادلے پر فقہی آراء

اسلام سے قبل جنگی قیدیوں کے تبادلے کا رواج نہیں تھا۔ ہجرتِ مدینہ کے بعد اسلامی ریاست کی دستوری اساس میں جنگی قیدیوں کے باہمی تبادلے کو احترام انسانیت کے جذبے سے شامل کیا گیا اور اس وقت سے یہ شق اسلام کے قوانینِ محاربات کا لازمی جزو ہے۔ اسلام نے اس کو رواج دیا اور بین الاقوامی سطح پر جہاں کہیں اس اسلوب کی بناء پر معاملات طے کرنے کا موقع ملا اور ممکن ہوا تو اہلِ اسلام نے اس کو خوشی سے قبول کیا۔ حافظ ابن حجرؒ کی اس اسلوب کے بارے میں رائے یہ ہے:

**وَلَوْ كَانَ عِنْدَ الْمُسْلِمِيْنَ اَسَارى وَعِنْدَ الْمُشْرِكِيْنَ اَسَارىٰ واتفقوا الْمَفَاداة تعيّنت**[49]

(اور اگر مسلمانوں کے پاس (دشمن کے) قیدی ہوں اور مشرکین کے پاس بھی (اسلامی ریاست کے شہری بطور) قیدی موجود ہوں اور وہ ان کے تبادلہ پر متفق ہو جائیں تو اس کی رعایت رکھی جائے گی۔)

صدرِ اوّل کے فقہاء میں سے امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد ابن حنبلؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ[50] کی رائے یہی ہے کہ اگر دشمن جنگی قیدیوں کے تبادلے پر آمادہ ہو تو مسلمانوں کو بھی ایسا کر لینا چاہیے۔ ایک روایت کے مطابق امام ابو حنیفہؒ کی ایک رائے یہی ہے۔[51] تبادلۂ اسیران پر عمل

[49] فتح الباری، ج ٦، ص ١٦٧

[50] محمد بن حسن الشیبانیؒ کی رائے ہے کہ دشمن کی حراست میں مسلمان قیدیوں کی آزادی کو یقینی بنانے کے لیے، حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے چار طرق میں سے کوئی بھی اختیار کیا جا سکتا ہے: اولاً کوشش کی جائے کہ کوئی بھی چیز ادا کیے بغیر اسلامی ریاست کے شہریوں کو دشمن کی قید سے آزاد کروایا جائے۔ ثانیاً اگر کوئی چیز دینی بھی پڑے تو خیال رکھا جائے کہ یہ نقدی کی شکل میں ہو۔ ثالثاً اگر دشمن نقدی کو قبول نہ کریں تو ان کو ہتھیار دے کر بھی راضی کیا جا سکتا ہے۔ رابعاً ان سے قیدیوں کا مبادلہ بھی کیا جا سکتا ہے لیکن یہ آخری حل ہونا چاہئے۔ محمد بن حسن الشیبانی السیر الکبیر، القاہرہ، مطبعۃ السعادۃ، ١٩٧٨، ج ۴، ص ٣٠٢، ٣٣٨-٣٣٨

[51] کمال الدین محمد بن عبدالواحد ابن الھمام، فتح القدیر مع الکفایۃ، سکھر، المکتبۃ النوریۃ الرضویۃ س ن، ج ۵، ص ٢٢٠

عہدِ عباسی میں عام رہااور یہ عمل معاہدات کے ذریعے سے ہوتا رہا۔[52] عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے دورِ خلافت میں یہ حکم دیا تھا کہ دشمن کی قید میں موجود اسلامی ریاست کے شہریوں کی آزادی کے لیے معادلۃً دشمن کے قیدیوں کو رہا کیا جائے۔[53]

## استرقاق اساریٰ

اسلام کے فقہی ادب میں اسارتِ حرب کی تحلیل کا چوتھا اسلوب استرقاق اساریٰ یعنی قیدیوں کو غلام بنانا ہے۔ اس اسلوب کے پس منظر میں یہ بات واضح ہے کہ اسلامی قانون کے محور قرآن حکیم میں جنگی قیدیوں کو غلام بنانے یا نہ بنانے کا حکم واضح طور پر موجود نہیں ہے۔ اسی طرح کسی بھی فرمانِ نبوی ﷺ سے مسلمانوں پر یہ لازم نہیں ہوتا کہ وہ جنگی قیدیوں کو لازمی طور پر غلام بنائیں۔[54] اس اسلوب کے جواز کے باوجود یہ اسلوب اسلام کی سیاسی اور عسکری تاریخ میں عمومی رجحان حاصل نہ کر سکا۔ اس سلسلے میں یہ بات پیش نظر رہے کہ اسلامی تعلیمات کے مطابق یہ ایک وقتی اور ہنگامی اسلوب ہے اور اجتماعی زندگی کا کوئی مستقل عنصر نہیں۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ آغازِ اسلام سے قبل علاقائی اور عالمی سطح پر جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کی روایت موجود تھی، حتیٰ کہ اس وقت کے ترقی یافتہ معاشرے مثلاً ساسانی (ایران)، روم، یونان اور عرب اس روایت پر عمل پیرا تھے اور اطرافِ عالم میں رائج مذاہب عیسائیت، یہودیت اور ہندومت کی مذہبی کتب میں اس رواج کی کوئی مذمت موجود نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ آغازِ اسلام میں اسلامی معاشرہ سیاسی، سماجی اور عسکری لحاظ سے اتنا بااثر نہیں تھا کہ اس روایت کو از خود ختم کر سکے۔ اس روایت کے خاتمے کی ایک صورت یہ تھی کہ دیگر اقوامِ عالم بھی اس رسم کے خاتمے پر متفق ہو جائیں جو اس

---

[52] Majid Khadduri, War and Peace in the Law of Islam, The Law Book Exchange Ltd., Clark, New Jersey, 2006, P. 128

[53] ابوزکریا ابن نحاس الدمشقی الدمیاتی، مشاریع الاشواق الی مصاریع العشاق ومثیر الغرام الی دار السلام، بیروت، دار البشائر الاسلامیہ، ۲۰۰۲، ج۲، ص ۸۳۱-۸۳۲

[54] محمد خیر ھیکل، الجہاد والقتال فی السیاسۃ الشرعیۃ، بیروت، دار البیارق، ۱۹۹۶ء، ج۳، ص ۱۵۵۲

وقت بظاہر ناممکن تھا۔ اس لیے اسلام نے معاملہ بالمثل کے تحت اس اسلوب کو جاری رکھا۔ اس کے ساتھ ساتھ معاشرتی تعاملات میں غلام سے خدمات لینے کا رواج عام تھا۔ اب اگر اسلام استر قاق کو فوراً کلی طور پر کالعدم قرار دیتا تو معاشرتی تعاملات کا متاثر ہونا لازمی تھا۔ ڈاکٹر حمید اللہؒ کے نزدیک اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اگر اس اختیار کو کلیتاً ختم کر دیا جاتا تو بوقتِ ضرورت اسے استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا۔[55] اس لیے صدرِ اسلام میں استر قاقِ اساری ایک اختیار کے طور پر مستعمل تو رہا لیکن اسلام نے نہ صرف غلاموں کے حقوق متعین کیے اور ان کی دشمنی و جرائم کے باوجود انہیں انسانی بنیادوں پر تحفظ فراہم کیا بلکہ غلام بننے والے افراد کو مکاتبت کا حق بھی دیا تاکہ وہ اپنی آزادی حاصل کر سکیں۔

استر قاقِ اساریٰ پر اسلام کے موقف کو ہدفِ تنقید بنایا جاتا ہے اور دیگر تنقیدات کے ساتھ ایک تنقید قبیلہ بنو قریظہ کے حوالے سے بھی ہے کہ اسلام کی ابتدائی جنگوں میں بنو قریظہ کی خواتین اور بچوں کو غلام بنانے کا ذکر ملتا ہے۔ اس ضمن میں یہ چند باتیں پیش نظر رہنی چاہییں کہ بنو قریظہ کے جنگی قیدیوں، خواتین اور بچوں کی غلامی اسلام کے عسکری قوانین کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ یہ تو مسلمانوں اور یہودیوں کے مابین ثالثی کا نتیجہ تھی اور ثالثی کی خواہش خود یہود کی طرف سے آئی تھی اور ثالث (سعد بن معاذؓ جو کہ قبیلہ اوس کے سردار تھے) کا تعین بھی بنو قریظہ کی خواہش پر کیا گیا تھا۔ مزید برآں بنو قریظہ کی خواہش تھی کہ ان کی اسارت کو یہودی قوانین کے مطابق حل کیا جائے تو ان کی غلامی یہودی قوانین کا نتیجہ تھی نہ کہ اسلامی قوانین کا۔ ایک اور موقع پر حضرت عمر فاروقؓ نے عرب کے جنگی قیدیوں اور ان کے بچوں کو نہ صرف اپنی طرف سے چار سو درہم یا ایک اونٹ زرِ تاوان کے طور پر ادا کر کے ان کو آزاد کر دیا بلکہ یہ بھی طے کیا کہ آئندہ کسی عرب کو غلام نہیں بنایا جائے گا۔ محمد بن حسن الشیبانیؒ نے اپنی کتاب ''السیر الکبیر'' میں لکھا ہے کہ کسی جنگ میں

[55] Dr Muhammad Hamidullah, *The Muslim Conduct of State*, Sh. Muhammad Ashraf, Lahore, 1996, P.219

مدّمقابل قوتیں یہ طے کرلیں کہ دونوں جانب سے کسی بھی جنگی قیدی کو غلام نہیں بنایا جائے گا تو یہ عہد دونوں قوتوں پر نافذ العمل ہوگا۔[56]

## استر قاقِ اساریٰ پر فقہی آراء

متقدمین فقہائے اسلام جنگی قیدیوں کے معاملے میں استر قاق کے حق میں ہیں اور ان کے درمیان جنگی قیدیوں سے متعلق دیگر صورتوں پر اگرچہ اختلاف موجود ہے مگر استر قاق پر اختلاف نہیں ہے۔ صحابہ کرامؓ کا بھی اس صورت کے جواز پر اجماع نقل کیا گیا ہے۔[57]

جنگی قیدیوں کے استر قاق پر معاصر اہلِ علم میں سے سید قطبؒ کے نزدیک جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کا معاملہ صدرِ اسلام میں معاملہ بالمثل، عقوبت بالمثل کی قبیل سے تھا کہ اگر جنگوں میں مسلمانوں کے مغلوب ہونے پر دشمن ان پر قابو پاتے تو مسلمانوں کو غلام بنانے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ ایسے میں ممکن نہ تھا کہ مسلمان بھی یہ راستہ بند کر دیں۔ لیکن جب بین الاقوامی لحاظ سے اس پر اتفاق ہو گیا کہ جنگی قیدیوں کو غلام نہیں بنایا جائے گا تو مسلمانوں نے اس کو اسلام کا مقصود جانا تو اتفاق کر لیا۔[58] محمد ابو زہرہؒ، ڈاکٹر وھبۃ الزحیلیؒ کا موقف بھی یہی ہے۔[59]

کچھ علمی حلقوں میں جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کی اجازت اور جواز کے نظریے کے خلاف سورۃ محمد کے الفاظ ''فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فداء'' کو پیش کیا جاتا ہے اور اس آیت سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ قرآن جنگی قیدیوں کے بارے میں محض دو ہی راستے فراہم کرتا ہے اور کسی تیسرے

---

[56] محمد بن حسن الشیبانی، السیر الکبیر، القاہر، مطبعۃ السعادۃ، ۱۹۷۸، ج ۱، ص ۱۱۵

[57] محمد بن احمد بن محمد ابن رشد، بدایۃ المجتھد ونھایۃ المقتصد، بیروت، دار المعرفۃ، ۱۹۸۲، ج ۱، ص ۳۸۲

[58] سید قطب، فی ظلال القرآن، مصر، دار الشروق، س ن، ج ۲۸، ص ۲۲۸۵

[59] الامام محمد ابو زہرۃ، العلاقات الدولیۃ فی الاسلام، القاھرۃ، الدار القومیۃ للطباعۃ والنشر، ۱۹۶۴ء، ص ۱۱۶؛ الدکتور وھبۃ الزحیلی، آثار الحرب فی فقہ الاسلامی، دمشق، دار الفکر، س۔ن، ص ۴۴۵، ۴۴۴؛ السید السابق، فقہ السنۃ، بیروت، دار الکتاب العربی، س۔ن، ج ۳، ص ۸۸

راستے کا سد باب کرتا ہے۔ اس طرزِ فکر کے حاملین میں سے برصغیر میں غلام احمد پرویز اور جاوید احمد غامدی نمایاں ہیں۔ جاوید احمد غامدی کی رائے یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا طرزِ عمل سورۃ محمد کی آیت کے عین مطابق تھا اور انہوں نے ہمیشہ قیدیوں کو معاوضہ لے کر یا بلا معاوضہ رہا کیا۔ عام طور پر آپ قیدیوں کو بلا معاوضہ رہا کرتے تھے۔ صدرِ اسلام سے عمومی مزاج یہی رہا ہے تاہم کبھی آپ قیدیوں کا تبادلہ کرتے یا کسی اور عوض پر رہا فرماتے۔[60] اسی طرح غلام احمد پرویز نے سرے سے ہی انکار کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے کبھی قیدیوں کو غلام بھی بنایا تھا۔ نیز انہوں نے اس قسم کی ساری روایات کو عجمی سازش کہہ کر مسترد کر دیا۔[61] جاوید احمد غامدی کی بھی یہی رائے ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قیدیوں کو غلام نہیں بنایا۔[62] تاہم وہ ان روایات کو عجمی سازش کہہ کر مسترد کرنے کی بجائے ان میں سے کچھ کی تاویل کرتے ہیں اور کچھ کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ بہر حال اسلام کے یہی زریں قوانین تھے جن پر عمل کرتے ہوئے خلفائے راشدین کے عہد میں عراق، مصر، شام، ایران اور خراسان جیسے بڑے اور متمدن علاقے فتح ہوئے لیکن کسی بھی جگہ حملہ آور یا جنگ آزما رعایا میں سے کسی کو لونڈی، غلام بنانے کا ذکر نہیں ملتا بلکہ مغلوب دشمن سے تاوانِ جنگ لینے کا ذکر بھی درج نہیں ہے۔[63]

جنگی قیدیوں سے متعلق غلامی کے اسلوب کا خلاصہ یہ ہے کہ جو لوگ جنگ میں گرفتار ہوں ان کو یا تو احسان کے طور پر رہا کر دیا جائے یا فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے یا دشمن کے مسلمان قیدیوں سے ان کا تبادلہ کر لیا جائے لیکن اگر احساناً رہا کر دینا جنگی مصالح یا مسلمانوں کے مصالح عامہ کے خلاف ہو اور فدیہ وصول نہ ہو سکے اور دشمن جنگی قیدیوں کا تبادلہ کرنے پر بھی رضا مند نہ ہو تو مسلمانوں کو حق ہے کہ انہیں غلام بنا کر رکھیں۔

---

[60] جاوید احمد غامدی، قانونِ جہاد، لاہور، ادارہ طلوع اسلام، س ن، ص ۲۷۲، ۲۷۶

[61] غلام احمد پرویز، غلام اور لونڈیاں، لاہور، ادارہ طلوع اسلام، ۱۹۸۴ء، ص ۸

[62] قانون جہاد، ص ۲۷۲، ۲۷۶

[63] قاضی محمد سلیمان منصور پوری، رحمۃ للعالمین، فیصل آباد، مرکز الحرمین الاسلامی، ۲۰۰۷ء، ج ۱، ص ۲۱۲

## سزائے موت

اسلام سے قبل دنیا میں جنگی قیدیوں کو ان کے جرائم کی نوعیت دیکھے بغیر قتل کرنے کی روایت عام تھی۔ اسلام نے اس روایت کی حوصلہ شکنی کی اور اس کے برعکس نہایت مہذب و متمدن قانون پیش کیا کہ کسی بھی جنگی قیدی کو جنگ میں شمولیت کی وجہ سے قتل نہیں کیا جائے گا۔ البتہ دورانِ جنگ، جنگی قوانین کی خلاف ورزی کا ارتکاب کرنے یا جنگ سے پہلے اسلامی ریاست یا اس کے شہریوں کے خلاف کسی سنگین جرم میں ملوث ہونے کی صورت میں جرم ثابت ہونے پر سزا دی جائے گی۔ نبی کریم ﷺ نے ہجرتِ مدینہ کے بعد پہلے عسکری تصادم میں ان دفعات کا خاص خیال رکھا اور بدر کے تمام قیدیوں میں سے صرف دو اشخاص عقبہ بن ابی مُعیط اور نضر بن حارث کو قتل کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے جنگ میں قید ہونے سے قبل نبی کریمؐ اور مسلمانوں کے خلاف سنگین جرائم کا ارتکاب کیا تھا۔[۶۴]

تیسرا شخص جسے جنگ احد کے بعد قتل کیا گیا، ابو عزہ عمر بن عبداللہ الجمحی تھا۔ یہ شخص شاعر تھا اور اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف توہین آمیز شاعری کیا کرتا تھا اور اہل مکہ کو اسلام کی بیخ کنی کے لیے ابھارا کرتا تھا۔ یہ غزوہ بدر میں بھی دشمن کے طور پر شریک اور گرفتار ہوا۔ اسے اس شرط پر بلامعاوضہ رہا کر دیا گیا کہ آئندہ مسلمانوں کے خلاف کسی بھی جنگ کا حصہ نہیں بنے گا اور نہ ہی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف شاعری کرے گا۔ لیکن اس نے آزاد ہونے کے بعد اپنے اس عہد کو توڑ دیا اور پیغمبر اسلام کے خلاف توہین آمیز شاعری دوبارہ شروع کر دی اور اسلامی ریاست کو ختم کرنے کے لیے غزوہ احد میں بھی شریک ہوا جہاں سے اسے گرفتار کیا گیا اور ان سنگین جرائم کی وجہ سے قتل کر دیا گیا۔[۶۵]

---

[۶۴] علی بن ابی بکر نور الدین الہیثمی، بغیۃ الباحیث عن زوائد مسند الحارث، مدینہ، مرکز خدمت السنۃ والسیرۃ، ۱۹۹۲، ج۲، ۶۹۸

[۶۵] ابو بکر محمد بن احمد السرخسی، کتاب المبسوط، بیروت، دار الاحیاء التراث العربیۃ، ۲۰۰۲، ج۱۰، ص۲۶، مزید دیکھیے: نصب الرایۃ لاحادیث الھدایۃ، ج۳، ص۴۰۹

اسی طرح فتح مکہ کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے عام معافی کا اعلان کیا اور سوائے چند لوگوں کے تمام اہل مکہ کو معاف کر دیا۔ ان میں ایک عبداللہ بن خطل تھا۔ اس کا جرم یہ تھا کہ فتح مکہ سے قبل اس نے اسلام قبول کیا اور مدینہ میں اہل اسلام کے ساتھ رہا۔ اسے محکمہ زکوۃ میں اچھے منصب پر فائز کیا گیا اور زکوۃ اکٹھی کرنے کے لیے ایک معاون دے کر روانہ کیا گیا۔ اس شخص نے اس مسلمان معاون کو بہانے سے قتل کر دیا، زکوۃ کی رقم لے کر مکہ فرار ہو گیا، اسلام سے برات کا اظہار کیا اور زکوۃ کی مد میں جمع شدہ رقم سے گانے والی خواتین کو خریدا جن سے اسلامی مملکت اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف توہین آمیز رزمیہ اشعار کا پرچار کیا اور اہل مکہ کو اسلام کے ختم کرنے پر آمادہ کرنے لگا۔ فتح مکہ کے موقع پر اسے گرفتار کیا گیا اور عدلیہ کے ذریعے مقدمہ پیش کیا گیا اور جرائم ثابت ہونے پر قتل کر دیا گیا۔[٦٦]

## جنگی قیدیوں کی سزائے موت پر فقہی آراء

الحسن بن محمد التمیمیؒ اور بعد ازاں ابن رشدؒ کا موقف ہے کہ صحابہ کرامؓ نبی کریم ﷺ کے بنائے ہوئے اس قانون سے اچھی طرح واقف تھے کہ کسی بھی جنگی قیدی کو قتل نہیں کیا جائے گا۔[٦٧] جنگی قیدی کے قتل کے بارے میں سید قطب کی رائے یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عام حالات میں قیدیوں کے ساتھ منّ و فداء (یعنی بطور احسان کے بلا معاوضہ یا فدیہ اور معاوضہ لے کر چھوڑنے) کا معاملہ کیا ہے۔ جہاں تک قتل کرنے کا تعلق ہے تو چند ہی واقعات ہیں جن کا تعلق انفرادی سطح پر ایسے لوگوں سے ہے کہ جن کے جنگ کے علاوہ جرائم ہوتے تھے اور وہی جرائم یا تو جنگ کا سبب بنتے یا جنگ کے ساتھ لاحق ہوتے تھے جس کی وجہ سے وہ مباح الدّم قرار پاتے۔ ورنہ محض جنگی قیدی ہونے کی وجہ سے ان کے قتل کا حکم نہیں دیا جاتا تھا۔[٦٨] امام ابو یوسفؒ اور امام سرخسیؒ کے

[٦٦] ابو بکر محمد بن احمد السرخسی، کتاب المبسوط، ایضاً

[٦٧] محمد بن حسن الشیبانی، السیر الکبیر، ج ۲، ص ۲۶۱

[٦٨] سید قطب، فی ظلال القرآن، مصر، دار الشروق، س ن، ج ۲۸، ص ۲۲۸۵

مطابق اسلامی ریاست کے سربراہ کو جنگی قیدی کے قتل کرنے کا اختیار ہے۔[69] امام سرخسیؒ کے نزدیک فوج کے سپہ سالار کے پاس جنگی قیدی کی سزائے موت کا اختیار نہیں ہے۔[70] کیونکہ جنگی قیدی کی سزائے موت ایک غیر معمولی اور محض سیاسی عمل ہے اسی لیے اس کا اختیار صرف اسلامی ریاست کے سربراہ کے پاس ہی رہے گا اور وہ بھی غیر معمولی مقدمات میں۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ کے نزدیک جنگی قیدیوں کی سزائے موت صرف غیر معمولی مقدمات میں ہی جائز ہے اور وہ بھی تب جب ایسا فعل اسلامی ریاست کے مفاد میں ہو۔ اگر جنگی قیدی نے قید ہونے سے قبل جنگ میں شریک ہونے کے علاوہ کوئی بھی مجرمانہ فعل نہیں کیا تو سربراہ ریاست کے پاس اس کی سزائے موت تجویز کرنے کا اختیار نہیں ہے۔[71]

## غلامی کے رواج کی حوصلہ شکنی

اسلامی ریاست کے خلاف لڑتے ہوئے جنگجو دورانِ جنگ اسلام قبول کر لے اور جنگ سے باز آجائے تو اس کی جان و مال محفوظ ہو جائے گا، اور اس کو قتل کرنا یا غلام بنانا حرام ہوگا، اور اس کو مسلمان کے طور پر تمام حقوق حاصل ہوں گے۔ ہجرتِ مدینہ کے بعد اسلامی ریاست قائم ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمان ہونے والے غلاموں کو خرید کر آزاد کرنے کے لیے زکوٰۃ فنڈ کو استعمال کیا اور اس کا اطلاق پورے عرب سے ہجرت کر کے مدینہ آنے والے غلاموں پر فرمایا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ اسلامی ریاست کا مشرکین سے معاملہ دو طرح کا تھا: یا تو مشرکین اہل حرب[72] تھے یا اہل عہد۔[73] اگر مشرکین اہل حرب کا کوئی مسلمان غلام یا لونڈی

---

[69] امام ابو یوسف، کتاب الخراج، ص۳۷۸، ۳۸۰

[70] الشیبانی، کتاب السیر الکبیر، ج۴، ص۳۱۳-۳۱۴

[71] Dr. Muhammad Hamidullah, The Muslim Conduct of State, Sh. Muhammad Ashraf, Lahore, 1996, P216

[72] مشرکین اہل حرب مسلمانوں سے جنگ کرتے اور جواباً مسلمانوں کو بھی ان کے خلاف دفاعی حیثیت سے لڑنا پڑتا۔

[73] مشرکین اہل عہد نہ ہی مسلمانوں سے جنگ کرتے اور نہ ہی مسلمان ان سے جنگ کرتے تھے۔

ہجرت کر کے مدینہ آجاتا تو انہیں آزاد قرار دے دیا جاتا اور ان کا درجہ مہاجرین کے برابر ہوتا۔ اور اگر اہلِ عہد کا کوئی مسلمان غلام یا لونڈی ہجرت کر کے مدینہ آجاتا تو انہیں واپس نہ لوٹایا جاتا بلکہ ان کی قیمت ان کے مالکان کو بھیجی جاتی تھی۔[74] اسی اصول پر رسول اللہ ﷺ نے صلح حدیبیہ کے وقت معاہدۂ حدیبیہ طے پانے سے پہلے دو غلاموں کو آزادی عطا فرمائی۔ اسی اصول پر نبی کریم ﷺ نے طائف کے محاصرے کے وقت اعلان فرما دیا تھا کہ اہل طائف کے غلاموں میں جو آزادی کا طالب ہو وہ ہماری طرف آجائے۔[75] اس اعلان کا مضمون یہ تھا کہ اگر شہر سے کوئی غلام ہمارے پاس آئے گا تو اسے آزاد کر دیا جائے گا۔ تقریباً بیس غلاموں نے اس اعلان سے فائدہ اٹھایا اور آزادی حاصل کی۔ مشہور مؤرخ بلاذری نے ''فتوح البلدان'' میں ان میں سے بعض کے نام بیان کیے ہیں۔ ان میں ابو بکرہ نفیع بن مسروحؓ بھی تھے۔ اسی طرح ایک رومی لوہار ابو نافع بن الازرقؓ بھی تھے۔ ایسے تمام غلاموں کا درجہ بلند کرنے کے لیے ان کی ولاء کا تعلق بذات خود رسول اللہؐ سے قائم کیا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ سب کے سب غلام رسول اللہ ﷺ کے اپنے خاندان میں شامل کر لیے گئے۔[76] عہدِ صحابہؓ میں یہ روایت رسم بن گئی کہ جو غلام اسلام قبول کر لیتا تو اسے اس کے مالک سے خرید کر آزاد کر دیا جاتا۔ اس طریقہ سے بھی بے شمار غلاموں نے آزادی حاصل کی۔ علامہ ابن کثیرؒ نے سیرۃ النبویۃ میں یہ واقعہ درج کیا ہے کہ عہد صدیقی میں آپؓ کے پاس غلام لائے گئے۔ جب غلام پیش کیے جا چکے تو حضرت ابو بکر صدیقؓ ان سے ہٹ کر نماز میں مشغول ہو گئے۔ یہ سب غلام بھی آپ کے ساتھ ہی نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ نماز کی ادائیگی کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ نے ان کو بلا معاوضہ رہائی دے دی۔[77]

---

[74] صحیح بخاری، کتاب النکاح، حدیث ۵۲۸۶

[75] مسند احمد، باب عبد اللہ بن عباس، مصنف ابن ابی شیبہ، حدیث ۳۴۲۸۳

[76] مبشر نذیر، ص ۸۸

[77] مبشر نذیر، ص ۸۹

اگر جنگجو نے قیدی ہونے کے بعد اسلام قبول کیا تو اس میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے احناف کے نزدیک ایسے قیدی کو قتل نہیں کیا جائے گا۔تاہم اسلامی ریاست کے سربراہ یا انتظامیہ کو ان تین امور: بلامعاوضہ آزادی، بالمعاوضہ آزادی اور استرقاق میں اختیار ہے۔ شوافع اور حنابلہ کے نزدیک اسے قتل نہیں کیا جائے گا البتہ اسے غلام بنانے کا اختیار موجود رہے گا۔[۷۸]

## جنگی قیدیوں سے متعلق عالمی بین الاقوامی قوانین

بین الاقوامی مسلح تنازعات سے متعلق بین الاقوامی قانون دو بڑے حصوں پر مشتمل ہے: اوّل الذکر Jus Ad Bellum کہلاتا ہے۔اس میں جنگ کے جواز او عدم جواز پر قانون سازی موجود ہے اور موخر الذکر حصہ Jus In Bello کہلاتا ہے جو بین الاقوامی مسلح تنازع کے آداب پر مشتمل ہے۔ قانونِ جنگ سے متعلق بین الاقوامی قانون[۷۹] کئی معاہدات اور رواجی قواعد کا مجموعہ ہے لیکن چار جنیوا معاہدات ایسے ہیں جن کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ ان میں پہلا جنیوا معاہدہ برّی جنگ میں زخمی، بیمار یا معذور ہونے والے فوجیوں کے حقوق سے متعلق ہے جبکہ دوسرا جنیوا معاہدہ بحری جنگ میں زخمی، بیمار یا معذور ہونے والے فوجیوں کے حقوق کے بارے میں ہے۔ تیسرا جنیوا معاہدہ جنگی قیدیوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے ہے اور چوتھا جنیوا معاہدہ جنگ کے دوران غیر مقاتلین اور عام شہریوں کے تحفظ کے لیے ہے۔ یہ چاروں معاہدات دوسری جنگ عظیم کے بعد ۱۹۴۹ء میں وضع کیے گئے اور ان پر پاکستان سمیت دنیا کے تمام ممالک نے دستخط کیے ہیں۔[۸۰]

---

[۷۸] ابن قدامۃ المقدسی، ابو محمد عبداللہ بن احمد، المغنی، الریاض، دار عالم الکتب، ۱۴۱۷ھ، ج۸، ص ۳۷۸؛ الکاسانی، البدائع والصنائع، ج۷، ص ۱۲۱، نہایۃ المحتاج، ج۸، ص ٦٦

[۷۹] اس قانون کو ”انسانیت پر مبنی بین الاقوامی قانون“ (International Humanitarian Law) بھی کہا جاتا ہے۔

[۸۰] ڈاکٹر محمد مشتاق، آداب القتال: بین الاقوامی قانون اور اسلامی شریعت کے چند اہم مسائل، الشریعہ، ج۱۹، ش ۱۱، ص ۲۵

۱۹۷۷ء میں جنیوا معاہدات کے ساتھ دو اضافی معاہدات ملحق کیے گئے جنہیں اضافی ضوابط (additional protocols) کہا جاتا ہے۔ ان دونوں اضافی ضوابط کا تعلق عام شہریوں کے تحفظ سے ہے۔ البتہ پہلے ضابطہ کا اطلاق بین الاقوامی مسلح تصادم پر ہوتا ہے اور دوسرے کا اطلاق غیر بین الاقوامی مسلح تصادم پر ہوتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر، پہلا ضابطہ چوتھے جنیوا معاہدے پر مزید اضافہ ہے، جبکہ دوسرا ضابطہ جنیوا معاہدات کی مشترک دفعہ تین (۳) کی توسیع اور تفصیل کی حیثیت رکھتا ہے۔[۸۱]

## جنگجو اور جنگی قیدی ہونے کے لیے شرائط

بین الاقوامی قانون انسانیت کے مطابق ہر وہ شخص جو جنگ میں مندرجہ ذیل چار شرائط پر عمل کرے، جنگجو شمار ہوگا:

۱۔ وہ ایک ذمہ دار کمان کے ماتحت ہو۔
۲۔ وہ غیر مقاتلین سے خود کو ممیز کرنے کے لیے کوئی امتیازی نشان یا لباس استعمال کرے۔
۳۔ وہ واضح طور پر ہتھیار سے مسلح ہو۔
۴۔ وہ آداب القتال کی پابندی کرے۔[۸۲]

یہ چاروں شرائط ۱۹۰۷ء کے ہیگ معاہدے میں بھی مذکور ہیں اور انہیں تیسرے جنیوا معاہدے میں بھی دہرایا گیا ہے۔ ان چار شرائط کو پورا کرنے والا شخص قانوناً جنگجو کہلانے کا مستحق ہوتا ہے اور گرفتار ہونے کی صورت میں اسے جنگی قیدی کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔

---

[۸۱] ڈاکٹر محمد مشتاق، آداب القتال: بین الاقوامی قانون اور اسلامی شریعت کے چند اہم مسائل، الشریعہ، ج۱۹، شمارہ ۱۱، ص ۲۶-۲۸

[۸۲] دیکھئے چوتھے ہیگ معاہدے کی دفعہ ۱ اور تیسرے جنیوا معاہدے کی دفعہ ۴، ڈاکٹر محمد مشتاق، آداب القتال: بین الاقوامی قانون اور اسلامی شریعت کے چند اہم مسائل، الشریعہ، ج۱۹، شمارہ ۱۱، ص ۲۹

## بین الاقوامی قانون انسانیت میں جنگی قید کا اختتام

تیسرے جنیوا معاہدے کی چند اہم دفعات درج ذیل ہیں:

- ایک جنگی قیدی نے قید ہونے سے قبل قابض قوت کے خلاف جو جرائم کیے تھے، قابض قوت کو تیسرے جنیوا معاہدے کی دفعہ ۸۵ کے تحت جنگی قیدی پر ان جرائم کی وجہ سے مقدمہ چلانے کا اختیار موجود ہے۔ یاد رہے کہ قابض قوت کی طرف سے جنگی قیدی پر ان جرائم کا مقدمہ قائم کرنے اور اس کی سماعت کے دوران اس کو وکیل مہیا کرنے اور اس کے ملک کو ان تمام تفصیلات سے آگاہ کرنا ضروری ہے۔
- اگر جنگی قیدی قابض قوت کے خلاف قبل از جنگ کسی جرم میں ملوث نہیں پایا گیا اور نہ ہی اس سے دوران جنگ کوئی جنگی جرم سرزد ہوا ہے تو جنگ بند ہوتے ہی قابض قوت اسے فوراً آزاد کرنے اور اس کے ملک پہنچانے کی ذمہ دار ہے۔ جنگی قیدی کو یہ حق تیسرے جنیوا معاہدے کی دفعہ ۱۱۸ کے تحت حاصل ہے۔
- جنگی قیدی کو اس وعدے یا ضمانت پر بھی رہا کیا جا سکتا ہے کہ وہ آئندہ قابض قوت کے خلاف استعمال نہیں ہوگا بشرطیکہ قابض قوت کے قانون میں اس بات کی گنجائش موجود ہو۔ ایسی صورت میں جنگی قیدی پر اپنے وعدے یا ضمانت پر مقدور بھر قائم رہنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ جنگی قیدی کو یہ حق تیسرے جنیوا معاہدے کی دفعہ ۲۱ کے تحت حاصل ہے۔[۸۳]
- اگر جنگی قیدی بیمار یا زخمی ہو اور اس کی صحت یابی کا دورانیہ ایک سال سے زائد ہو اور اس سے کوئی جنگی جرم سرزد نہ ہوا ہو تو اسے دورانِ جنگ ہی اس کے ملک کے حوالے کر دیا جائے۔

---

[83] Article 109 and 111 of Geneva Convention III of 1949, for more details, see: A. Robert and R. Guelff, Documents on the Laws of war, Oxford, Clarendon Press, 1982, pp 215-270 see also Nigel Rodely, The Treatment of Prisoners under International law, Oxford, Clarendon Press, 1987

جنگی قیدی کو یہ حق تیسرے جنیوا معاہدے کی دفعہ نمبر ۱۰۹ اور ۱۱۰ کے تحت حاصل ہے۔ ان ہی دفعات کے تحت، جنگی قیدی کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ مستقل جنگ بندی کے معاہدے یا غیر اعلانیہ مدت کے لیے عارضی جنگ بندی کے بعد اسے فوراً اس کے ملک کے حوالے کر دیا جائے۔

- کسی بھی جنگی قیدی کو غلام نہیں بنایا جا سکتا اور نہ ہی جنگی قیدی کو سزائے موت دی جائے گی۔[۸۴]

## خلاصۂ بحث

ایک مہذب معاشرے میں تمام شعبہ جات سے تعلق رکھنے والے انسانوں کے حقوق کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اسلام نے بھی اپنے ابتدائی زمانے سے ہی معاشرے کے تمام افراد کے حقوق کا خیال رکھا، ان کے لیے قوانین پیش کیے گئے۔ انسانوں میں ایک طبقہ جنگی قیدیوں کا بھی ہے۔ اسلام نے ان کے حقوق کا تعین کیا۔ اسلام کی آمد سے قبل جنگی قیدیوں کے ساتھ جو ناروا سلوک کیا جاتا تھا اسلام نے اس کی بیخ کنی کی۔ شریعتِ اسلامی میں اسیرانِ جنگ سے متعلق دو طرح کے احکام ہیں۔ ایک وہ جو ہر قیدی کے ساتھ برتے جا سکتے ہیں اور دراصل یہی احکام قیدیوں کے متعلق اسلام کا قاعدہ عامہ ہیں اور دوسرے وہ احکام ہیں جو خاص قیدیوں اور خاص حالات سے مخصوص ہیں۔ پہلی قسم کا حکم بلا معاوضہ آزادی اور تاوان (من و فداء) ہے جب کہ دوسری قسم کا حکم قتل و غلامی ہے۔ اسلام نے بعض ناگزیر اور وقتی حالات کے پیشِ نظر اگرچہ اس کو جائز قرار دیا ہے لیکن اس کو ترجیحی انداز سے ہر گز نہیں دیکھا۔ یہی وجہ ہے کہ غلامی کی جو اجازت شریعت میں موجود ہے اس پر عمل نہ کرنے سے کوئی گناہ گار نہیں ہوتا۔

اگر رسول اللہ ﷺ کے زمانے کی تمام جنگوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ

[۸۴] تیسرے جنیوا معاہدے کی دفعہ ایک سو (۱۰۰) میں جنگی قیدیوں کی سزائے موت کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

عہدِ نبوی میں پیش آنے والی جنگوں میں سے صرف ۱۹ جنگوں میں جنگی قیدی بنائے گئے۔ ان جنگی قیدیوں سے درج ذیل سلوک کیا گیا:

- سورۃ محمد کی آیت نمبر ۴ میں بلامعاوضہ آزادی اور تاوان برائے آزادی کو بیان کیا گیا ہے۔ اسلام کی تاریخِ جنگ میں یہ ایک عام قانون ہے جسے ہر دور میں اپنانے کی روش رہی ہے۔ پہلی مرتبہ یہ قانون غزوہ بدر کے موقع پر نازل ہوا جب پہلی اسلامی ریاست کے خلاف لڑتے ہوئے جنگی قیدی کے طور پر ستر مشرکین جنگجو اسلامی ریاست کے زیرِ حراست آئے۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے رفقاء سے مشورہ کیا، جس پر غالب اکثریت نے ان سے تاوان لینے کے حق میں اپنی رائے دی جبکہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی رائے اس کے برعکس تھی۔[۸۵]

- جنگ بدر کے بعد غزوہ بنی مصطلق میں بھی تقریباً سات سو مرد وزن کو بلا کسی شرط اور جرمانہ کے آزاد کر دیا۔ جنگ حنین کے موقع پر بھی چھ ہزار مرد وزن قیدیوں کو بلا کسی شرط و معاوضہ کے آزاد فرما دیا؛ بلکہ بعض قیدیوں کی آزادی کا معاوضہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسیر کنندگان کو خود ادا کیا، پھر اکثر قیدیوں کو خلعت اور انعام سے نواز کر رخصت کیا۔[۸۶]

- دورانِ قید، قیدیوں کی ہر بنیادی ضرورت کا خیال رکھا جاتا۔ قیدیوں کے ورثا سے رابطہ کرکے ان سے قیدیوں کی رہائی کے سلسلے میں پیش رفت کی جاتی۔

- دورانِ قید، ان قیدیوں کی اخلاقی تربیت کی جاتی۔ انہیں اسلام کی تعلیمات سے روشناس کروایا جاتا اور اگر کوئی قیدی اسلام قبول کرلیتا تو اسے آزاد کر دیا جاتا۔

---

[۸۵] حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق چونکہ مسلمان اس وقت سیاسی، معاشی اور جغرافیائی اعتبار سے مضبوط نہیں ہوئے تھے اور ضرورت اس امر کی تھی کہ مسلمان معاشی اور سیاسی اعتبار سے مضبوط ہو جائیں۔ مسلم بن حجاج القشیری، صحیح مسلم، کتاب الجہاد والسیر، بیروت، دار الصادر ۲۰۰۷، ج ۳، ص ۱۷

[۸۶] علامہ شبلی نعمانی، سلیمان ندوی، سیرت النبی، لاہور، حذیفہ اکیڈمی، ۲۰۰۰، ج ۱، ص ۳۶۸

- سرکاری سطح پر ان قیدیوں کے بدلے دشمن کی قید میں موجود مسلمان قیدیوں کا تبادلہ کر لیا جاتا۔
- ان قیدیوں کو وہی انسانی حقوق فراہم کئے جاتے تھے جن کی تلقین اسلام نے غلاموں اور زیردستوں سے متعلق کی تھی۔
- اگر کسی جنگی قیدی کو غلام بنایا جاتا تو اسے غلامی کے فوراً بعد مکاتبت کا حق بھی دیا جاتا تھا۔
- اس کے علاوہ دو جنگوں، غزوہ بدر اور سریہ فزارہ، کے جنگی قیدیوں کو احساناً یا فدیہ لے کر رہا کر دیا گیا۔ بدر کے قیدیوں سے یا تو رقم لی گئی یا پھر کچھ خدمات جیسے بچوں کو تعلیم وغیرہ کو بطور فدیہ قبول کیا گیا۔ بنو فزارہ کے قیدیوں کے بدلے مسلمان قیدیوں کا تبادلہ کروایا گیا۔
- تیرہ جنگوں کے قیدیوں کو احسان کے قانون کے تحت بلا معاوضہ آزاد کر دیا گیا۔ ان میں بڑی جنگیں مثلاً غزوہ بنو قینقاع، بنو نضیر، حدیبیہ اور فتح مکہ شامل ہیں۔ چھوٹی چھوٹی کاروائیوں میں بالعموم اسی قانون کے تحت قیدیوں کو بلا معاوضہ ہی رہا کر دیا گیا۔
- صرف چار جنگیں (غزوہ بنو مصطلق، غزوہ بنو قریظہ، غزوہ خیبر اور غزوہ حنین) ایسی تھیں جن میں جنگی قیدیوں کو غلام بنایا گیا۔ لیکن نبی کریم ﷺ کی ترغیب پر ان کے ساتھ نرمی کا معاملہ کیا گیا مثلاً غزوہ حنین میں چھ ہزار کے قریب جنگی قیدیوں کو گرفتار کیا گیا۔ نبی کریم ﷺ کے ترغیب دینے پر تمام مجاہدین نے اپنے اپنے حصے کے قیدیوں کو آزاد کر دیا اور اس کے ساتھ مال غنیمت کے طور پر ہاتھ آیا ہوا مال واسباب بھی ان کو لوٹا دیا گیا۔
- کچھ واقعات ایسے بھی ہیں کہ جن میں نبی کریم ﷺ کے پاس جنگی قیدی لائے گئے تو آپ ﷺ نے خود اپنے پاس سے ان کا فدیہ ادا کر کے انہیں آزادی عطا کی۔

جنگی قیدیوں سے متعلق اسلامی قانون اور طرزِ عمل کے جائزے اور دورِ حاضر میں رائج

بین الاقوامی قانون کی متعلقہ دفعات کے مطالعہ کے پیشِ نظر مندرجہ ذیل امور واقدامات قابل غور ہیں۔

## سفارشات

اس مقالہ کی روشنی میں بین الاقوامی مسلح تصادم کی صورت میں درج ذیل سفارشات کی جاتی ہیں:

- عہد حاضر کے بڑے مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ آداب القتال کا ہے۔ کئی مسلم ممالک اس وقت ایک بظاہر نہ ختم ہونے والے مسلح تصادم میں مبتلا ہیں۔ یہ مسلح تصادم خواہ مسلمانوں میں سے بعض افراد نے شروع کیا ہو یا ان پر غیروں کی جانب سے مسلط کیا گیا ہو، بہر حال ضرورت اس امر کی ہے کہ وہ آداب اور قواعد لوگوں کے لیے واضح کیے جائیں جن کی پابندی ان پر اسلامی شریعت اور موجودہ بین الاقوامی قانون کی رو سے لازم ہے۔

- جنگ سے متعلق اسلام کے ضابطہ اخلاق کا بنیادی محور انسانیت ہے۔ یہ قانون، جنگ کو بطور ایک امر اضطراری اور امر واقعی تو مان لیتا ہے مگر جنگ کے دوران انسانیت کے تقاضوں کا لحاظ رکھنا لازم قرار دیتا ہے مثال کے طور پر جنگ کے دوران فریق مخالف کے فوجی کو قتل کرنا اس قانون کے تحت ناجائز نہیں ہے لیکن اگر وہ ہتھیار ڈالے، یا زخمی ہو جائے، یا معذور ہو جائے، یا کسی اور وجہ سے جنگ سے باہر ہو جائے تو پھر اسے قتل کرنا ناجائز ہو جاتا ہے۔ اس بات کا شعور علمی و عسکری حلقوں میں کروایا جائے۔

- اس بات کی جانچ کی جائے کہ جنگی قیدی نے قید ہونے سے پہلے یا بعد میں کوئی ایسا جرم کیا ہو جس کی سزا موت ہو۔ اس آخری صورت میں بھی انسانیت کے تقاضوں کا لحاظ رکھا جائے۔ اس پر باقاعدہ مقدمہ چلایا جائے اور اسے صفائی کا پورا موقع دیا جائے۔

- اگر کسی خطے یا قوم پر جنگ مسلط کر دی گئی ہے تو اضطرار کی اس کیفیت میں بھی انسانیت کا خیال رکھتے ہوئے جنگ میں دشمن کو صرف اتنا ہی نقصان پہنچایا جائے جتنا اس کے حملے کی

پسپائی یا اس پر فتح کے حصول کے لیے ضروری ہو۔ گویا جنگ کا مقصد دشمن کا صفایا کرنا نہیں ہونا چاہیے۔ اس اصول کی بنیاد پر ایسے ہتھیاروں یا طریقوں کا استعمال بھی ناجائز ہو جاتا ہے جو بڑے پیمانے پر تباہی پھیلائیں یا غیر ضروری اذیت دیں، خواہ اس کا استعمال دشمن کے فوجیوں پر ہی ہو۔

- جنگی قیدیوں کے حقوق پر عمل درآمد کے لیے کاوشیں آج بھی جاری ہیں۔ جنگی قیدیوں کے ساتھ سلوک سے متعلق عالمی قوانین کے باوجود حکومتیں اور متحارب گروہ جنگی قیدیوں کے حقوق پامال کرتے ہیں۔ اس امر کی ضرورت ہے کہ عالمی سطح پر جنگی قیدیوں سے انسانیت پر مبنی سلوک کو یقینی بنانے کے لیے کوششیں جاری رکھی جائیں اور اسلام کے زریں اصولوں کو بار بار بطورِ مثال پیش کر کے انسانی توقیر کی سوچ کو عام کیا جائے۔

# جنگ زدہ علاقوں میں انسانی خدمات اور مقاصدِ شریعت: ایک تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر اشفاق احمد*

دینِ اسلام کی وہ تعلیمات جن کا بلا امتیازِ مذہب پوری انسانیت کے ساتھ تعلق ہے ان میں نفسِ انسانی کی تکریم، انسانی بھائی چارہ، کائناتِ ارضی کی آباد کاری، امن وامان اور ضرورت مند کی مدد کرنا وغیرہ شامل ہیں۔ یہ ایسی تعلیمات ہیں جن میں مذہب، رنگ ونسل اور علاقائیت کی کوئی تقسیم نہیں۔ اسلام کی رو سے بلا استثنا تمام اولادِ آدم مکرم ہے۔[۱] اسی طرح سورۃ الحجرات میں ایک عمومی انسانی بھائی چارے کی ترغیب دلاتے ہوئے کہا گیا کہ تمام انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے ایک مرد و عورت سے پیدا کیا ہے، قومی اور لسانی تقسیم محض تعارف کا ذریعہ ہے۔[۲]

اسلام نے باہم امن وسلامتی پر بہت زور دیا ہے۔ انسانی جان کا تحفظ شریعتِ اسلامیہ کے بنیادی مقاصد میں سے ہے۔ اس سلسلے میں کسی مذہب اور قومیت کی قید نہیں۔ قرآن کی رو سے کسی ایک انسان کا قتل ناحق پوری انسانیت کے قتل کے مترادف ہے۔ اسی طرح وہ تمام امور جن کا تعلق انسانیت کی بقا سے ہے ان کو اختیار کرنے کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ نیز معاشرے کے کمزور، بے بس اور

* ریسرچ آفیسر، اسلامی نظریاتی کونسل، اسلام آباد

[۱] الاسراء: ۷۰

[۲] الحجرات: ۱۳

لاچار افراد کی مدد اور خدمت کی جانب بھی قرآن وسنت میں مسلمانوں کو متوجہ کیا گیا ہے۔

## بحث کے بنیادی سوالات

جنگ یا آفت کی صورت میں اسلام کی رو سے مصیبت میں مبتلا ہر فرد بلکہ جانور تک کی مدد ضروری ہے۔ ناپسندیدہ ہونے کے باوجود جنگ ایک ایسی چیز ہے جو پوری دنیا میں کہیں نہ کہیں جاری رہتی ہے اور جنگ سے متاثرہ افراد میں دنیا کے مختلف خطوں سے تعلق رکھنے والے افراد شامل ہیں۔ ریڈ کراس اور ہلالِ احمر کی عالمی تحریک کی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے اور یہ جانتے ہوئے کہ اسلام بجائے خود ایک نظام اور طویل روایت کا حامل ہے، یہ بحث کرنا مفید ہو گا کہ کیا اسلام کی رو سے ایسا کوئی فنڈ قائم کیا جا سکتا ہے جس کا بنیادی مصرف جنگ زدہ علاقوں میں انسانی خدمات کی انجام دہی ہو؟ نیز کیا دشمن کے علاقے میں انسانی خدمات سرانجام دی جا سکتی ہیں جبکہ اس بات کا قوی احتمال ہو کہ دشمن کو اس سے فائدہ ہو گا؟ اسی طرح کیا مسلمانوں کے صدقات وزکوٰۃ ایسے فنڈ میں استعمال کیے جا سکتے ہیں جس کا مصرف بلا تفریق مذہب و ملت انسانیت کی خدمت ہو؟ نیز اسلام کی اخلاقیاتِ جنگ کی رُو سے غیر مقاتلین کے تحفظ اور سلامتی کو یقینی بنانے کے لیے کیا اقدامات ممکن ہیں؟

زیرِ نظر مقالے میں درج بالا اور ان سے متعلق امور کو مقاصدِ شریعت کی روشنی میں موضوعِ بحث بناتے ہوئے جنگ زدہ علاقوں میں انسانی خدمات کے حوالے سے اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کیا گیا ہے۔

## بلا تفریقِ مذہب انسانی خدمات اور مقاصد شریعت

شریعت کا ایک بنیادی مقصد تحفظِ جان ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک دوسرا مقصد روئے زمین پر انسان کی عمومی خلافت کے تصوّر کے تحت زمین کی آبادکاری بھی ہے،[۳] جس کی طرف سورہ ہود کی

---

[۳] البقرہ: ۳۰

آیت نمبر ۶۱ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ زمین کی آباد کاری اسی صورت میں ممکن ہے جب دنیا میں ایک انسانی برادری کا قیام عمل میں آئے۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے عقائد، قومیت اور زبان کے اختلاف کے باوجود انسانوں کے درمیان بڑی تعداد میں ایسی مشترک بنیادیں رکھی ہیں جن کی بنیاد پر انسانی اخوت قائم کی جاسکتی ہے۔ چند جنگوں کے استثناء کے ساتھ ازل سے انسانوں کا طرزِ عمل یہی ہے کہ وہ بالعموم انسانیت کی بنیادی اقدار پر متفق رہتے ہیں [۴]۔

## مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی تعلق کی اساس

اس موضوع کو آگے بڑھانے سے پہلے یہ نکتہ واضح کرنے کی بھی ضرورت ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی تعلق کی اساس کیا ہے؟ جنگ یا امن؟ اس سلسلے میں ایک نقطۂ نظر تو یہ ہے کہ مسلمانوں اور کافروں میں اصل تعلق جنگ کا ہے [۵] جبکہ دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اصل تعلق جنگ کا نہیں بلکہ امن کا ہے کیونکہ انسانیت کے متعلق شارع کا ایک اور مقصد عالمی نظامِ انصاف کا قیام بھی ہے کہ دنیا انصاف کے اصولوں پر چلے۔ جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان اصل تعلق امن کا ہے ان کا استدلال یہ ہے کہ جنگ کی مشروعیت کفر کی وجہ سے نہیں بلکہ ظلم کی وجہ سے ہے۔ [۶] جہاں ظلم ہوگا اسے روکنے کے لیے جنگ کا طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے؛ جبکہ عام حالات میں مسلمانوں کو یہ حکم ہے کہ تم نصیحت کرتے رہو کہ تم نصیحت کرنے والے ہی ہو، ان پر داروغہ نہیں ہو۔ [۷] اس سلسلے میں اس نوع کی دیگر آیات اور احادیث کی روشنی میں بظاہر یہی نقطۂ نظر مقاصد شریعت سے ہم آہنگ ہے اور معاصر اہل علم کی اکثریت بھی اسی کی قائل

---

[۴] جمال الدین عطیہ، نحو تفعیل مقاصد الشریعۃ، دہلی، ایفا پبلیکیشنز، ۲۰۱۰ء ص ۸۵

[۵] سرخسی، شمس الدین ابو سھل، المبسوط، بیروت، دار الفکر، ۲۰۰۰ء، ج ۱۰، ص ۲

[۶] برھان الدین علی بن ابو بکر رغینانی، الھدایۃ، بیروت، دار احیاء التراث العربی، س ن، ج ۲، ص ۳۷۸

[۷] الغاشیہ: ۲۲،۲۱

ہے۔[8] ڈاکٹر علال الفاسی کے نزدیک اس حقیقت سے بیشتر لوگ ناواقف ہیں کہ سب سے پہلے اسلام نے ہی جنگ کو ممنوع قرار دیا اور اس کے ضوابط و حدود کا تعین کیا۔[9]

عالمی امن کے لیے اس مقصدِ شریعت کا لازمی تقاضا ہے کہ عالمی اجتماعی امن کو فروغ دینے، مختلف معاملات میں تعاون کرنے کا کوئی ادارہ بنایا جائے جو بلا تفریقِ مذہب انسانی بنیادوں پر یہ کام کرے۔

## اسلام میں بلا تفریقِ مذہب انسانی خدمت کی بنیادیں

اگر انسانی خدمات کے حوالے سے اسلامی تعلیمات کو دیکھا جائے تو قرآن و سنت میں ایسی کئی نصوص ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں ''انسانیت'' کو نہایت اہم مقام حاصل ہے اور اسلام کی رو سے تمام اولادِ آدم برابر ہے۔ سورۃ الحجرات کے مطابق ایک مرد اور ایک عورت سے انسانوں کی تخلیق کے بعد اقوام و قبائل میں ان کی تقسیم کا مقصد ان کا باہم تعارف اور شناخت ہے جب کہ عزت کا معیار پرہیزگاری ہے۔[10] اسی طرح سورۃ الدھر میں اللہ تعالیٰ نے کمزوروں، بے کسوں، یتیموں اور قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کی ترغیب دی ہے۔[11] یہاں قیدیوں وغیرہ کے ساتھ جو حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے وہ دو وجہ سے بلا تفریقِ مذہب معلوم ہوتا ہے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ قرآن میں ''مسکین''، ''یتیم'' اور ''اسیر'' کے الفاظ بلا تحدید و تخصیص استعمال ہوئے ہیں۔ دوسرا یہ کہ عہد نبوی میں قیدی مشرکین میں سے ہی ہوتے تھے۔ مسلمان تو کوئی قیدی ہوتا ہی نہیں تھا۔ گویا صحابہ کرام کو، جو کہ آیت کریمہ کے اولین مخاطبین تھے، مشرکین قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا جا رہا تھا۔ ایسے ہی سورۃ الحج میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: **وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ**

---

[8] ڈاکٹر محمد یوسف قرضاوی، کیف نتعامل مع القرآن، دوحہ، جامعۃ قطر، ۱۹۹۷ء، ص ۱۰۹-۱۱۱

[9] علال الفاسی، مقاصد الشریعۃ الاسلامیۃ و مکارمھا، مغرب، دار الغرب الاسلامی، ۱۹۹۳ء، ص ۲۳۵-۲۳۱

[10] الحجرات: ۱۳

[11] الدھر: ۹-۸

تُفۡلِحُونَ [12] (بھلائی کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ) یہاں آیت میں خیر کا حکم دیا گیا ہے جو کہ تمام انسانوں سے متعلق ہے اور اس عمل کو آخرت میں فلاح کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ گویا اخروی فلاح کے لیے خدمت انسانیت بھی ایک ذریعہ ہے؛ اور یہ ایسا ذریعہ ہے جسے اختیار کرنے کا مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے۔

سورۃ الممتحنۃ میں غیر مقاتلین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے اور اس حکم میں لَا یَنۡهٰىکُمُ اللّٰہُ کے الفاظ کے ساتھ ایک اچھوتا انداز تعبیر اختیار کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے:

لَا یَنۡهٰىکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیۡنَ لَمۡ یُقَاتِلُوۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ وَلَمۡ یُخۡرِجُوۡکُمۡ مِّنۡ دِیَارِکُمۡ
أَنۡ تَبَرُّوۡهُمۡ وَتُقۡسِطُوۡۤا اِلَیۡهِمۡ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُقۡسِطِیۡنَ [13]

جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں جنگ نہیں کی اور نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ان کے ساتھ بھلائی اور انصاف کا سلوک کرنے سے خدا تم کو منع نہیں کرتا۔ خدا تو انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسانی خدمت ایک ایسی نیکی ہے جو دشمن اقوام کے غیر مقاتل افراد کے ساتھ بھی روا رکھنے کا حکم ہے۔

ایک حدیث میں ہے: إن الصدقة تطفئ غضب الرب [14] یعنی بے شک صدقہ رب کے غضب کو بجھاتا ہے۔ یہاں بھی صدقے کے مصرف میں مذہب کی کوئی تعیین نہیں کی گئی۔ اسی

[12] الحج: ۷۷

[13] الممتحنۃ: ۸

[14] ابن حبان، محمد بن حبان بن احمد، صحیح ابن حبان، بیروت، مؤسسۃ الرسالۃ، ۱۹۹۳ء، ج ۸، ص ۱۰۳۔ گو کہ استنادی اعتبار سے اس حدیث پر کلام کیا گیا ہے تاہم کثرت طرق کی وجہ سے اسے حسن کا درجہ حاصل ہے۔ دوسرا یہ کہ فضائل کے باب میں اہل علم کے ہاں اسے درجہ قبولیت حاصل ہے۔

ضمن میں مشہور تابعی صفوان بن سلیم[15] کا قصہ مشہور ہے جس میں انہوں نے ایک ضرورت مند کی مدد کرنے کے لیے اس کا مذہب یا نسب جاننے کی کوشش نہ کی اور جنت کی بشارت پائی:

جَاءَ رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ الشَّامِ فَقَالَ: دُلُّونِي عَلَى صَفْوَانَ بْنِ سُلَيْمٍ، فَإِنِّي رَأَيْتُهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ، قِيلَ لَهُ: بِأَيِّ شَيْءٍ؟ قَالَ: بِقَمِيصٍ كَسَاهُ إِنْسَانًا، فَسَأَلَ بَعْضُ إِخْوَانِ صَفْوَانَ صَفْوَانَ عَنْ قِصَّةِ الْقَمِيصِ، فَقَالَ: خَرَجْتُ مِنَ الْمَسْجِدِ فِي لَيْلَةٍ بَارِدَةٍ، وَإِذَا بِرَجُلٍ عَارٍ فَنَزَعْتُ قَمِيصِي فَكَسَوْتُهُ[16]

شام سے ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو جنت کی بشارت مل رہی ہے۔ ان سے کہا گیا کہ یہ انعام کیسے ملا؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ میں نے ایک انسان کو قمیص پہنائی تھی، اس کے بدلے میں۔ صفوان کے کسی بھائی نے ان سے پوچھا کہ قمیص کا کیا قصہ ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ میں ایک سرد رات میں مسجد سے جا رہا تھا کہ میں نے ایک بے لباس شخص کو دیکھا جو ٹھنڈ سے کانپ رہا تھا؛ میں نے اپنی قمیص اتاری اور اسے پہنا دی۔

ایک دوسری حدیث مبارکہ میں ہے:

على كلِّ مُسلِمٍ صدقةٌ، فإنْ لمْ يجِدْ فيعمَلُ بيدِهِ، فينفَعُ نفسَهُ و يتصدَّقُ، فإنْ لمْ يستطِعْ فيُعينُ ذا الحاجَةِ الملْهُوفَ، فإنْ لمْ يفعلْ فيأمُرُ بالخيرِ، فإنْ لمْ يفعلْ فيُمسِكُ عنِ الشرِّ، فإنَّهُ لهُ صدقةٌ[17]

---

[15] ابو عبد اللہ صفوان بن سلیم الزہری المدنی تابعین کے طبقہ ثالثہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کو کئی صحابہ کرام کی شاگردی کا شرف حاصل ہے جن میں حضرت عبد اللہ ابن عمر، حضرت انس اور حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہم بھی شامل ہیں۔ آپ کی ثقاہت پر ائمہ جرح و تعدیل کا اتفاق ہے۔ آپ نے ۱۳۲ ہجری میں وفات پائی۔ ملاحظہ ہو: ذہبی، شمس الدین محمد بن احمد، سیر اعلام النبلاء، بیروت، مؤسسۃ الرسالۃ، ۱۹۹۳، ص ۵: ۳۶۵

[16] ابو نعیم احمد بن عبد اللہ اصفہانی، حلیۃ الاولیاء و طبقات الاصفیاء، بیروت، دار الکتاب العربی، ۱۴۰۵ھ، ج ۳، ص ۱۶۱

[17] محمد بن اسماعیل البخاری، الجامع الصحیح للبخاری، قاہرہ، دار طوق النجاۃ، ۱۴۲۲ھ، ج ۲، حدیث ۵۲۴

ہر مسلمان پر صدقہ کرنا ضروری ہے۔ لوگوں نے پوچھا اے اللہ کے نبی! اگر کسی کے پاس کچھ نہ ہو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر اپنے ہاتھ سے کچھ کما کر خود کو بھی نفع پہنچائے اور صدقہ بھی کرے۔ لوگوں نے کہا اگر اس کی طاقت نہ ہو؟ فرمایا کہ پھر کسی حاجت مند فریادی کی مدد کرے۔ لوگوں نے کہا اگر اس کی بھی سکت نہ ہو۔ فرمایا پھر اچھی بات پر عمل کرے اور بری باتوں سے باز رہے۔ اس کا یہی صدقہ ہے۔

مندرجہ بالا حدیث مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ صدقہ محض مال خرچ کرنا ہی نہیں ہے بلکہ صدقہ کی بہت سی اقسام ہیں جو کہ ہر شخص پر اس کی حیثیت کے مطابق لازم ہیں۔ نیز اس حدیث مبارکہ میں بھی مدد کرنے کے لیے مذہب کی کوئی قید نہیں رکھی گئی بلکہ ہر بے کس کی مدد کرنے کی ترغیب دی جارہی ہے۔ اس سلسلے میں اس امر کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ کو پہلی وحی کے نزول کے بعد حضرت خدیجہؓ نے جن الفاظ کے ساتھ تسلی دی ان سے مسلم اہل علم ہمیشہ استدلال کرتے ہیں حالانکہ اس کا تعلق نبی کریم ﷺ کی قبل البعثت زندگی کے ساتھ ہے۔ چنانچہ حضرت خدیجہ کے الفاظ تھے:

كَلَّا، أَبْشِرْ، فَوَاللَّهِ لاَ يُخْزِيكَ اللَّهُ أَبَدًا، إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ، وَتَصْدُقُ الحَدِيثَ، وَتَحْمِلُ الكَلَّ، وَتَقْرِي الضَّيْفَ، وَتُعِينُ عَلَى نَوَائِبِ الحَقِّ[18]

ہر گز نہیں، آپ کے لیے خوشخبری ہے، اللہ کی قسم، اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا۔ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں، بوجھ اٹھاتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں اور لوگوں کے مصائب میں ان کی مدد کرتے ہیں۔

قبل از بعثت نبی کریم ﷺ جن ضرورت مند لوگوں کی مدد کرتے تھے وہ ظاہر ہے کہ غیر مسلم اور مشرک ہی تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بلا تفریق مذہب صرف انسانوں کی خدمت کرنا بھی اسلام میں ایک ایسا عمل شمار کیا جاتا جو دنیوی واخروی کامرانی کا ضامن ہو سکتا ہے۔ صحیح بخاری میں موجود روایت کی بنیاد پر ایک یہودی کے جنازے کی تعظیم سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام

---

[18] صحیح بخاری، ج۹، ص۲۹

میں احترام آدمیت کی کس حد تک تاکید ہے خواہ اس کا کسی بھی مذہب سے تعلق ہو اور وہ زندہ ہو یا مردہ۔[19]

خطبہ حجۃ الوداع میں بھی رسول اللہ ﷺ نے انسانی بھائی چارے کے فروغ پر زور دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

أَيُّهَا النَّاسُ أَلَا إِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ وَإِنَّ أَبَاكُمْ وَاحِدٌ، أَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى أَعْجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلَى عَرَبِيٍّ وَلَا لِأَحْمَرَ عَلَى أَسْوَدَ وَلَا أَسْوَدَ عَلَى أَحْمَرَ إِلَّا بِالتَّقْوَى[20]

اے لوگو! بے شک تمہارا رب ایک ہے۔ تمہارا باپ بھی ایک ہے۔ تم سب آدم سے ہو اور آدم مٹی سے ہیں۔ تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ قابل اکرام وہ شخص ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہو۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں اور نہ ہی کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی فضیلت حاصل ہے۔ نہ کسی کالے کو گورے پر اور نہ ہی کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی فضیلت حاصل ہے، سوائے تقویٰ کے۔

خلاصہ یہ کہ مذکورہ بالا تمام ہدایات عام حالات کے متعلق ہیں لیکن اگر خصوصی حالات ہوں جیسے کسی علاقے میں جنگ چھڑ جائے اور وہاں انسانی المیے جنم لے رہے ہوں یا کسی علاقے میں کوئی آفت سماوی یا ارضی آن پڑے تو ظاہر ہے ان احکامات کی تاکید میں اضافہ ہوگا اور بدرجہ اولیٰ ان پر عمل کرنا واجب ہوگا۔ اس سلسلے میں معاصر دنیا میں جنگ زدہ علاقوں میں انسانی خدمات کے حوالے سے جو طریقہ ہائے کار ممکن ہیں، ذیل میں مقاصد شریعت کی روشنی میں ان کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

---

[19] مرجع سابق، ج ۲، ص ۸۵

[20] ابو بکر احمد بن حسین، شعب الایمان، بیروت، دار الکتب العلمیۃ، ۱۴۱۰ھ، ج ۴، ص ۲۸۹

## الف۔ جنگ زدہ علاقوں میں انسانی خدمات کے لیے فنڈ کا قیام اور مقاصد شریعت

یہاں ایک سوال یہ ہے کہ کیا جنگ زدہ علاقوں میں انسانی خدمات کے لیے کوئی فنڈ قائم کیا جا سکتا ہے جس میں مسلمانوں کے عطیات، صدقات و زکوۃ وغیرہ جمع ہوں؟

اس سوال کو اگر مقاصد شریعت کے تناظر میں دیکھا جائے تو اس کا جواب ہمیں اثبات میں ملتا ہے کیونکہ انسانی جان کی حرمت اور اس کا تحفظ شریعت کے مقاصد میں سے ہے۔ اس لیے ایسا کوئی اجتماعی فنڈ یا وقف کا نظام قائم کرنا جس کا مقصد انسانی بنیادوں پر لوگوں کی مدد اور خدمت کرنا ہو، نہ صرف جائز ہے بلکہ ضروری ہے کہ مسلمانوں میں سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر ایسے ادارے موجود ہوں۔ اس موقف کو عہد خلافت راشدہ اور خیر القرون کی درج ذیل مثالوں سے بھی تقویت ملتی ہے:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک نصرانی کو دیکھا کہ وہ پیرانہ سالی کے باوجود جزیے کی رقم ادا کرنے کے لیے مسجد کے دروازے پر کھڑا بھیک مانگ رہا ہے۔ آپ نے اسے کہا کہ تم سے ہم نے انصاف نہیں کیا۔ تمہاری جوانی میں ہم نے تم سے جزیہ لیا اور بڑھاپے میں ہم نے تمہیں ضائع کیا۔ پھر آپ نے حکم دیا کہ اس کی ضروریات بیت المال سے پوری کی جائیں۔ آپ نے اس بزرگ نصرانی سے بھی جزیہ معاف کر دیا اور دیگر بوڑھوں سے بھی ساقط کر دیا۔[21] اس سلسلے میں آپ کا استدلال درج ذیل ارشاد باری تعالی سے تھا:

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ[22]

[21] یعقوب بن ابراہیم، کتاب الخراج، قاہرہ، الطبعۃ السلفیۃ، ۱۳۵۲ھ، ص ۱۲۶

[22] التوبہ: ۶۰

استدلال یہ تھا کہ آیت میں فقراء سے مراد مسلمان ہیں جبکہ مساکین سے مراد اہل کتاب کے مساکین ہیں۔[23]

حضرت عمر فاروقؓ کے ہی عہد میں حضرت خالد بن ولیدؓ نے اہل حیرہ سے جو معاہدہ کیا تھا اس میں بھی بزرگوں اور کام کرنے سے عاجز لوگوں کو جزیے سے مستثنیٰ کرتے ہوئے ان کی کفالت کی ذمہ داری بھی مسلمانوں کے اجتماعی مال یعنی بیت المال پر ڈالی گئی تھی۔اس میں ایک شق یہ بھی تھی:

وَجَعَلت لَهُمْ أيما شَيْخ ضعف عَنِ العَمَلِ اَوْ اصابَته آفَة مِنَ الْآفَاتِ اَوْ كَانَ غَنِيًّا فافتقر وَصَار اهل دِينه علَيْهِ طرحت جِزْيَته وعيل مِنْ بَيْتِ الْمَالِ الْمُسْلِمِين وَعَيَاله[24]

ان میں سے جو بوڑھا ہو جائے یا (کسی اور وجہ سے) کام کرنے سے عاجز آ جائے یا اس پر کوئی آفت آپڑے یا وہ پہلے مال دار ہو پھر غریب ہو جائے اور اس کے اہل دین اس پر صدقہ خیرات کرنے لگ جائیں تو اس سے جزیہ ساقط ہو جائے گا؛ اس کی اور اس کے اہل وعیال کی مسلمانوں کے بیت المال سے کفالت کی جائے گی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے زمانہ خلافت میں بصرہ کے گورنر عدی بن ارطاۃؒ کو ایک مکتوب میں لکھا تھا:

وَانْظُرْ مِنْ قَبُلِكَ مِنْ اَهْلِ الذِّمَّة قَدْ كَبرَتْ سِنّه وَضَعفت قُوَّته دولت عَنْهُ الْمَكَاسِب، فأجر عليه مِنْ بَيْتِ الْمَالِ الْمُسْلِمِيْن مَا يصلحه[25]

اپنی طرف سے اہل ذمہ کو دیکھو، ان میں سے جو بوڑھے ہو گئے ہیں اور ان کی ہمت جواب دے گئی ہے، ان کے کمائی کے ذرائع معدوم ہو گئے ہیں، ایسے لوگوں پر مسلمانوں کے بیت

[23] وہبۃ الزحیلی، آثار الحرب، دراسۃ فقہیۃ مقارنۃ، دمشق، دارالفکر، ۲۰۱۳ء، ص ۷۵۹

[24] قاضی ابو یوسف، کتاب الخراج، ص ۱۴۴

[25] ابو عبید قاسم بن عبدالسلام، کتاب الاموال، بیروت، دارالفکر، س ن، ۵۶

المال میں سے اس قدر خرچ کرو جس سے ان کی ضرورت پوری ہو جائے۔

یہاں کتاب الاموال میں ابو عبید نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس سلسلے میں حضرت عمر فاروقؓ کے طرز عمل سے استدلال کرتے ہوئے سطورِ بالا میں مذکور نصرانی والے واقعے سے بھی استدلال کیا تھا۔ گویا کہ حضرت عمرؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا سورۃ التوبہ کی آیت ۶۰ سے استدلال میں ایک ہی نقطۂ نظر تھا۔

معروف مقاصدی فقیہ ڈاکٹر جمال الدین عطیہ کے نزدیک ایک اجتماعی فنڈ یا تکافل کا نظام جس کا مقصد انسانیت کی خدمت ہو، ایک ایسی چیز ہے جس کی جڑیں ایمانی سرچشموں میں ہیں کیونکہ اسلام انسانی اخوت کا قائل ہے جس کی طرف کلکم لآدم اور انما المؤمنون اخوۃ سے اشارہ کیا گیا ہے۔[۲۶]

## ب۔ جنگی قیدیوں کی بنیادی انسانی ضروریات کو پورا کرنا

جنگ زدہ علاقوں میں ایک اور انسانی مسئلہ جو موجودہ دور میں تمام شورش زدہ علاقوں میں سامنے آتا ہے، وہ دوران جنگ قید کیے گئے لوگوں کی بنیادی انسانی ضروریات کو فراموش کرنا ہے۔ جنگی قیدیوں کے حقوق کے متعلق جنیوا معاہدے کی موجودگی کے باوجود رکن ممالک کی طرف سے انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں سامنے آتی رہتی ہیں۔ ایسے میں انسانی حقوق کی تنظیمیں اپنا کردار ادا کرتی ہیں اور اپنے طور پر قیدیوں کی مدد کی کوشش کرتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اسلام کی اس بارے میں تعلیم کیا ہے؟ جہاں تک قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کی بات ہے تو اسلام میں اس پر بہت زور دیا گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

اِسۡتَوۡصُوۡا بِالۡاَسَارٰی خَیۡرًا[۲۷]

---

[۲۶] ڈاکٹر جمال الدین عطیہ، مقاصد شریعت عصری تناظر میں، ص ۸۱

[۲۷] ابوالقاسم الطبرانی، المعجم الکبیر، موصل، مکتبۃ العلوم والحکم، ۱۹۸۳ء، ج ۲۲، ص ۳۹۳

''قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کرو''۔

اس سلسلے میں قرآن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قیدیوں کے ساتھ جو حسن سلوک کیا جائے اس میں ان سے کلمہ شکر کی بھی امید نہ رکھی جائے بلکہ مقصد اللہ کی مخلوق کے ساتھ حسن سلوک کے ذریعے اس کی رضامندی کو حاصل کرنا ہو۔[۲۸]

حضرت مصعب بن عمیر کے بھائی ابو عزیز بن عمیر بھی جنگ بدر میں قیدی بنائے گئے تھے وہ اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا تو میں انصار کے ایک گروہ میں بطورِ قیدی شامل تھا۔ وہ لوگ جب دوپہر یا رات کا کھانا کھانے لگتے تو خود کھجور کھاتے اور مجھے روٹی کھلاتے۔[۲۹]

جنگ بدر میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی قید ہوئے تھے۔ آپ جب قید ہوئے تو اس وقت آپ کے بدن پر قمیص نہیں تھی۔ غالباً دورانِ جنگ پھٹ گئی ہو گی۔ آپ طویل القامت تھے اس لیے سامنے کوئی ایسی قمیص بھی نہیں تھی جو آپ کو پہنائی جاتی۔ رسول اللہ ﷺ نے آپ کے قد کے مطابق قمیص تلاش کرنے کا حکم دیا۔ عبد اللہ ابن ابی کی قمیص آپ کے قد کے مناسب ملی تو وہی آپ کو پہنائی گئی کیونکہ وہ طویل القامت تھا۔[۳۰] اس واقعے سے فقہاء نے یہ بھی استدلال کیا ہے کہ قیدی کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنا واجب ہے۔[۳۱]

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں قیدیوں کی بنیادی ضروریات پوری کرنے کی کس قدر اہمیت ہے اور اس میں مذہب کی بھی کوئی تفریق نہیں ہے کیونکہ عہد نبوی سے ہمیں جن قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کے واقعات ملتے ہیں، وہ سب مشرک تھے۔ گویا اسلام میں انسانی خدمات کے

---

[۲۸] الدھر: ۹

[۲۹] طبرانی، المعجم الکبیر، ج ۲۲، ص ۳۹۳

[۳۰] ابن حجر العسقلانی، فتح الباری، مصر، المطبعۃ البھیۃ، ۱۳۵۲ھ، ج ۶، ص ۱۰۸

[۳۱] وہبہ زحیلی، آثار الحرب، ص ۴۸۱

حوالے سے اصل اہمیت انسانی بھائی چارے کو حاصل ہے۔

## ج۔ جنگی مقتولین کی تدفین

اسلام کی رو سے دوران جنگ قتل ہونے والے افراد کی نعشوں کا احترام بھی ضروری ہے۔ مقاتل دشمن کی نعش کی بے حرمتی بھی جائز نہیں۔ جب زندہ تھا تو دشمن تھا لیکن مرنے کے بعد اس کا احترام آدمیت والا حکم لوٹ آیا لہذا نعش کو دفن کیا جائے گا اور مقتول کا مثلہ کرنا یا سر کاٹنا جائز نہیں ہو گا۔ حضرت عقبہ بن عامر سے مروی ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں حضرت شرحبیل بن حسنہ اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنھما نے ایک رومی سردار کا سر کاٹ کر بھیجا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نہایت ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

أَتَحْمِلُونَ الْجِيفَ إِلَى مَدِينَةِ رَسُولِ اللهِ قُلْتُ يَا خليفة رسول الله إِنَّهُمْ يَفْعَلُونَ بِنَا هٰكَذَا قَالَ لَا تَحْمِلُوا إِلَيْنَا مِنْهُمْ شَيْئًا [۳۲]

کیا تم لاش کو مدینۃ الرسول لاتے ہو؟ میں نے عرض کی کہ یا خلیفۃ رسول اللہ، وہ بھی ہمارے ساتھ ایسا ہی کرتے ہیں، تو آپ نے فرمایا کہ تم ان میں سے ہمارے پاس کچھ نہ لایا کرو۔

سنن دار قطنی میں حضرت یعلیٰ بن مرہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ متعدد مرتبہ سفر کیا۔ آپ جب بھی کسی انسانی نعش کے پاس سے گزرتے، اسے دفن کرنے کا حکم دیتے۔ یہ سوال نہیں کرتے تھے کہ مسلمان ہے یا کافر۔ [۳۳]

---

[۳۲] ابو عبد الرحمان احمد بن شعیب النسائی، السنن الکبری، بیروت، مؤسسۃ الرسالۃ، ۲۰۰۱ء، ج۹، ص ۱۳۲۔ یہ مشہور واقعہ ہے۔ الفاظ کے فرق کے ساتھ کئی احادیث میں موجود ہے۔ یہاں جو الفاظ نقل کیے گئے ہیں وہ بنیادی طور پر المجموع شرح المھذب سے نقل کیے گئے ہیں۔ ملاحظہ ہو: نووی، ابو زکریا محی الدین، المجموع شرح المھذب، بیروت، دار الفکر، س ن، ج۱۹، ص ۳۱۴

[۳۳] الدار قطنی، علی بن عمر ابو الحسن، سنن الدار قطنی، بیروت، دار المعرفۃ، ۱۹۶۶ء، ج۴، ص ۱۱۶

اس سے معلوم ہوا کہ اگر جنگ کے دوران یا جنگ کے بعد دشمن اپنے مقتولین کی تدفین کیے بنا چھوڑ جائے تو مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ دشمن کے مقتولین کی تدفین کریں۔ نوویؒ نے نبی کریم ﷺ کے مذکورہ بالا تعامل سے استدلال کرتے ہوئے اس کے لیے وجوب کے الفاظ استعمال کیے ہیں[۳۴]۔ اس میں یہ ضروری نہیں کہ مسلمان فوجی ہی یہ کام کریں بلکہ دیگر لوگ بھی یہ کام کر سکتے ہیں۔ یہ ایک انسانی خدمت ہے جس میں عام لوگ اور اس مقصد کے لیے قائم کردہ رفاہی تنظیمیں اور افراد بھی حصہ لے سکتے ہیں۔

## د۔ دشمن کے علاقے میں غیر مقاتلین کی مدد کرنا:

اسلامی اخلاقیاتِ جنگ کی رو سے درج ذیل افراد غیر مقاتلین میں شمار ہوتے ہیں: خواتین، بچے، بوڑھے اور مذہبی پیشوا۔ تاہم اگر ان لوگوں کا جنگ میں کردار ہو تو ان کا حکم بھی مقاتلین والا ہوگا۔[۳۵]

اسی طرح جنگ کے دوران عوامی املاک اور بنیادی انسانی ضرورت کی اشیاء کو بلا ضرورت نقصان پہنچانا بھی جائز نہیں۔ اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ سے مروی متعدد احادیث میں ممانعت وارد ہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وصیت بھی مشہور ہے جس میں انہوں نے یزید بن ابو سفیان رضی اللہ عنہ کو دس چیزوں کی وصیت کی تھی کہ ان کا خیال رکھنا[۳۶]۔ یہ وصیت غیر مقاتلین کے حوالے سے اسلامی تعلیمات کا خلاصہ ہے۔

یہاں سوال یہ ہے کہ جب غیر مقاتلین کو قتل کرنا جائز نہیں تو اگر ایسی صورت بن جائے کہ جنگ طوالت اختیار کر لے اور رسد کے راستے بند ہو جائیں، کھانے پینے اور علاج معالجے کی اشیاء کی قلت ہو جائے تو ایسی صورت میں کیا انسانی بنیادوں پر غیر مقاتلین کی مدد کی گنجائش ہو گی یا دشمن

[۳۴] نووی، المجموع شرح المھذب، ج۵، ص ۲۸۱

[۳۵] علاء الدین ابو بکر بن مسعود، بدائع الصنائع، بیروت، دار الکتب العلمیہ، ۱۹۸۶ء، ج۷، ص ۱۰۱

[۳۶] امام مالک، الموطا، مصر، مطبعۃ الحلبی، ج۲، ص ۶

کی قوم کے افراد کو بھوکا مرنے کے لیے چھوڑ دیا جائے؟

اگر اس سلسلے میں مقاصد شریعت اور اسلامی اخلاقیاتِ جنگ کو دیکھا جائے تو اس بات کی بظاہر کوئی گنجائش نظر نہیں آتی کہ غیر مقاتلین کو بھوکا مرنے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔

جان کا تحفظ شریعت کے بنیادی مقاصد میں سے ہے۔ شیخ طاہر ابن عاشور کے نزدیک تحفظ جان سے شارع کی مراد یہ ہے کہ انسان کو مر کر بالکل ہلاک ہونے سے بچایا جائے، جسم کے بعض اعضاء کو تلف ہونے سے بچایا جائے، یعنی ان اجزاء کو جن کے تلف ہونے سے جان کی منفعت ختم ہو جائے۔[۳۷]

ڈاکٹر جمال الدین عطیہ کے نزدیک تحفظِ جان کے مقصد شریعت کی عصری معنویت یوں سامنے آتی ہے کہ جارحیت اور دوسرے پر زیادتی کو حرام قرار دیا جائے، امن فراہم کیا جائے، خودکشی کو روکا جائے، عمداً قتل کرنے والے سے قصاص اور غلطی سے قتل کرنے والے سے دیت لی جائے۔ اسی طرح جسم کو مطلوب کھانا پینا، لباس اور مکان فراہم کیا جائے، امراض، جلنے، ڈوبنے، کار حادثات وغیرہ سے بچایا جائے اور امراض کا علاج کروایا جائے۔[۳۸] اس سلسلے میں ظاہر ہے کہ مسلمان اور غیر مسلمان کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ جان کا تحفظ سب کا مطلوب ہے الا یہ کہ وہ مقاتل ہو اور مسلمانوں سے برسرِ پیکار ہو۔

اس حوالے سے اسلامی اخلاقیاتِ جنگ سے چند نظائر حسب ذیل ہیں:

ا۔ قرآن کریم میں رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِلْعَالَمِينَ[۳۹]

---

[۳۷] محمد بن طاہر ابن عاشور، مقاصد الشریعۃ الاسلامیۃ، قطر، وزارۃ الاوقاف، ۲۰۰۴ء، ص ۸۰

[۳۸] ڈاکٹر جمال الدین عطیہ، مقاصد شریعت عصری تناظر میں، ص ۷۰

[۳۹] الانبیاء: ۱۰۷

"آپ کو ہم نے تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے"۔

اس رحمت کا تقاضا ہے کہ جب انسانیت کو مدد کی ضرورت ہو تو ان کی مدد یہ دیکھے بغیر کی جائے کہ ان کا مذہب کیا ہے چنانچہ رسول اکرم ﷺ قبل از بعثت زندگی میں تمام لوگوں کی مدد کرتے تھے۔ رحمت کا یہ بھی تقاضا ہے کہ بغیر کسی شماتت اور نفرت و تعصب کے مریض کی مدد کی جائے، زخمی کی مرہم پٹی کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قیدیوں کو کپڑے پہنانے، ان کا علاج کرنے کا حکم دیا۔[40]

۲۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: ألا لا یجهزن علی جریح ولا یتبعن مدبر[41] (زخمی پر حملہ نہ کیا جائے، بھاگنے والے کا پیچھا نہ کیا جائے)۔ کتاب الام میں امام شافعی نے بھی لکھا ہے کہ زخمی کو قتل نہ کیا جائے[42]۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس اثر اور امام شافعی کے فتوے کا بھی تقاضا ہے کہ غیر مقاتل زخمیوں کو علاج کا موقع دیا جائے کیونکہ جب مقاتل زخمی کو قتل کرنے کی ممانعت ہے تو غیر مقاتل زخمی کو قتل کرنے یا مرنے کے لیے چھوڑ دینے کی اجازت کیسے ہو سکتی ہے!

ڈاکٹر وہبہ زحیلی اس اثر پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ زخمیوں اور دیگر لوگوں تک مدد پہنچانا ضروری ہے۔ اس کے بہت سے مادی فوائد بھی ہیں کہ غیر مقاتلین کو مدد پہنچانے کے لیے جنگ بندی عین ممکن ہے کہ مستقل جنگ بندی میں بدل جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ زخمیوں اور جنگ سے متاثرہ عام افراد کی مدد کرنے سے دو دشمنوں کی باہمی نفرتوں میں کچھ کمی آئے اور انتقام کا بھوت سر سے اتر جائے۔ دوسرا یہ تمام لوگ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ لوگوں کی زندگی کا تحفظ

---

[40] عبدالوھاب خلاف، السیاسۃ الشرعیۃ، دمشق، دار القلم، ۱۹۸۸ء، ص ۸۹

[41] ابو بکر ابن شیبہ، المصنف فی الاحادیث والآثار، ریاض، مکتبۃ الرشد، ۱۴۰۹ھ، ج ۷، ص ۵۳۸

[42] ابو عبداللہ محمد بن ادریس الشافعی، کتاب الام، مصر، المکتبۃ الامیریۃ، س ن، ج ۴، ص ۱۵۷

مقاصدِ شریعت میں سے ہے؛ کیونکہ شارع کا مقصد یہ ہے کہ حیات انسانی برقرار رہے نہ یہ کہ وہ برباد ہو۔[43]

## خلاصۂ کلام

درج بالا تفصیل سے یہ بات سامنے آئی کہ اسلام میں بلا تفریق انسانی خدمات کی نہ صرف ترغیب دی گئی ہے بلکہ یہ خدمات بعض اوقات واجب بھی ہو جاتی ہیں۔ان میں کوتاہی کرنا مقاصدِ شریعت کے خلاف ہے۔دوسری بات یہ کہ مسلمانوں کا غیر مسلموں کے ساتھ اصولی طور پر امن کا تعلق ہے۔اس امن کے تحفظ کا لازمی تقاضا ہے کہ عالمی اجتماعی امن کو فروغ دینے، مختلف معاملات میں تعاون کرنے کے لیے مسلمان دیگر اقوام سے آگے ہوں۔اس لیے مسلمانوں کی طرف سے جنگ زدہ علاقوں میں بالخصوص اور عام حالات میں بالعموم انسانی خدمات کے لیے ادارے اور فنڈز قائم کیے جانے چاہییں۔اس حوالے سے پہلے سے موجود اداروں کو مزید مضبوط کیا جائے تاکہ انسانی بھائی چارے کی فضا قائم رہے اور نفس انسانی کی کرامت اور اس کا تحفظ یقینی بنایا جا سکے۔

---

[43] زحیلی، آثار الحرب، ص ۵۱۳

# آراء و سوالات

**سوال:** یہ نکتہ مزید وضاحت طلب ہے کہ بین الاقوامی امدادی اداروں کے کام کرنے سے ایسے کون سے ریاستی قوانین ہیں جن کی خلاف ورزی کا امکان ہو سکتا ہے؟

**جواب از محمد رفیق شنواری:** اس حوالے سے عموماً انسدادِ دہشتگردی کے قوانین کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ مثلاً کسی ریاست میں ایک مسلح تنظیم کی کارروائیاں ریاستی بدامنی کا باعث بنتی ہیں اور ریاست ان پر قابو پانے کے لیے مختلف حربے استعمال کرتی ہے جن میں یہ بھی شامل ہے کہ ایسی تنظیم سے وابستہ افراد کو الگ تھلگ اور سہولیات سے محروم کیا جائے۔ ایسے میں رفاہی و امدادی تنظیموں کی جانب سے کیا جانے والا کام ایسی تنظیم کو ریلیف فراہم کرتا ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ امر کسی طرح بھی ریاستی اداروں کے لیے خوش گوار نہیں ہوتا۔

**سوال:** جنگی قیدیوں سے متعلق مقالے میں سورۃ انفال کی آیت ۶۷ کا حوالہ دیا اور گفتگو کے اختتام پر کہا گیا کہ حضور اکرم ﷺ کو قیدیوں کے قتل کا حکم نہیں دیا گیا، جب کہ سیرت و تاریخ میں ہمیں ایسے واقعات بھی ملتے ہیں جن میں آپؐ نے بعض افراد کے قتل کا حکم دیا تھا۔ وضاحت فرمادیں۔

**جواب از ڈاکٹر طارق رمضان:** حضور اکرم ﷺ کو میدانِ جنگ میں قتل کا حکم دیا گیا تھا مگر میرا مقالہ جنگی قیدیوں کے حوالے سے ہے اور جنگی قیدیوں کو قتل کرنے کا ذکر قرآن میں کہیں نہیں ملتا۔ سورۃ انفال کی جس آیت کا حوالہ دیا گیا اس میں دو اسلوب مذکور ہیں:

۱۔ احسان کرتے ہوئے انہیں آزاد کر دیا جائے؛ یا

۲۔ تاوانِ جنگ وصول کر لیا جائے۔

**اضافہ از ڈاکٹر ضیاء اللہ رحمانی:** جنگی قیدیوں کے حوالے سے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اسلامی قوانین کے دیگر مصادر میں سے ایک مصدر معاہدہ بھی ہے۔ایسے میں یہ ضروری ہے کہ مسلم ممالک ایسے کسی معاہدے کا حصہ تو نہ بنیں جس میں حلال کو حرام یا حرام کو حلال ٹھہرایا جائے لیکن دیگر جس بھی معاہدے میں ضروری اور مناسب ہو شرکت کی جائے،اس کی تشکیل و تشریح میں کردار ادا کیا جائے اور اس کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا جائے۔ نیز قیدیوں کے حوالے سے اسلام کا کوئی آفاقی حکم نہیں تھا بلکہ حالات و مواقع کے لحاظ سے ان سے سلوک روا رکھا جاتا تھا۔اِس وقت امتِ مسلمہ بین الاقوامی معاہدات کا حصہ ہے اور اسی کے مطابق قوانین نافذ کیے جانے چاہئیں۔ نیز جب جنگی قیدیوں کے حوالے سے (یا دیگر کسی حوالے سے تجزیہ و سفارشات در پیش ہوں) تو زیرِ غور قوانین کے مدّمقابل پر اطلاق کے علاوہ یہ بھی سوچنا چاہیے کہ ان قوانین کا اطلاق خود آپ پر بھی ہو گا۔

**سوال:** آئی سی آر سی کے بنیادی مقصد کے پیشِ نظر افغانستان اور برما میں انسانیت کے خلاف ہونے والے افعال پر اس تحریک کا کیا کردار رہا ہے؟

**جواب از ڈاکٹر ضیاء اللہ رحمانی:** یہ واضح رہنا چاہیے کہ اگرچہ آئی سی آر سی بالعموم جنگی حالات میں کام کرتی ہے لیکن جنگ بندی یا سیاسی عمل میں کسی طرح کی مداخلت آئی سی آر سی کے دائرۂ عمل میں نہیں ہے۔یہ ریاستوں یا اقوامِ متحدہ کی ذمہ داری ہے۔ غیر جانبداری کا لفظ جتنا آسان ہے، اس پر عمل اتنا ہی مشکل ہے۔ آئی سی آر سی کے اس اصول کے پیشِ نظر اس کے اہلکاروں اور رضاکاروں کے پاس ذاتی دفاع کے لیے بھی اسلحہ نہیں ہوتا۔اس بات کو مثال سے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ دینی مدارس کی ذمہ داری دینی علوم کی تدریس اور اسلامی قوانین کی تعلیم دینا ہے، انہیں نافذ کرنا نہیں ہے۔اسی طرح آئی سی آر سی کے بھی کچھ مخصوص اور محدود مقاصد ہیں۔ان کے نفاذ کی

ذمہ داری ریاست پر عائد ہوتی ہے۔ مزید برآں، جن ممالک کا آپ نے ذکر کیا، ان میں آئی سی آر سی کے کام کی کچھ تفصیل آپ کو واضح طور پر تحریک کی ویب سائٹ سے مل جائے گی۔

## صدارتی کلمات

### مولانا محمد یٰسین ظفر

اِس نشست کے تینوں مقالہ جات میں اہم پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔

جنگی قیدیوں سے متعلق مقالہ اسلام کے زرّیں اصولوں کو نمایاں کرتا ہے۔ اس سلسلے میں میں یہ اضافہ کرنا چاہوں گا کہ غزوہ بنی مصطلق کے موقع پر بڑی مقدار میں مالِ غنیمت اور متعدد قیدی ہاتھ آئے۔ اس موقع پر اس قبیلہ کے سردار حارث بن ابی ضرار کی بیٹی جویریہ بھی ایک مسلمان کی قیدی بنی تھیں۔ وہ فدیہ دے کر آزاد ہونا چاہتی تھیں لیکن ان کے پاس دینے کے لیے کچھ رقم نہ تھی۔ اس صورتِ حال میں وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں، اپنا تعارف کروایا اور ان سے فدیہ دینے کے سلسلے میں مدد طلب کی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے مرتبے اور اعلیٰ کردار کی قدر کرتے ہوئے ان سے مشورے کے بعد ان کا فدیہ ادا کر کے انہیں آزاد کیا اور ان سے شادی کر لی۔ اس سے جو قرابت داری پیدا ہوئی اس کے پیشِ نظر مسلمانوں نے اپنے قیدیوں کو فدیہ لیے بغیر ہی رہا کر دیا اور اس حسنِ سلوک کی وجہ سے یہ تمام افراد مسلمان ہو کر اپنے گھروں کو واپس لوٹے۔ یہ قیدیوں سے حسنِ سلوک کا ایک خوب صورت عملی نمونہ ہے۔

اپنے وسائل کو قیدیوں کی فلاح کے لیے استعمال کرنے سے متعلق تجویز جس انداز میں پیش کی گئی ہے اس میں اہم مباحث کا احاطہ ہو گیا ہے۔ بالخصوص بیت المال کے دو حصوں کی نشاندہی بہت اہم ہے جن کا مقصد بنیادی طور پر یہ ہے کہ مسلم ریاست کے زیرِ سایہ موجود کوئی بھی فرد اپنے حقوق سے محروم نہ رہے۔ بہر حال فیصلوں اور پالیسی کی تشکیل میں مقاصدِ شریعت کو ملحوظ رکھنا

ایک مسلم ریاست کے لیے نہایت ضروری ہے۔

اسلام اور بین الاقوامی قوانین کے مابین ایک علمی اور مثبت تقابل اور استفادہ کی فضا قائم کرنے کے لیے اہلِ علم کی تفصیلی نشستوں کا اہتمام تسلسل سے کیا جانا چاہیے تاکہ ہر پہلو کو تفصیل اور وضاحت سے سمجھا اور بیان کیا جاسکے۔

# انسانی خدمت میں درپیش رکاوٹیں

# اور مذہب کا مطلوب کردار

# انسانی خدمت میں درپیش رکاوٹیں اور مذہب کا مطلوب کردار

ڈاکٹر سید محسن نقوی، مولانا ڈاکٹر احمد بنوری، شجاع الدین شیخ

یہ ایک فطری امر ہے کہ ہر کام اور بالخصوص بھلے کام میں اچھے تجربات کے ساتھ ساتھ کچھ تلخ تجربات بھی رونما ہوتے ہیں جو تکلیف اور پریشانی کا باعث بننے کے علاوہ اس کام میں دشواری کا سبب بنتے ہیں۔ یہی معاملہ انسانی خدمت کا بھی ہے۔ اس کارِ خیر میں رکاوٹوں کا سامنا تو روزِ اول سے تھا لیکن گزشتہ چند سالوں سے ان میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے جن میں اندرونی اور بیرونی دونوں طرح کے عناصر شامل ہیں۔ جیسا کہ خدمتِ انسانیت اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے ایک ہے اور اسلام میں بلا تفریقِ مذہب و رنگ و نسل خدمت کرنے کی ترغیب دینے کے ساتھ ساتھ اس فریضہ کی راہ میں حائل رکاوٹوں سے نبرد آزما ہونے کے اصول بھی فراہم کیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں دیگر امورِ زندگی کی طرح خدمت کے میدان میں بھی اسلام کے حقیقی پیروکاروں کا مثالی کردار رہا ہے۔ کانفرنس کی اس نشست میں معروف اہلِ علم و دانش نے عصرِ حاضر میں کارِ خدمت میں حائل رکاوٹیں اور ان کو دور کرنے کے لیے اسلام کے مطلوبہ کردار پر بات کی، جو ذیل میں پیش کی جا رہی ہے۔

## ڈاکٹر سید محسن نقوی*

چند سال قبل تک پاکستانی معاشرے میں مسلکی و گروہی تقسیم اس قدر گہری نہ تھی۔ تعاون چاہنے والے بلا جھجک کسی بھی صاحبِ حیثیت سے رجوع کرتے اور بیشتر صورتوں میں جس سے سوال کیا جاتا وہ سائل کی ممکن مدد کر دیتا تھا، یہ جانے یا سوچے بغیر کہ اس کے ذاتی نظریات کیا ہیں یا وابستگی کس مسلک یا گروہ سے ہے۔ اب معاملہ یہ ہے کہ مدد مانگنے اور مدد کرنے کا دائرۂ کار بھی تقسیم ہو چکا ہے۔ مختلف مسالک اور گروہوں کی تنظیمیں قائم ہو چکی ہیں اور ان میں سے کئی اپنے ہی وابستگان یا ہم خیالوں کی خدمت کو ترجیح دیتی ہیں۔ سائل کسی دیگر ادارے یا فرد کے پاس چلا بھی جائے تو یہ سوال پوچھا جاتا ہے کہ خود ان کے مسلک کی تنظیم مدد کو آگے کیوں نہیں بڑھتی۔ انسانوں اور انسانی خدمت میں مسلک، مذہب اور زبان کی بنیاد پر امتیازات بڑھ گئے ہیں۔ یہ امتیازات پہلے بھی موجود تھے لیکن ان کا دائرہ اس قدر وسیع نہ تھا اور نہ ہی ان کی سرحدیں اس قدر مضبوط تھیں۔ افراد کے بارے میں ایک رائے ان کے بارے میں جانتے ہی فوراً طے کر لی جاتی ہے اور اس تعصب نے مختلف اقوام میں تشدد اور اختلاف کو جنم دیا ہے۔ اس لیے یہ واضح رہنا چاہیے کہ کسی بھی قسم کے فلاحی کام میں اگر امتیاز موجود ہے اور اس کی ترجیحات کسی بھی درجے میں تشدد کے فروغ کا باعث بن رہی ہیں تو چاہے اس تنظیم کے بیان کردہ اہداف و مقاصد کتنے ہی خوش نما ہوں اور اس کا دائرۂ عمل کتنا ہی پھیلا ہوا ہو، اسے محترم نہیں سمجھا جا سکتا۔

اگر انسانوں میں غیر ضروری امتیازات قائم ہو جائیں تو انسانی خدمت میں اس سے بڑھ کر کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ چونکہ افرادِ معاشرہ کی ذہن سازی میں مذہبی طبقے کا بڑا حصہ ہے اور لوگ علماء کی باتوں کو اس حد تک معتبر جانتے ہیں کہ ان کی تصدیق یا تحقیق کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے، اس لیے اہلِ دین پر ایک بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اہلِ مذہب کی طرف سے اور ان کی مسند و منبر سے یہ پیغام عوام تک پہنچنا چاہیے کہ مذہب انسانوں کو باہم جوڑنے کے لیے آیا

*معروف مفکر اور عالمِ دین

ہے۔ کسی بھی مسلک یا کسی بھی عالم کی تاویل، تشریح یا رائے، یا کسی مسلک کا نظریہ اسلام کی حتمی اور آخری ترجمانی نہیں ہے۔ یہ وہی بات ہے جو مختلف مسالک کی نمائندہ کتب میں موجود ہے۔ اسلام کے آفاقی پیغام اور عام افادیت کا تقاضا ہے کہ امتیازات کے خاتمے کی جانب یہ سفر فوراً شروع کیا جائے اور سب سے پہلے باہم امتیازات کو کم کرنے کی کوشش کی جائے۔

اسلام کا آخری و جامع دستور ''هُدًى لِّلنَّاسِ'' ہے، ہمارا رب ''رب العالمین'' اور ہمارا رسول ''رحمت للعالمین'' ہے۔ ہماری شناخت کے یہی تین بنیادی اجزاء ہیں کہ ہم سب ایک اللہ کی مخلوق ہیں، رحمت للعالمین کی امت ہیں اور ھدی للناس کے پیروکار ہیں۔ ہمیں دی جانے والی اس وسیع اور اعلیٰ شناخت کا تقاضا ہے کہ ہم ہر ایک کے لیے خیر اور بھلائی کی جدّوجہد کریں۔ اسلام کی اس جامعیت کی متعدد مثالیں سیرتِ طیبہ سے ملتی ہیں۔ مثلاً میثاقِ مدینہ میں مدینہ اور گردونواح کے تمام گروہ شامل تھے اور سب کے متفقہ فیصلے نے ہی حضور ﷺ کو مدینہ کا حاکم بنایا۔ اسی طرح حضور نبی اکرمؐ دنیا کے کسی دستور کے تحت فتحِ مکہ کے موقع پر عام معافی دینے کے پابند نہ تھے۔ اگر آپؐ بدلہ لینے کا فیصلہ فرماتے تو دنیا کا کوئی قانون یہ نہ کہتا کہ آپؐ نے غلط کیا۔ خود پر اور اپنے ساتھیوں پر ہونے والے تمام مظالم کے باوجود آپ علیہ السلام نے اسلام کی رُوح کا اظہار فرمایا اور اعلان فرمایا لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ، یعنی آج تم پر کوئی پکڑ نہیں ہے۔

معلوم ہوا کہ محبّتِ کُل (inclusivity) ہی ہماری اصل شناخت ہے۔ پوری انسانیت ہم سے براہِ راست جڑی ہوئی ہے۔ خود اسلام کا دائرہ ہی اس قدر وسیع ہے کہ اگر کسی کے اسلام سے انحراف پر دلالت کرتی ہوئی ۹۹ شقیں موجود ہوں اور اسلام سے وابستگی کی ایک شق یعنی کلمۂ طیبہ موجود ہو تو اس ایک شق کے حامل انسان کو مسلمان مانا جائے گا۔ بد قسمتی سے آج صورتِ حال اس کے برعکس ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم اپنا تجزیہ کریں۔ ہم جس دوئی کا شکار ہیں وہی معاشرے کے ارتقاء، بقا اور سالمیت کی راہ میں حائل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے معیارات و ترجیحات کے زاویے بدلتے رہتے ہیں۔ اور یہی تعصبات، خدمتِ انسانیت کی راہ میں حائل ایک

بڑی رکاوٹ ہیں۔

اگر ہم مذکورہ بالا تین ستونوں پر ایمان رکھنے والے مسلمان بن جائیں تو ہمارے ذہنوں میں کسی قسم کا کوئی امتیاز نہیں رہے گا۔اور ہر ضرورت مند کی مدد اس کی کیفیت اور ضرورت کی نوعیت کے مطابق کر سکیں گے۔ مصارفِ زکوٰۃ میں مسافر یا ابن السبیل کی مثال اس سلسلے میں اہم ہے کہ ایک فرد خود اپنے ملک میں چاہے مالدار ہی ہو مگر وقت و حالت کے مطابق اس کی مدد کی جائے گی۔اس لیے انسانی خدمت کی شکلیں اور پیمانے تو بدل سکتے ہیں لیکن اس کی جامعیت ہمیشہ برقرار رہے گی۔

عالمی سطح پر مسلمانوں کے نمایاں کردار کے احیا میں جو خلا نظر آتا ہے اس کی ایک بڑی وجہ علم کے میدان میں پسماندگی ہے۔ اسلام نے علم، تفکر اور تدبر پر جس قدر زور دیا ہے اس کا تقاضا تھا کہ مسلمان علمی میدان میں قیادت کے منصب پر فائز ہوتے، مگر معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ہم علم کو تین مراحل میں تقسیم کرتے ہیں، یعنی علم کا حصول، علم کا استعمال اور علم کی تخلیق۔ مسلم دنیا کے پاس نہ تو وسائل کی کمی ہے اور نہ صلاحیت کی۔ تاہم ان وسائل اور صلاحیت کو درست سمت دینے کی ضرورت ہے۔ قوموں کو ترقی اور امامت علم کی بنیاد پر حاصل ہوتی ہے۔ علم کی تخلیق کرنے والی اقوام زندہ رہتی ہیں اور یہی انسانی خدمت میں سب سے بڑا حصہ ہے۔ اگر ہم اس میں کامیاب ہو گئے تو انسانی خدمت سمیت ہر میدان میں ہم اسلام کی بنیاد پر عالمگیر اسلامی اقدار رائج کر سکیں گے۔

## مولانا ڈاکٹر احمد بنوری*

انسانی خدمت میں درپیش رکاوٹوں اور مذہب کا مطلوبہ کردار پر گفتگو سے پہلے ہمیں اس مزاحمت پر بات کرنے کی ضرورت ہے جو اُس وقت پیش آتی ہے جب ہمیں مغرب کی طرف سے ایسے کسی کارِ خیر کی ترغیب اور اس پر غور و فکر کی دعوت دی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں تین طرز کی مزاحمت نظر آتی ہے۔

* جامعہ علوم اسلامیہ، بنوری ٹاؤن کراچی

۱۔ مغرب سے سیاسی چپقلش کی ایک طویل تاریخ جو براہِ راست مزاحمت کی ایک وجہ ہے۔

۲۔ دنیا بھر میں جنگ و جدل کے حوالے سے مغرب کے انداز اور طرزِ عمل کے پیشِ نظر مغرب کی جانب سے انسانی حقوق کی بات انہونی معلوم ہوتی ہے۔ یہ ایسا غیر متوازن رویہ ہے جس میں انسان اور انسانی حقوق کی پامالی روا ہے لیکن اس بات کی فکر کی جاتی ہے کہ چڑیا گھر میں کوئی جانور نہ مر جائے۔

۳۔ مغرب کے تخلیقِ انسان کے نظریے کی بنا پر یہ سوچ ذہن میں آتی ہے کہ مغرب میں انسانی خدمت کس جہت سے کی جاتی ہے، یہ ایک فکری مزاحمت ہے۔

مغرب نے ان موضوعات اور ان سے جُڑے سوالات کو اپنی دانش گاہوں میں مباحثے اور گفتگو کا موضوع بنایا ہے۔ ہمارے ہاں بھی یہ موضوعات تعلیم و تعلم اور علمی مباحثے میں شامل ہونے چاہییں۔

مغرب سے متعلق ہمیں یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ مختلف میدانوں میں آج انہی کی مصنوعات و ایجادات کا ہم استعمال کر رہے ہیں۔ ہمیں مغرب کی سائنسی ترقی کا اعتراف کرنے میں بخل سے کام نہیں لینا چاہیے۔ حدیث مبارکہ کا مفہوم ہے:

مَنۡ لَمۡ یَشۡکُرِ النَّاس لَمۡ یَشۡکر الله[1]

ایک مذہبی انسان کی حیثیت سے میں مغرب سے علمی و فکری مزاحمت کا قائل بھی ہوں اور اپنا فکری نظریہ بھی رکھتا ہوں۔ تصورِ مخلوق جو خدا نے دیا ہے وہ اَلخَلۡقُ عَیَال اللہ ہے۔ کسی مصنف نے کیا خوب کہا ہے کہ جس کا تصورِ مخلوق کمزور ہے اس کا تصورِ خدا کمزور ہے۔ لہٰذا مخلوق کی تعریف میں خود خالق کی تعریف شامل ہے۔ اسلام کے تصورِ مخلوق میں جانبداری نہیں ہے۔ اور یہی بات اس ارشادِ ربانی میں نظر آتی ہے: خَلَقَکُمۡ مِنۡ نَّفۡس وَّاحِدَۃ کہ اس اللہ نے تم سب کو ایک جان

---

[1] جس نے لوگوں کا شکریہ ادا نہ کیا اس نے اللہ کا شکر ادا کرنے میں کوتاہی کی۔

سے پیدا فرمایا ہے۔

مذہب اپنی اساس میں دنیا کی بجائے آخرت کو موضوع بناتا ہے اور اسی کو اصل زندگی یا حاصلِ زندگی قرار دیتے ہوئے کہتا ہے لَهِيَ الْحَيَوَان۔[2] مغربی اور لادینی فکر کو اعتراض ہے کہ مذہب کی صورت میں مسلمانوں کو دنیاوی امور بھلانے کے لیے ایک پناہ گاہ دی گئی ہے۔ گویا اس طرزِ فکر کے مطابق آخرت کو پیشِ نظر رکھنے کا لازمی مطلب دنیاوی زندگی اور اس کے امور سے لاپروائی ہے۔ حقیقت اس کے برعکس ہے اور اسی کا ایک پہلو یہ ہے کہ انسان کی خدمت اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے ایک ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مذہبی انسان دنیا میں بے فکر بیٹھا ہوگا اور اس کے پاس لوگوں کو سنانے کے لیے مذہبی لوریاں اور جنت کے بہلاوے ہوں گے۔ میرا یہ یقین ہے کہ مجھے خدا کی ہمیشہ رہنے والی جنت میں جانا ہے اور میرے سب اعمال اسی کے لیے ہیں اور یہی میرے پیشِ نظر ہے۔ اسے آپ میری دعوت کہہ لیں۔ اس سلسلے میں ہم سے یہ غلطی ہوئی ہے کہ ہم مذہب کے اصل مخاطب کو بھول چکے ہیں۔

اگر آپ تصورِ انسان کو غلط سمجھیں گے تو مذہب کا تصور بھی غلط ہوگا۔ جیسا کہ انسان کے اندر درست اور غلط یا مفید اور مضر کو پرکھنے کے لیے صلاحیت پہلے سے ہے۔ قرآن مجید میں ہے: فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوٰهَا[3] یعنی خالق نے انسان میں بھلائی اور برائی کا مادہ رکھا ہے۔ اسی طرح انسان کے اندر تصورِ بھوک اور بھوک سے دوری کی صلاحیت پہلے سے موجود ہے۔ اسی طرح اگر کسی کے سامنے عدل کی بات کی جائے تو مخاطب کے ذہن میں یقیناً عدل کا تصور بھی ہوگا۔ لہٰذا مذہب کی اساس بنیادی انسانی تصورات پر ہی ہے۔ اسی طرح صادق وامین کا لقب حضور کو ان لوگوں نے دیا جن کے ظلم اور غضب کی داستانیں پورے عالم میں مشہور تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر صادق وامین کا تصور موجود تھا۔ قرآن پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ شرک جرمِ عظیم ہے اور اس

[2] العنکبوت: ۶۴

[3] الشمس: ۸

کے بعد انسانوں کے حقوق کو متصلاً بیان فرمایا گیا ہے: كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ۔[4]

معلوم ہوا کہ شرک جیسا بڑا جرم اپنی اساس میں انسانوں کے حوالے سے چھوٹے چھوٹے جرائم رکھتا ہے۔ جب آپ لوگوں کو حق نہیں دیں گے تو رفتہ رفتہ خدا کے حقوق کی ادائیگی بھی ترک کر دیں گے۔ یہی دین کا جامع تصور ہے۔ اس سلسلے میں میں اکثر یہ کہتا ہوں کہ آپ سامنے والے کو جہنم کی آگ سے بچانے جا رہے ہیں جبکہ اس کا اپنا گھر جل رہا ہے۔ ایسی صورت میں پہلے اس کے گھر کی آگ کو بجھانا ضروری ہے۔ یہی مثال انسانوں اور خدا کے حقوق کی ہے۔

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ فَكُّ رَقَبَةٍ أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ[5]

مندرجہ بالا آیت میں رقبہ کی قید لگانے کا مقصد صفتِ انسانیت کی وضاحت کرنا ہے۔ ان سب باتوں کا مقصد یہی ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ آخرت ہی مذہب کی بنیادی اساس ہے اور مذہب بنیادی اخلاقیات پر ہی اعلیٰ اخلاق کو رقم کرتا ہے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ مسلمانوں کا تصورِ انسانیت خلافت ہے۔ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ خدا کی مخلوق کے ساتھ رزق اور دیگر معاملات میں اگر ہم خدا کے پرتو نہیں بنیں گے تو اس سے ہمارا سیاسی تصور بھی کمزور ہوگا۔ اسی طرح حاکمِ وقت کو چاہیے کہ وہ اعلان کرے کہ میری حکومت میں آنے والا ہر شخص چاہے وہ کسی بھی مسلک و مذہب سے ہو، اس کے جان، مال اور وقت کی حفاظت میری ذمہ داری ہے۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ سَيِّدُ الْقَوْمِ فِي السفرِ خَادِمُهم[6] معلوم ہوا کہ ایک مسلمان حاکم کی بنیادی خصوصیت یہ ہوگی کہ وہ قوم کا خادم ہوگا۔ بد قسمتی سے ہمارا معاملہ اس کے برعکس ہے۔

---

[4] الفجر: ۱۷، ۱۸

[5] البلد: ۱۳، ۱۴

[6] محمد بن عبداللہ خطیب تبریزی، مشکوٰۃ المصابیح، ح ۳۹۲۵

اس سلسلے میں ایک اور رکاوٹ وہ تصور ہے جو انسانوں میں نیک و بد، کافر و مومن، فاسق و مطیع میں تفریق کرتا ہے۔ ھُوَ الَّذِی خَلَقَکُمْ کَافِرٌ وَّمِنْکُمْ مُّوٴمِنٌ[7] جیسی نصوص کا انکار ممکن نہیں مگر حتمی فیصلے کا اختیار صرف خدا کو ہے اور اللہ فرماتا ہے: اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ[8]

لہٰذا مناسب ہوگا کہ یہ فیصلہ روزِ قیامت پر چھوڑ دیا جائے۔ مخاطب کے حوالے سے اس قسم کی تفریق دعوت کے باب میں ذہن میں رکھی جاسکتی ہے مگر تمام فیصلوں کی جگہ یہ دنیا نہیں، بلکہ آخرت ہے۔ غزوۂ بدر کے موقع پر جب بعض صحابہ کرامؓ کو قتل اور چند کی لاشوں کو مثلہ کیا گیا تو روایات میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضور اکرمؐ نے شدتِ جذبات میں فرمایا کہ اگلے سال ہم بھی ان کا مثلہ کریں گے۔ اس موقع پر قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی: لَیْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ اَوْ یَتُوْبَ عَلَیْھِمْ اَوْ یُعَذِّبَھُمْ فَاِنَّھُمْ ظٰلِمُوْنَ[9]

معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملات اس قدر حساس نوعیت کے ہیں کہ ان کے باب میں پیغمبر علیہ السلام کو بھی تنبیہ فرمائی گئی ہے تو عام مسلمانوں کے لیے ان حساس معاملات میں بولنا اور اپنا فیصلہ سنانا قطعاً درست نہیں۔ مزید برآں، اسلام کے تصورِ انسانیت اور تصورِ انسانی حقوق کو مکمل اہتمام کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ امید ہے کہ اگر آئندہ بھی اس قسم کی کاوشیں ہوتی رہیں تو ہم مذہب کے مقدمے کو انسانیت کے لیے زیادہ نفع بخش اور سبق آموز بنا سکیں گے۔

---

[7] التغابن: ۲

[8] الحجرات: ۱۳

[9] آل عمران: ۱۲۸

# صدارتی کلمات

## شجاع الدین شیخ*

اسلام نے خدمتِ انسانیت کے سلسلے میں وہ تعلیمات دی ہیں کہ اگر عام انسان تک، چاہے وہ مسلم نہ بھی ہو، ان تعلیمات کو ان کی اصل روح کے ساتھ پہنچایا جائے تو وہ ان کی خوبی کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ دینِ اسلام نے ہر مرد پر کفالت کی جو ذمہ داری عائد کی، اسے بہتر طور پر ادا کرنا صدقہ ہے۔ یہی معاملہ تصورِ وراثت کا ہے۔ یہ دین جانوروں سے بھی حسنِ سلوک کی تعلیم دیتا ہے اور بعض روایات میں ایک کتے اور بلی کے ساتھ حسنِ سلوک پر اجر جبکہ سلوکِ بد پر عذاب کی امثلہ موجود ہیں۔ اسلام نے معاش کی ذمہ داری مرد پر عائد کی ہے۔ نہ صرف عورت کو اس سے استثنا دیا گیا ہے بلکہ احادیث میں تو خالہ اور پھوپھو کی کفالت کی بھی ترغیب دی گئی ہے۔ اگر کفیل موجود نہ ہو تو پھر ان کی کفالت کرنا ریاست کی ذمہ داری ہے۔ غیر مسلموں کے حوالے سے بات کی جائے تو حضرت عمرؓ کے دور میں ایک یہودی کمائی کا وسیلہ نہ ہونے پر جزیہ ادا نہ کر سکا، تو حضرت عمرؓ نے بطور سربراہِ حکومت اس کی کفالت کی ذمہ داری لے لی۔ اسلام کے عطا کردہ اسی جذبۂ خدمت کا نتیجہ ہے کہ پاکستان اور ترکی سمیت اسلامی ممالک میں لاکھوں پناہ گزینوں کو خوش آمدید کہا گیا اور طویل عرصہ تک ان کی میزبانی کی گئی۔

انسانی خدمت میں ایک رکاوٹ بعض بین الاقوامی اداروں کے اس کردار کی بدولت پیش آتی ہے نہوں نے نو آبادیاتی دور میں یا اس کے بعد عطیات اور خدمات کی فراہمی کے دوران مسلمانوں کے مذہب کو یا مسلم معاشروں میں اسلام کے کردار اور حیثیت کو بدلنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں مسلمانوں کو بھی اپنے کردار اور عالمی امور میں اپنے حصے پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

---

* امیر، تنظیمِ اسلامی پاکستان

اس وقت دنیا بھر میں جاری تنازعات میں سے بیشتر ایسے ہیں جن کا نشانہ مسلمان ہیں۔ ایسے میں مسلمانوں کا موجودہ طرزِ عمل صرف اس قدر ہے کہ پیدا شدہ حالات کے مطابق خود کو ڈھال لیا جائے اور جاری نقصانات کے ازالے کی کوشش کی جائے۔ جب تک مسلمان اپنے وسائل، قوت اور آواز کو مجتمع کر کے اس قابل نہیں ہو جاتے کہ وہ عالمی امور کے طے کرنے میں اہم سمجھے جائیں، نہ توان کی حالت میں کوئی تبدیلی آئے گی اور نہ ہی ظلم و جبر کا جاری سلسلہ تھمے گا۔ جو اقوام جنگیں مسلط کر رہی ہیں، عدل اور انصاف کے پرچم تلے ان کا ہاتھ روکنے کی ضرورت ہے، ورنہ لاشیں سنبھالنے اور زخمیوں کی دیکھ بھال کرنے کا یہ عمل کبھی تھمنے والا نہیں ہے۔

دوسری طرف مسلم معاشروں کا اندرونی معاملہ ہے۔ اگر کسی مسلم معاشرے میں مذہب کی بنیاد پر تعصب برتا جا رہا ہے تو اس کی ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے۔ جینے کا جو ڈھنگ اللہ کا دین سکھاتا ہے، اس میں تو جانوروں پر بھی توجہ دی جاتی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان جو اشرف المخلوقات ہے، اس کے حقوق غصب ہونے کو مذہب کا عنوان دیا جا سکے۔

اس سب کے ساتھ ایک اہم پہلو وسائل کی فراہمی کا ہے۔ اگر مناسب منصوبہ بندی کی جائے تو وسائل کی کمی کا مسئلہ بھی نہیں ہو گا۔ مساجد و مدارس کی تعمیر، دستر خوان سجانے جیسے امور بالعموم نجی سطح پر کیے جا رہے ہیں، جب کہ ان امور کی ذمہ داری ریاست کو لینی چاہیے جس میں نجی شعبہ اور افراد کی معاونت کا ایک ضابطہ بنایا جائے۔

آخری اور اہم بات یہ ہے کہ پاکستان جو اسلام کو بطور طرزِ حیات دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لیے حاصل کیا گیا تھا، اس میں ہمیں یہ موقع حاصل ہے کہ ہم انسانی خدمت اور انسانیت کے احترام کی مثال بن کر ابھریں۔ پاکستانی معاشرے میں بہت سی خیر موجود ہے اور اسی بنیاد کو استعمال کرتے ہوئے ہمیں اپنے ملک میں اسلامی احکامات و اصولوں کی جامع ترویج کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس سے نہ صرف لوگوں کے پیٹ کی آگ بجھے گی بلکہ جہنم کی آگ سے بھی خلاصی ہو گی، ان شاء اللہ۔

# اسلام اور انسانی خدمات کی
# معاصر صورتیں

# اسلام اور عصر حاضر میں انسانی خدمات

ڈاکٹر شہزاد چنا*

اسلام امن و سلامتی، صلاح و فلاح، ایثار و ہمدردی اور انسانی خدمات کا دین ہے۔ اسلامی تعلیمات میں ایک چوتھائی حصہ عقائد و عبادات کا ہے مگر تین چوتھائی توجہ معاملات پر ہے۔ اسلام کی تہذیبی خدمات میں ایک بہت نمایاں خدمت انسانیت کی فلاح و بہبود کے کام کو مذہبی عبادت کا اور خدمتِ خلق کی ذمہ داری کو روحانی بلندی کا درجہ دینا بھی ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں عصرِ حاضر کے تقاضوں اور اسلام میں انسانی خدمات کے تصور کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اردو لغت کے مطابق خدمت کے معنی ہیں: سیوا، اطاعت اور فرمانبرداری جب کہ خدمات، خدمت کی جمع ہے۔[1] انسانوں کے باہمی تعلق اور سلوک کا اعلیٰ درجہ دوسروں کی مدد ہے اور حقیقت میں اس باہمی تعاون کے سبب ہی معاشرہ وجود میں آتا ہے اور معاشرے کے فروغ اور ترقی کی بنیاد بھی یہی تعاون اور باہمی مدد ہے۔ ذاتی نفع کا حصول ہر انسان کی سرشت میں شامل ہے اور بیشتر صورتوں میں انسان اپنے فائدے کے لیے دوسروں سے لاتعلق ہو جانے یہاں تک کہ ان کے مفادات کو دانستہ نقصان پہنچانے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ ایسے میں جو لوگ معاشرے میں پیچھے رہ جانے والوں کے لیے دستِ تعاون بڑھائیں، وہ یقیناً انسانوں میں سے بہترین لوگ ہیں۔ انسانی خدمت کا اعلیٰ ترین مقام وہ ہے جس میں نیکی، احسان یا تعاون کرنے والا اپنی بھلائی سے فائدہ اٹھانے

* اسسٹنٹ پروفیسر، کراچی ریجنل دعوۃ سنٹر، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

[1] اردو لغت (ترقی اردو بورڈ کراچی)، جلد ششم، دسمبر ۱۹۸۷، ص ۴۹۶

والے سے کوئی غرض بھی نہ رکھے۔ یہی وہ درجہ ہے جو اللہ نے مؤمنین کے لیے پسند فرمایا ہے۔[۲]

## رفاہی و سماجی کاموں کا مقصد

سماجیات کے علم نے سماجی اداروں کے لیے جو مقاصد مقرر کیے ہیں وہ یہ ہیں:

اچھا شہری بننا، اپنے کنبے، جماعت، ملک، قوم اور انسانیت کی خدمت میں اپنی صلاحیت کو بروئے کار لانا، افراد اور گروہوں کی مدد کرنا، بہتر اور صحت مند زندگی گزارنا، ذاتی اور سماجی تعلقات خوشگوار ہونا، سماجی برائیوں کو دور کرنا، انسان کی ذہنی، جسمانی اور سماجی زندگی کو بہتر بنانا، انسانی زندگی کی حفاظت، صحت عامہ، تعلیم اور مزدوروں کی فلاح، اپنی مدد آپ کے اصول اپنانا، دوسروں کے مفاد کے لیے کام کرنا، دوسروں کے مسائل حل کرنے میں مدد کرنا، معاشرے میں انصاف کی فراہمی، تمام شہریوں کو یکساں ترقی کے مواقع فراہم کرنا۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ سماجی بہبود کا مقصد ایسے معاشرے کی تشکیل ہے جہاں افراد، گروہ اور جماعتیں مل جل کر رہیں اور خوشگوار زندگی گزاریں۔ ہر شخص امداد باہمی کی اہمیت سے واقفیت ہو جائے اور دوسروں پر بوجھ بننے کی بجائے ایک کارآمد شہری ثابت ہو۔[۳]

## اسلام میں خدمتِ خلق کا تصور

امام غزالی (۱۰۵۸-۱۱۱۱) احیاء العلوم میں لکھتے ہیں کہ صدقہ و خیرات کرنے والوں میں ایک گروہ ان لوگوں کا ہے جو مال خیرات کرتے ہیں اور فقیروں، مسکینوں کو دیتے ہیں لیکن اس داد و دہش کے لیے ایسے مواقع تلاش کرتے ہیں جہاں لوگوں کا اجتماع ہو، اور فقیروں مسکینوں میں بھی ایسے افراد کو ترجیح دیتے ہیں جو شکر گزار، اور نام مشہور کرنے والے ہوں، یہ لوگ چھپ کر صدقہ دینے

---

[۲] الدھر: ۹

[۳] مولانا امیر الدین مہر، اسلام میں رفاہ عامہ کا تصور اور خدمت خلق کا نظام، نشریات اردو بازار لاہور، ۲۰۰۹، ص ۵۶،۵۵

کو برا سمجھتے ہیں، اگر کوئی فقیر ان سے کچھ لے کر چھپالے تو اسے مکار اور ناشکرا قرار دیتے ہیں۔ بہت سے ایسے بھی ہیں جو حج پر حج کرتے ہیں، لیکن ان کے پڑوسی بھوک سے بلبلاتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرمایا کرتے تھے کہ آخر زمانے میں ایسے لوگ بھی ہوں گے جو بلا سبب حج کیا کریں گے، دولت مند ہونے کی وجہ سے ان کے لیے سفر آسان ہو گا، لیکن وہ اس سفر سے محروم، ناکام اور نامراد واپس ہوں گے، خود تو اونٹوں پر سوار جنگلوں اور ریگستانوں میں پھریں گے اور ان کے پڑوسی محتاج ہوں گے جن کی وہ مدد نہ کریں گے۔ ابو نصر تمار کہتے ہیں کہ ایک شخص، جس کے ذرائع آمدن مشکوک تھے، بشر ابن حارث کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں حج کے لیے پابہ رکاب ہوں آپ مجھے کوئی نصیحت فرمادیں، آپ نے اس سے پوچھا کہ تم نے مصارفِ سفر کے لیے کتنے درہم لے جانے کا ارادہ کیا ہے، اس نے کہا کہ دو ہزار۔ آپ نے سوال کیا کہ تم حج سے کیا مقصد رکھتے ہو؟ سیر و سیاحت، خانہ خدا کی زیارت کا شوق، یا اللہ کی خوشنودی؟ اس نے جواب دیا کہ میں اللہ کی رضا کے لیے حج کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے کہا کہ اگر تمہیں یہ دو ہزار درہم خرچ کر کے گھر بیٹھے اللہ کی رضا حاصل ہو جائے تو تم حج کا ارادہ ترک کر سکتے ہو؟ اس نے کہا یقیناً، آپ نے فرمایا: جاؤ اور یہ دو ہزار درہم ایسے افراد کو دے دو جو قرضدار ہوں تاکہ قرض ادا کر سکیں، یا محتاج ہوں تاکہ اپنی ضروریات پوری کر سکیں، یا عیالدار ہوں اور اپنے بچوں کی پرورش کر سکیں، یا یتیموں کی پرورش کرنے والے ہوں تاکہ انہیں خوش کر سکیں، اگر تم کسی ایک فرد کو دینا چاہو تب بھی کوئی مضائقہ نہیں، یہ مشورہ میں اس لیے دے رہا ہوں کہ فرض حج ادا کرنے کے بعد کسی مسلمان کو خوش کرنا، کسی مظلوم کی دادرسی کرنا، کسی کو نقصان سے بچانا، کسی کمزور کی مدد کرنا سو مرتبہ حج سے افضل ہے، جاؤ اور یہ مال اسی طرح تقسیم کر دو جس طرح میں نے کہا ہے، اور اگر تم میرا مشورہ قبول نہیں کرنا چاہتے تو ابھی بتلادو۔ اس نے کہا میں تو حج ہی کرنا چاہتا ہوں، یہ سن کر آپ مسکرائے، اور کہنے لگے کہ جب مال تجارت سے اور مشتبہ ذرائع سے جمع ہو جاتا ہے تو دل اسے خرچ کرنا چاہتا ہے۔ وہ خرچ تو کرتا ہے اپنی مرضی کے مطابق لیکن اعمال صالح کو آڑ بنالیتا ہے، مگر اللہ نے قسم کھالی ہے کہ وہ متقین کے سوا

کسی کے اعمال قبول نہیں کرے گا۔[4]

قرآن مجید میں کئی جگہوں پر رفاہی و انسانی خدمات کے حوالے سے آیات ملتی ہیں۔ فرض نیکیوں کے علاوہ بھلائی کے افعال کو کامیابی کا راستہ قرار دیا گیا ہے،[5] اور یہ ترغیب دی گئی ہے کہ انسان اس بھلائی کی طلب میں اپنا بہترین مال دوسروں کی ضروریات کے لیے خرچ کرے۔[6] اپنی کوشش اور دولت کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا بہترین طریقہ تو یہی ہے کہ اسے پوشیدہ ہی رکھا جائے لیکن بعض اوقات نیکی کا اظہار دوسروں کو نیکی کی ترغیب دلاتا ہے۔ لہٰذا فرمایا:

اِنۡ تُبۡدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِیَ وَاِنۡ تُخۡفُوۡهَا وَ تُؤۡتُوۡهَا الۡفُقَرَآءَ فَهُوَ خَیۡرٌ لَّكُمۡ[7]

اگر اپنے صدقات اعلانیہ دو تو یہ بھی اچھا ہے لیکن اگر چھپا کر حاجت مندوں کو دو تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے۔

اسلام نے مومن کی جو تربیت کی ہے اس کی خاص بات یہ ہے کہ اس کی طرف سے خیر پہنچانے میں بُخل یا امتیاز کا دخل نہیں ہے بلکہ اس کی طرف سے ہر ایک کو بھلائی، خیر اور سلامتی پہنچتی ہے۔ چناں چہ حدیث میں آتا ہے:

عَنۡ عَبۡدِ اللّٰہِ بۡنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡهُمَا أَنَّ رَجُلًا سَأَلَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡهِ وَسَلَّمَ أَیُّ الۡإِسۡلَامِ خَیۡرٌ قَالَ: تُطۡعِمُ الطَّعَامَ وَتَقۡرَأُ السَّلَامَ عَلَی مَنۡ عَرَفۡتَ وَمَنۡ لَمۡ تَعۡرِفۡ[8]

---

[4] امام ابو حامد محمد الغزالی، احیاء العلوم (اردو) جلد ۳، دار الاشاعت کراچی، ص ۶۲۵، ۶۲۶

[5] الحج: ۷۷

[6] آل عمران: ۹۲

[7] البقرہ: ۲۷۱

[8] محمد بن اسماعیل البخاری، الجامع الصحیح: کتاب الایمان، باب ۲، حدیث نمبر ۵

حضرت عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ کون سا اسلام بہتر ہے؟آپ نے فرمایا! تم کھانا کھلاؤاور سلام کرو، ہر اس شخص کو جسے تم پہچانتے ہو یا نہیں پہچانتے۔

جبکہ ایک اور حدیث میں ہے:

**عن ابی موسی الاشعری قال قال رسول اللہ ﷺ عُودُوا المریضَ، وأَطْعِمُوا الجَائِعَ، وفُكُّوا العَانِيَ** [9]

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بیمار کی عیادت کرو، بھوکے کو کھانا کھلاؤاور قیدی کی رہائی کا سامان کرو۔

رسول اللہ ﷺ کا عمر بھر کا اسوہ یہ بتاتا ہے کہ جب اور جہاں کوئی ضرورت مند ہو تو اس کی شناخت اور وابستگی کا سوال کیے بغیر سب سے پہلے اس کی ضرورت پورا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ مدینہ منورہ میں نبی مہربان صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک بھوکا شخص آیا اور کھانا طلب کیا، آپ ﷺ اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہوئے اور اپنے گھر تشریف لے گئے۔ گھر والوں نے بتایا کہ اس وقت سوائے پانی کے کوئی کھانے پینے کی چیز گھر میں نہیں ہے۔ آپ ﷺ واپس تشریف لائے اور صحابہؓ سے فرمایا کہ جو صاحب اس شخص کو اپنا مہمان بنائے گا تو اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرمائے گا۔ ابو طلحہؓ نے عرض کی کہ میں اسے اپنا مہمان بناتا ہوں۔ پھر وہ اسے اپنے گھر لے گئے اور جا کر اپنی اہلیہ سے صورت حال بتا کر پوچھا کہ گھر میں کھانے کے لیے کیا کچھ ہے؟ انہوں نے کہا کہ صرف بچوں کا کھانا موجود ہے۔ ابو طلحہؓ نے تجویز دی کہ بچوں کو بہلا کر سلا دو اور کھانا سامنے رکھ کر چراغ گل کر دو۔ ہم مہمان کے ساتھ بیٹھ کر کھانے کی سی صورت بنالیں گے لیکن کھائیں گے نہیں اور مہمان پیٹ بھر کر کھالے گا۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا، انہوں نے اور بچوں نے بھوک میں رات گزاری لیکن بھوکے مسافر اور زیادہ ضرورت مند نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ صبح کے وقت ابو طلحہ

[9] محمد بن اسماعیل البخاری، الجامع الصحیح، کتاب المرضی، باب وجوب عیادۃ المریض، حدیث نمبر ۵۶۴۹

آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تمہارے اس حسنِ سلوک سے بہت خوش ہوئے۔[۱۰]

آپ ﷺ نے امت کی اور انسانوں کی جتنی بھی خدمت کی، اصلاح و تبلیغ کا کام کیا، ان کی تعلیم اور روحانی واخلاقی تربیت کی، اس سے آپ ﷺ کی کوئی دنیاوی غرض وابستہ نہیں تھی۔ آپ ﷺ نے کسی سے کبھی کوئی معاوضہ طلب نہیں کیا، کسی پر کوئی احسان نہیں جتایا، کسی کو کوئی ذہنی تکلیف نہیں دی، مدد کر کے اس کی تشہیر نہیں کی، بلکہ یہ تمام کام محض اللہ کی رضا اور اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے تھے۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَمَا تَسْأَلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ [۱۱]

حالانکہ تم اس خدمت پر ان سے کوئی اجر بھی نہیں مانگتے ہو یہ تو نصیحت ہے جو دنیا والوں کے لیے عام ہے۔

یہی وہ اہم فرق ہے۔ جو رفاہی کام آخرت کو مقصود نہ رکھ کر، اس کا تصور و عقیدہ درمیان سے نکال کر کیے جاتے ہیں ان میں وہ خیر و برکت اور پذیرائی نہیں ہوتی، اور نہ ہی اس کام کا آخرت میں کوئی ثمرہ سامنے آئے گا۔ بلکہ محض چند دن کی پذیرائی ہو جاتی ہے۔ ایسے کام کو دوام و تسلسل نصیب نہیں ہوتا۔ اسلام کا یہی اصول ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں نیک عمل اس وقت قبول ہو گا جب اس کے ساتھ ایمان وایقان کی دولت ہو اور بے غرضی اور اخلاص کے ساتھ ہو۔

## اسلام میں انسانی خدمات کے ادارے

اسلام انسانی زندگی کے ہر شعبے میں خواہ وہ معاشی، سیاسی، اخلاقی یا معاشرتی ہو، واضح اور مدلل احکامات رکھتا ہے۔ اسی طرح اسلام کی حیثیت محض ایک مذہب ہی کی نہیں ہے، بلکہ یہ ایک مکمل

---

[۱۰] مسلم بن حجاج القشیری، صحیح مسلم، کتاب الاشربہ، باب اکرام الضیف وفضل ایثارہ، حدیث نمبر ۲۰۵۴

[۱۱] یوسف: ۱۰۴

نظامِ حیات بھی ہے۔

انسان کے دو بنیادی مسائل ہیں، ایک دولت کمانا اور دوسرا اسے صحیح مصرف پر خرچ کرنا۔ غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ در حقیقت یہی وہ دو بنیادی محرکات ہیں جو معاشی زندگی کی بنیاد بنتے ہیں۔ اسلام نے حصولِ دولت اور استعمالِ دولت کے ایسے واضح اور زریں اصول پیش کیے ہیں جو مثالی معاشرہ وجود میں لاتے ہیں۔ اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ اسلامی معاشی نظام میں فرد کے مفاد کو ترجیح دی جاتی ہے۔ تاہم فرد کے مفاد کا تحفظ اس انداز میں کیا گیا ہے کہ اجتماعی مفاد بھی حاصل ہو سکے۔ اسی لیے جہاں ہر فرد کو حلال اور طیب چیزیں کھانے کا حکم دیا گیا ہے[۱۲] وہاں ایسے مالیاتی نظام اور افعال کو بھی حرام قرار دیا گیا ہے جو دوسروں کے لیے ظلم کا باعث ہوں۔[۱۳] اسلامی معیشت کا مقصد صرف فرد کی ذاتی خواہش کی تکمیل ہی نہیں ہے، بلکہ اجتماعی فلاح انسانیت بھی مقصود ہے۔

اسلام نے دولت کے اسراف اور بے جا رسومات میں فضول خرچی کی سخت ممانعت کی ہے۔ اسلامی نظریہ کے مطابق زندگی کا مقصد صرف دولت کمانا ہی نہیں ہے۔ اسلام دولت کو صرف ایک ذریعہ تصور کرتا ہے اور انسان کو حکم دیتا ہے کہ وہ اسے اپنی نجات کا ذریعہ بنائے۔ دولت اللہ کی دی ہوئی ایک نعمت ہے اور وہی اس کا مالک ہے، لہٰذا دولت کو اللہ کی رضا کے لیے اس کے بندوں پر ہی خرچ کرنا چاہیے اور اس کے لیے صدقہ و خیرات اور زکٰوۃ ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

## ۱۔ زکٰوۃ

زکٰوۃ وہ سالانہ ادائیگی ہے جو ایک طرف افراط زر کو روکتی ہے تو دوسری طرف معاشرے کے غریب اور نادار افراد کی مدد کا سبب بنتی ہے۔ یہ صاحب حیثیت مسلمانوں سے لی جاتی ہے جس کی ادائیگی ان پر ہر سال لازم ہے۔ اس کی وصولیابی کا انتظام اسلامی حکومت کرتی ہے۔ جہاں اسلامی حکومت نہ ہو وہاں انفرادی طور پر زکٰوۃ کی رقم صرف کی جاتی ہے۔

---

[۱۲] البقرہ: ۱۶۸

[۱۳] آل عمران: ۱۳۰

معاشرے پر نظامِ زکوٰۃ کے اثر اور اس کے معاشی مقصد کو بیان کرتے ہوئے یہ فرمایا گیا ہے کہ اس کا مقصد چند ہاتھوں میں دولت کے ارتکاز کو روکنا اور ایسا نظام وضع کرنا ہے جس میں باوسیلہ اور بے وسیلہ تمام افراد کے لیے زندگی کی کم از کم سہولیات کی فراہمی کو لازم بنایا جا سکے۔

كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ [14]

تاکہ دولت تمہارے مال داروں میں گردش نہ کرتی رہے۔

زکوٰۃ کی ادائیگی کے ذریعے غریبوں، مسکینوں اور محتاجوں سے احساسِ محرومی ختم ہو جاتی ہے اور ان کے دلوں سے مالداروں کے خلاف کینہ، حسد، نفرت اور بدخواہی نکل جاتی ہے۔

زکوٰۃ کا دوسرا اہم مقصد معاشرے میں اخوت اور ہمدردی کے جذبات کی نشو ونما کرنا ہے۔ کیوں کہ فرد کی ذاتی بھلائی جماعت کی بھلائی کے ساتھ وابستہ ہے۔ جس معاشرے میں معذور اور محتاج لوگوں کی ضروریات زندگی کی فراہمی اور یتیم اور بے سہارا بچوں کی تعلیم اور تربیت کا معقول انتظام ہو، وہاں افلاس، بے چارگی اور طبقاتی کشمکش کا پروان چڑھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

زکوٰۃ کا تیسرا اہم مقصد اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اسلام میں دولت اور مال سے محبت کو پسندیدہ فعل نہیں قرار دیا گیا۔ اسلام کا یہ مطالبہ ہے کہ دولت چند ہاتھوں تک محدود نہ رہے اور نہ ہی اسلام اس بات کو پسند کرتا ہے کہ کوئی شخص اپنی دولت کے استعمال کو اپنے ذات تک محدود رکھے۔ بلکہ اسلام کا مطالبہ ہے کہ دوسرے لوگ بھی اس سے فیضیاب ہوں اور سرمایہ پورے معاشرے میں گردش کرتا رہے۔ یہی وجہ ہے کہ زکوۃ کی ادائیگی آمدنی پر نہیں رکھی گئی بلکہ یہ سرمایہ پر واجب ہے۔ اگر ایک شخص اپنے اثاثہ کو یوں ہی دیتا رہے تو کچھ عرصہ بعد اس کے ذاتی خرچ اور ادائیگی زکوٰۃ سے تمام اثاثہ ختم ہو جائے گا۔ ظاہر ہے کہ وہ یہ چاہے گا کہ تجارت یا دوسرے ذرائع سے اپنے اثاثہ میں اضافہ کرے اور اسی طرح معاشرے میں معاشی سرگرمیاں پیدا ہوں گی۔

---

[14] الحشر: ۷

اسلام زکوٰۃ کے ذریعے معیشت کو صحت مند بنیادوں پر استوار کرتا ہے۔

## ۲۔ صدقہ اور خیرات

زکوٰۃ کے علاوہ اسلام نے مسلمانوں کو معاشرے کے دوسرے غریب اور نادار لوگوں کی امداد کے لیے صدقہ و خیرات کا حکم دیا ہے۔ اسی ضمن میں صدقۃ الفطر بھی آتا ہے جس کا ہر مسلمان، خواہ وہ عورت ہو، بچہ ہو یا بوڑھا، عید کی نماز سے قبل نقد یا اناج کی صورت میں خیرات کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ غریب اور نادار افراد عید کے موقع پر غربت کی وجہ سے خوشی سے محروم نہ رہ سکیں۔

چنانچہ اسلام نے معاشرے میں انسانی خدمات کے ذریعے فلاح و بہبود کے واضح احکامات صادر کیے ہیں۔ یہ احکامات اس بات کی نشاندہی بھی کرتے ہیں کہ معاشرے کی فلاح و بہبود صرف حکومت کا کام نہیں بلکہ ہر فرد کو اپنی حیثیت کے مطابق فلاحی کاموں میں حصہ لینا چاہیے۔

## ۳۔ وقف

اسلام کے معاشی نظام میں وقف کی بہت اہمیت ہے۔ اس فلاحی ادارے کے قیام کی ابتدا رسول اکرم ﷺ کے زمانے میں ہوئی اور بعد میں اسلامی مملکتوں نے اسے ایک قانونی شکل دے دی۔ وقف کسی جائیداد کو بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کی خاطر دینے کو کہتے ہیں۔ اس کی دو اقسام ہیں: وقف خیری اور وقف اہلی، اول الذکر سے مراد وقف کی وہ صورت ہے جو عام معاشرے کی فلاح کے لیے کیا جاتا ہے اور آخر الذکر وہ وقف ہے جس کا مقصد اپنے عزیزوں اور قرابت داروں کی فلاح ہو۔ وقفِ اہل خاندان کے افراد اگر مر جائیں تو وقف خیری بن جاتا ہے۔

گزشتہ چودہ سو سال میں کسی بھی اسلامی ادارے نے اتنی ترقی نہیں کی جتنی کہ وقف نے کی۔ ہر مسلمان حاکم کے دور میں بڑی بڑی جاگیریں وقف کی گئیں اور ان کی امداد سے بڑی حد تک عوام کی فلاح و بہبود اور تعلیمی ضروریات پوری کی گئیں۔

## ۴۔ بیت المال

اسلام کے معاشی نظام میں بیت المال بنیادی حیثیت کا حامل ہے۔اس میں حکومت کے تمام ذرائع آمدن جمع کیے جاتے ہیں اور حکومت کے تمام اصراف کی ادائیگی بیت المال سے کی جاتی ہے۔

اگرچہ بیت المال کا بنیادی مقصد غریبوں اور ضرورت مندوں کی فلاح و بہبود ہے۔تاہم اسلامی ریاست فردِ واحد کے اس حق کو تسلیم کرتی ہے کہ اس کو روٹی، کپڑا اور گھر مہیا کیا جائے۔بیت المال افراد کو سماجی تحفظ مہیا کرتا ہے۔خلفائے راشدین کے زمانے میں نادار، یتیموں اور بیواؤں کو بیت المال سے باقاعدہ وظیفے دیے جاتے تھے تاکہ وہ اپنی ضروریاتِ زندگی پوری کر سکیں۔خلفائے راشدین اور کچھ مسلمان بادشاہوں کی ایسی مثالیں ملتی ہیں جنہوں نے بیت المال سے سوائے اپنی محدود ضرورتوں کے کچھ نہیں لیا اور امکانی کوشش کی کہ بیت المال سے زیادہ سے زیادہ عوام کی خدمت کی جائے۔

## اسلامی معاشرے میں سماجی ادارے

اسلام کے معاشرتی نظام میں متعدد سماجی ادارے موجود ہیں جو اس معاشرے کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ذیل میں چند اہم سماجی اداروں کا ذکر کیا جاتا ہے:

### ا۔خاندان

انسانی خدمات میں خاندان کا بنیادی کردار ہے۔یہ اسلامی معاشرے کا اولین ادارہ ہے۔خاندان انسانی معاشرے اور تہذیب و تمدن میں ایسے سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے جس پر انسانی اجتماعیت کے تمام مدارج کی تعمیر و تشکیل ہوتی ہے۔خاندان سے معاشرے کا استحکام وابستہ ہے۔اس کی خوشحالی اور تعمیر و ترقی کا تمام تر دار و مدار خاندان کی بہبود پر ہے۔خاندان جس قدر مضبوط اور اس کی تشکیل جس قدر صحیح خطوط اور پختہ بنیادوں پر ہو گی، اس سے وجود میں آنے والا معاشرہ اتنا ہی خوشحال، مستحکم اور مثالی ہو گا۔ایک مستحکم، خوشحال اور پائیدار معاشرے کے لیے مضبوط خاندان کا ہونا

لازمی اور ناگزیر ہے۔

### ۲۔ قرابت دار

فرد کا تعلق اپنے رشتہ داروں سے بھی ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ رشتہ داروں سے نیک سلوک کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور یوں وسیع تر حلقے کے درمیان خوشگوار ماحول بنانے کی ایک عمدہ کوشش کی گئی ہے اور اس سلسلے میں ایک مستحکم معاشرے کے عوامل کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔

### ۳۔ ہمسایہ

قرابت کے بعد فرد کا تعلق اپنے ہمسائیوں سے ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی رو سے ہمسایوں کی تین قسمیں ہیں: (ا) رشتہ دار ہمسایہ، (ب) اجنبی ہمسایہ، (ج) عارضی ہمسایہ۔

اسلامی احکام کی رو سے یہ سب ہمسائے رفاقت، ہمدردی اور نیک سلوک کے مستحق ہیں۔ انسانی بنیادوں پر ان کی خدمت اور ان کے ساتھ تعاون، ایک پائیدار معاشرے کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ اس حوالے سے رسول اکرم ﷺ کے بہت سے ارشادات حدیث کی کتب میں ملتے ہیں، جن سے ہمسائے کے حقوق کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔[15]

### ۴۔ مسجد

معاشرے میں اجتماعی مراکز کے طور پر جو ادارے قائم کیے جاتے ہیں، مسجد کو اس سلسلے میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ گو مسجد کا استعمال بظاہر پانچ وقت کی نماز کے لیے ہے، مگر در حقیقت یہ معاشرے کے افراد میں یاد خدا، احساسِ ذمہ داری، پابندیٔ وقت، تنظیم و مساوات اور مسائل کے حل کے لیے ایک پلیٹ فارم مہیا کرتی ہے۔

مسجد میں سب لوگ ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں جس سے مساوات کا سبق ملتا

---

[15] البخاری۔ حدیث نمبر: ۵۶۷۰، مسلم۔ حدیث نمبر: ۲۶۲۴

ہے۔ مسجد میں لوگ آپس میں ملتے جلتے ہیں جن سے ان میں میل جول اور بھائی چارے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کی امداد کرتے ہیں اور اپنے حلقے کے سماجی مسائل کو باہمی تعاون سے حل کر لیتے ہیں۔ مسجد میں دینی تعلیم کا بھی انتظام کیا جاتا ہے۔

مندرجہ بالا پہلوؤں پر غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے نہ صرف انسانوں کو باہم محبت، تعاون، اور امداد کا درس دے کر ان کے اندر اس جذبے کو پروان چڑھایا ہے بلکہ سماج و معاش کی تنظیم بھی اس انداز میں کی ہے جس میں ظلم کے راستے بند ہوں اور معاشرہ باہم احترام اور تکریم کی بنیاد پر تشکیل پا جائے۔

## تجاویز و سفارشات

اگرچہ انسانی خدمات کا میدان کافی وسیع ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ تاہم ذیل میں انسانی خدمت کے چند ایسے پہلوؤں اور امور کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے جو پاکستان کے موجودہ تناظر میں نسبتاً زیادہ توجہ طلب ہیں۔

### ا۔ عمر رسیدہ افراد کی فلاح

عمر رسیدہ افراد کسی بھی معاشرے کا ایک اہم حصہ ہوتے ہیں۔ عام طور پر ٦٠ سال کی عمر کے بعد بڑھاپے کے جس دور کا آغاز ہوتا ہے وہ زیادہ تر افراد کے لیے نیا لیکن تکلیف دہ تجربہ ثابت ہوتا ہے۔ پاکستانی معاشرے میں خاندان کا جو تصور ہے گو کہ وہ اتنا تکلیف دہ نہیں، بزرگوں کی عزت و توقیر کی جاتی ہے اور اہم خاندانی امور میں ان کی آراء کا خیال بھی رکھا جاتا ہے۔ لیکن عام طور پر تنہائی، بیکاری اور دیگر امور میں ان کی مؤثر شراکت کا نہ ہونا خود عمر رسیدہ افراد کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ عمر رسیدہ افراد کے لیے ایک نظام کے تحت رضاکارانہ طور پر کام کرنے کا اہتمام معاشرے کو ان کی صلاحیتوں سے استفادے کا موقع بھی دے گا اور ان افراد کو اپنی اہمیت کا احساس بھی دلائے گا۔ یہ کام بلا معاوضہ بھی ہو سکتا ہے اور کسی معاوضہ کے عوض بھی۔ نیز ایسے بزرگ جن کو دیکھ

بھال کی ضرورت ہو ان کے لیے خاندان کو یا دیگر سماجی اداروں کو ضروری معاونت فراہم کرنا اہم انسانی خدمت ہے۔

## ۲۔ طبّی و سماجی بہبود

طبّی و سماجی بہبود انسانی خدمت کی ایک اہم اور بنیادی شاخ ہے جس کا مقصد مریضوں کے سماجی و معاشی پسِ منظر کی روشنی میں ان کی مدد کرنا ہے تاکہ وہ فراہم کردہ طبّی سہولتوں سے فائدہ اٹھا کر جلد صحت یاب ہو جائیں۔ طبّی اور سماجی اداروں کے قیام سے لوگوں کے سماجی اور نفسیاتی مسائل حل کرنے میں مدد ملتی ہے۔ان اداروں کے قیام سے لوگ صحت کی بنیادی سہولیات سے آراستہ ہوں گے اور یہ ان کے حق میں ایک بہت بڑی خدمت ہے۔

## ۳۔ تعلیمی اداروں کا قیام

اس وقت پاکستان میں دینی مدارس کی تعداد دنیا کے دوسرے خطوں سے زیادہ ہے۔ عصر حاضر میں مدارس کی اہمیت و ضرورت بہت اہم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم معاشرے کی سب سے بڑی مسلم این جی اوز، دینی مدارس ہیں۔ان مدارس کی خوبیوں اور امتیازات میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ غریب سے غریب اور نادار شخص ان کے ہاں سے تمام ضروریات زندگی حاصل کرتے ہوئے مفت تعلیم حاصل کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی خدمت میں مدارس کا ایک غیر معمولی کردار ہے۔

معاشرے میں دوسرا تعلیمی نظام اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کا رائج ہے۔ یہ بڑے وسیع پیمانے اور مربوط طریقے پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ ادارے گورنمنٹ اور پرائیویٹ سیکٹر کی طرف سے بھی شامل ہیں۔ خدمات انسانی میں اگر ایسے تعلیمی اداروں اور مدارس کی بھرپور مالی امداد واعانت کو ترجیح دی جائے جس کے ذریعے ان اداروں میں غریب، نادار اور مسکین طلبہ اپنی تعلیم مکمل کر سکیں تو یہ ایک بہت بڑی خدمت تصور ہو گی۔

## ۴۔ مزدوروں کی فلاح و بہبود

مزدوروں کی فلاح و بہبود کے لیے حکومتی اقدامات کے علاوہ غیر سرکاری سطح پر انسان دوست اداروں کو اہتمام کرنا چاہیے تاکہ کم آمدن کے باوجود وہ اپنی ضروریات پوری کر سکیں۔

## ۵۔ غرباء کے لیے قانونی امداد کے ادارے کا قیام

موجودہ دور میں معاشرتی، برادری اور خاندانی نظام کئی مسائل کا شکار ہے۔ معاشرے کا ایک بڑا طبقہ ایسا ہے جو غربت اور تنگدستی کی وجہ سے اپنے مقدمات کا خرچ نہیں اٹھا پاتا۔ ان سب باتوں کا تقاضہ ہے کہ فلاحی و رفاہی انجمنوں کے زیرِ انتظام غریبوں، تنگدستوں اور ناداروں کے لیے قانون اور شوریٰ کا بندوبست کیا جائے تاکہ غریب لوگوں کو قانونی مدد مل سکے۔

## ۶۔ یتیم خانے

اسلام نے یتیم کے ساتھ ظلم و زیادتی اور بے انصافی کو اسے ختم کر کے ان کو قابل رشک درجہ عطا کیا۔ چنانچہ مسلم معاشرے میں یتیم ہمیشہ قابل احترام رہا ہے۔ انسانی خدمت کے کاموں میں یتیم خانوں کا قیام نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ یتیم خانوں کے قیام سے بچوں کی ضروری غذا کے مناسب انتظام کے ساتھ ساتھ ان کی مکمل پرورش ہوتی ہے۔

## ۷۔ بیوہ اور مطلقہ خواتین کی پناہ گاہیں

بعض تنہا اور بے سہارا خواتین کے لیے فوری پناہ گاہ اور زندگی کو از سرِ نو شروع کرنے کے لیے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی عملی صورت یہ ہے کہ انسانی خدمت کے مخیر ادارے ان خواتین کے لیے پناہ گاہیں بنائیں جن میں انہیں ایک مقررہ مدت کے لیے پناہ دی جائے۔ جہاں انہیں سماجی حوالوں سے آگاہی کے ساتھ ساتھ بہتر روزگار کے لیے رہنمائی بھی فراہم کی جائے۔

## ۸۔ قدرتی آفات اور حادثات کے وقت امداد

قدرتی آفات کا آنا ایک فطری اور قدرتی عمل ہے جیسے زلزلے، سیلاب، طوفان اور تباہ کن بارشیں۔ اسی طرح حادثات کا وقوع پذیر ہونا بھی ایک ناگہانی آفت ہے، جس میں ریلوں اور بسوں کے حادثات، مکانات گرنے، قحط سالی، آگ لگ جانا وغیرہ شامل ہیں۔ ایسے موقع پر انسانی خدمت کے رفاہی اداروں اور تنظیموں کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے اور یہ متاثرہ لوگ بھی ان کی طرف ہی دیکھتے ہیں۔ لٰہذا ان اداروں کو چاہیے کہ اپنے کارکنوں اور شریک کار لوگوں کی ذہنی و عملی تربیت کریں۔ کچھ رضاکار ضروری بچاؤ اور امداد کے لیے ہمہ وقت تیار رکھیں تاکہ ان حالات کا مقابلہ کیا جاسکے۔

## ۹۔ صاف پانی کا بندوبست

انسانی خدمت کے کاموں میں اہم کام ضرورت کا پانی مہیا کرنا ہے۔ پانی انسان کی بنیادی ضرورت اور بقاو حیات کا ذریعہ ہے۔ ضرورت مندوں کو پانی مہیا کرنے کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں جن میں کنویں کھدوانا، ہینڈ پمپ لگانا، ٹیوب ویل لگانا اور شاہراہوں پر سبیلیں لگانا شامل ہیں۔

## خلاصۂ کلام

حقیقت یہ ہے کہ انسانی خدمات کا تصور اب ایک جامع شکل اختیار کر چکا ہے۔ محض چند مسائل کی طرف توجہ دینا، تھوڑا بہت کارِ خیر کر دینا، ترقی اور خوشحالی کے لیے دو چار قدم اٹھا دینا، انسانی خدمت نہیں ہے بلکہ ٹھوس منصوبہ بندی، خصوصی فنی مہارت، تربیت اور منظم اور معروضی حالات کے پیشِ نظر موثر طریقہ کار کے ذریعے سماجی مسائل کا حل ممکن ہے۔ آج ہم جس شعبے پر نگاہ ڈالتے ہیں ہمیں محرومی، مایوسی، بددلی اور انتشار کی کیفیت نظر آتی ہے۔ اس کی بنیادی وجوہات مطالعہ و تحقیق کی کمی، حقیقت پسندانہ منصوبہ بندی کا فقدان اور جذبہ خدمت سے سرد مہری ہے۔ آج کے دور میں نہ صرف سرکاری بلکہ عوامی سطح پر بھی انسانی خدمت کے شعور کو بیدار کرنے اور اسے پھیلانے کی اشد ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ اسلام میں حقوق العباد پر بہت زیادہ زور دیا

گیا ہے اور انسانی خدمات کے تصور میں لوگوں کے حقوق کا خیال رکھتے ہوئے رفاہی و سماجی کام کے ذریعے آخرت میں اجر حاصل کیا جاسکتا ہے۔ غریب، نادار اور مستحق افراد کی خدمت ایک بہت بڑی عبادت ہے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ معاشرے میں رفاہی کاموں کو فروغ دیا جائے۔

# اسلام میں انسانی خدمت کی اہمیت

ڈاکٹر عائشہ جدون *،ڈاکٹر عمر سلیم **

## تعارف

اسلام انسانیت کی بقااور سلامتی کے لیے کوشاں رہنے کی ترغیب دیتا ہے۔انسانی جان کا تحفظ مقاصدِ شریعہ میں سے ہے، اس لیے انسانی خدمت کا دائرہ بہت وسیع ہے۔اس دائرہ میں کسی کو علم کی روشنی سے منور کرنا، کردار وسیرت سازی کے لیے مشعل راہ بننا،علوم وفنون سکھانا، کسی بھی شعبے میں مہارت کی صورت میں اس کو آگے لوگوں میں عام فائدے کے لیے منتقل کرنا،علمی یا فنی درسگاہیں قائم کرنا، ہسپتال اور لائبریریاں قائم کرنا، جنگ کی صورت میں لوگوں کی مدد کرنااور بنیادی سہولیات کی فراہمی میں مختلف تنظیموں کے ساتھ مل کر یاانفرادی طور پر حصہ لیناوغیرہ شامل ہیں۔ مصیبت زدہ کی مدد ہو یا قدرتی آفات اور حادثات کی صورت میں ابتدائی طبّی امداد ہو یا اجتماعی سطح پر مصائب میں گھرے ہوئے لوگوں کی دیکھ بھال،اور یا مستقل طور پر فلاح وبہبود کے لیے وقف کا قیام وغیرہ ،اسلام کی تعلیمات بہت واضح ہیں۔ان تعلیمات کا بنیادی وصف کسی علاقے، نسل، قوم، مذہب اور خطے کے امتیاز سے قطع نظر بلاامتیاز انسانی خدمت ہے۔اس حوالے سے معاصر تصورات کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اور بھی متعدد مختلف تنظیمیں

* لیکچرار، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز،اسلام آباد

** اسسٹنٹ پروفیسر، غلام اسحاق خان انسٹی ٹیوٹ، ٹوپی

خدمتِ خلق کے لیے نہ صرف علاقائی بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی فعال ہیں۔ ان تنظیموں کے منشور کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اہداف میں بھی آفات و جنگوں کی صورت میں عام مدد کی فراہمی ہے۔ اس مقالہ میں اسلام میں انسانی خدمت کی اہمیت کا تجزیہ پیش کیا جائے گا۔

## اسلام امن وسلامتی کا پیامبر

اسلام 'سلم' سے ماخوذ ہے جس کے معنی امن کے ہیں۔ لہذا اسلام کی روح امن کی روح ہے۔ قرآن کی بیشتر آیات اور احادیث مبارکہ بھی براہ راست یا بالواسطہ، امن اور سلامتی کے موضوع پر مبنی ہیں۔ جس طرح ہر چیز کے لیے آداب اور قواعد موجود ہیں، اسی طرح قرآن مجید میں بھی تنازعات اور باہمی اختلافات کے حل کے لیے اصول اور آداب بیان کیے گئے ہیں، جن کی پابندی یقینی طور پر اجتماعی سطح پر امن وامان کی بحالی اور انفرادی سطح پر تعلقات کی بہتری کا باعث بنے گی۔ قرآن کریم میں حکمت کے ساتھ برائی کے خاتمے کا نتیجہ نہایت خوبصورتی سے بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ ''اچھائی اور برائی برابر نہیں ہو سکتی۔ بھلائی کے ساتھ (بُرائی) کو دور کیجئے، اور آپ دیکھیں گے کہ وہ شخص جس کے اور آپ کے درمیان دشمنی تھی، ایسا ہو جائے گا گویا کہ وہ آپ کا دوست ہے۔''[۱]

## انسانی خدمت کے معاصر تصورات

تقریباً تمام مذاہب میں مصائب کی صورت میں تعاون اور مدد کا نظریہ کسی نہ کسی صورت میں ضرور موجود ہے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ قدرتی آفات کی صورت میں رنگ و نسل کی تفریق کے بغیر بین الاقوامی اور علاقائی سطح پر بہت سی تنظیمیں کام کرتی ہیں۔

انٹر نیشنل ریڈ کراس اور ریڈ کریسنٹ موومنٹ دنیا کا سب سے بڑا انسانی نیٹ ورک ہے جس کا مشن انسانی مصائب کو دور کرنا، زندگی اور صحت کی حفاظت کرنا اور انسانی وقار کو بالخصوص مسلح

[۱] فصلت: ۳۴

تنازعات اور دیگر ہنگامی حالات کے دوران برقرار رکھنا ہے۔[2] آل ہینڈز اینڈ ہارٹس بنیادی طور پر امریکہ کی ایک غیر منافع بخش تنظیم ہے جو کہ قدرتی آفات سے متاثرہ کمیونٹیوں کی فوری اور طویل المدتی ضروریات کو رضاکاروں، شراکت دار تنظیموں اور مقامی کمیونٹیز کے ذریعے حل کرتی ہے۔[3]

اسی طرح داسالویشن آرمی، ایک بین الاقوامی تحریک ہے، یہ تحریک عالمگیر کرسچن چرچ کا حصہ ہے اور کتاب مقدس کی تعلیمات سے عبارت ہے۔ اس کا پیغام بائبل پر مبنی ہے۔ اس کا مشن مسیح کی تعلیمات کی تبلیغ اور اس کے نام پر انسانی ضروریات کو بلاامتیاز پورا کرنا ہے۔ ڈائریکٹ ریلیف انٹرنیشنل ایک ایسی امدادی تنظیم ہے، جس کا مشن غربت یا ہنگامی حالات سے متاثرہ لوگوں کی صحت اور زندگی کو بہتر بنانا ہے۔[4] پاکستان میں ایدھی فاونڈیشن اور دوسری کئی اور تنظیمیں بھی رنگ و نسل، جنس اور مذہب کے امتیاز سے ماوراء خدمتِ خلق میں کوشاں ہیں۔[5]

## انسانی خدمت کے معاصر اصول

انسان دوست تنظیموں میں سے بیشتر کے اصولوں میں انسانیت کی بلا تمیزِ نسل و مذہب خدمت شامل ہے۔ اور اسلامی تعلیمات کا جائزہ لینے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اصول اسلام میں بھی بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ ذیل میں انسانیت کی خدمت کے حوالے سے اسلامی تصورات پر روشنی

[2] ریڈ کراس کی بین الاقوامی کمیٹی (آئی سی آر سی)، انٹرنیشنل فیڈریشن آف ریڈ کراس اور قومی انجمنوں پر مشتمل بین الاقوامی تحریک میں ہر عنصر اپنی علیحدہ شناخت اور کردار کے باوجود سات بنیادی اصولوں پر کاربند ہیں، جن کا ذکر کتاب کے آغاز میں آچکا ہے۔

[3] کمیونٹی اور رضاکارانہ مشغولیت کے ذریعے یہ تنظیم اپنی سمارٹ رسپانس حکمت عملی کا استعمال کرتے ہوئے قدرتی آفات کے بعد جلد استحکام کے سفر میں خاندانوں کی مدد کرنے پر توجہ دیتی ہے۔ ایسا کرتے ہوئے، اس عمل میں یہ تنظیم اپنے رضاکاروں اور ان کمیونٹیز دونوں کے استحکام کو ملحوظ خاطر رکھتی ہے۔

[4] براہ راست اور ہدف شدہ امداد کی روایت، جو اس انداز میں فراہم کی جاتی ہے جس میں لوگوں کے احترام کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے، اس تنظیم کے قیام کے بعد سے ہی اس کی پہچان رہی ہے۔

[5] Edhi Foundation, Accessed 18.10.2021 https://edhi.org/9

ڈالی جائے گی۔

## اسلام میں انسانی خدمت کا تصور

اسلام انسانیت کی بقاءاور وحدانیت کا قائل ہے۔ اسلامی تعلیمات اجتماعی مفاد پر تو محیط ہیں ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلام میں انفرادی مصالح کو بھی ملحوظِ خاطر رکھا گیا ہے۔ذیل میں اسلام میں اس تصور کے مختلف مظاہر پر روشنی ڈالی جائے گی۔

## اسلام میں انسانی جان کا تقدس اور مقام

قرآن کریم نے ایک انسان کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیا ہے[۶] اور باہم دشمنی اور فرقہ بندی کو تباہی کا راستہ بتایا ہے۔[۷] اسلام بلا تفریق و امتیاز سب کے لیے مدد اور تعاون کا درس دیتا ہے۔ اور بالخصوص مؤمنین کو ایک ہی عمارت یا ایک ہی جسم سے تشبیہ دیتا ہے جس کا ہر حصہ ہر دوسرے حصے سے براہِ راست متعلق ہوتا ہے۔ حضرت ابو موسیٰ فرماتے ہیں رسول کریم نے فرمایا:

> الْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهُ بَعْضًا[۸]
>
> ایک مومن دوسرے کے لیے بمنزلہ عمارت کے ہے جس کا ایک حصہ دوسرے حصوں مضبوط کرتا ہے۔

## مشکل کشائی ایک مستحسن امر

اسلام حاجت روائی کو ایک مسلمان کی شان گردانتا ہے۔ اور جو شخص کسی کی حاجت روائی میں مشغول رہتا ہے، اس کو اللہ کی جانب سے مدد اور مشکل کشائی کی بشارت کی نوید بھی دیتا ہے۔

---

[۶] المائدہ: ۳۲

[۷] آل عمران: ۱۰۳

[۸] أحمد بن حنبل الشيباني، مسند أحمد بن حنبل، القاهرة: مؤسسة قرطبة، حدیث نمبر: ۱۹۶۴۰ تعلیق شعیب الأرنؤوط: إسناده صحيح على شرط الشيخين

ایک روایت میں مذکور ہے:

عَنِ ابْنِ شِهَابٍ أَنَّ سَالِمًا أَخْبَرَهُ أَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ عُمَرَ ، رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا أَخْبَرَهُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صلى الله عليه وسلم قَالَ: الْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ لاَ يَظْلِمُهُ، وَلاَ يُسْلِمُهُ ، وَمَنْ كَانَ فِي حَاجَةِ أَخِيهِ كَانَ اللَّهُ فِي حَاجَتِهِ ، وَمَنْ فَرَّجَ عَنْ مُسْلِمٍ كُرْبَةً فَرَّجَ اللَّهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرُبَاتِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ[9]

ابن شہاب سے مروی ہے، سالم نے ان کو خبر دی کہ حضرت عبداللہ بن عمر نے ان کو خبر دی کہ رسول اللہ نے فرمایا: مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے نہ تو اس پر ظلم کرتا ہے نہ ہی اس کو دشمن کے حوالے کرتا ہے اور جو کوئی اپنے بھائی کی حاجت براری میں مشغول رہتا ہے، اللہ بھی اس کی حاجت روائی کرتے ہیں، اور جو کسی مسلمان سے تکلیف کو دور کرتا ہے اللہ اس سے قیامت کے دن کی تکلیف کو دور کرے گا، اور جو کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا اللہ بھی قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی فرمائے گا۔

## حلف الفضول بلا تفریق انسانی خدمت کا بہترین نمونہ

منصبِ نبوت پر فائز ہونے سے پہلے رسول اللہؐ کی زندگی کے مشہور مقامات میں سے ایک دار عبداللہ بن جدعان تھا۔ اس جگہ پر حلف الفضول منعقد ہوا تھا۔ اس موقع پر نبی کریمؐ شریک ہوئے۔ اس وقت آپ نوجوان تھے۔ نبوت ملنے کے بعد آپؐ نے ایک مرتبہ فرمایا: ''میں دار ابن جدعان میں حلف الفضول کے موقع پر شریک ہوا تھا۔ مجھے اب بھی اگر اس معاہدہ کو زندہ کرنے کی دعوت دی جائے تو میں اسے قبول کر لوں گا کیونکہ مجھے یہ معاہدہ سرخ اونٹوں سے کہیں زیادہ عزیز ہے۔''[10]

یہ معاہدہ دادرسی کی عمدہ مثال ہے۔ جس میں قبیلہ و عصبیت سے ماوراء انسانی خدمت کا تصور موجود تھا۔ یہ اسلام سے قبل ایک معاہدہ تھا اور اسلام کی آمد کے بعد انسانی خدمات کے میدان میں

[9] صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۲۴۴۲

[10] عماد الدین عمر بن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، دار المنار، ۲۰۰۱، ج ۲، ص ۲۸۹

اس اصول کے ساتھ ساتھ رنگ و نسل کے امتیاز سے ماوراء انسانی بنیادوں پر خدمت خلق کی نہ صرف تعلیم دی گئی بلکہ عملی مثالیں بھی قائم کی گئیں۔ حضور کا ارشاد ہے کہ مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اور وہ شخص اللہ کو زیادہ محبوب ہے جو اس کے کنبے کے لئے زیادہ مفید ہو۔ اسی طرح ایک اور موقع پر فرمایا کہ لوگوں میں سے اللہ کے ہاں سب سے پسندیدہ وہ ہیں جو انسانوں لئے زیادہ نفع بخش ہوں۔

## نتائجِ بحث

اسلام انسانوں کو ان بنیادوں پر تقسیم نہیں کرتا جو خود انسان کی اختیار کردہ نہیں ہیں۔ انسان کی پیدائش کا مقام، اس کا رنگ اور شکل و شباہت، اس کا خاندان اور نسل، اور اس کی زبان ایسے امور ہیں جو انسان کے اختیار کردہ نہیں ہیں۔ تاہم زندگی گزارنے کا طریقہ اپنانے کے لیے انسان کو مشاہدے کے لیے حواسِ خمسہ اور غور و فکر کرنے کے لیے دل و دماغ عطا کیا گیا ہے۔ پھر ہر دور میں اس کے سامنے ماضی اور حال کی ایسی مثالیں موجود رہی ہیں جن سے وہ سبق حاصل کر سکتا ہے۔ اس سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ نے ہر قوم اور ہر دور کے لیے الہامی رہنمائی کا اہتمام کیا ہے۔ لہٰذا انسان کی برائی اور بھلائی کا انحصار اس کے خیالات و نظریات پر رکھا گیا ہے۔ اور یہی وہ بنیاد ہے جس پر اسلام انسانوں کے درمیان ایک لکیر کھینچتا ہے۔ حق کو پہچاننا اور اس پر عمل کرنا، یا اس سعادت سے محروم رہنا ہی انسانوں میں امتیاز کی واحد وجہ ہے۔

یہ درست ہے کہ اسلام نے توحید، رسالت اور آخرت پر ایمان کو فلاح کا مدار قرار دیا ہے اور اہلِ اسلام کو ایک ملّت قرار دے کر انہیں باہم ایک دوسرے کی معاونت اور مدد پر ابھارا ہے لیکن اسلام کا دامن اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ اللہ نے انسانوں کو مجموعی طور پر اپنا خلیفہ قرار دیا ہے اور ان میں سے ہر ایک کی جان کو حرام قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف عام حالات میں بلکہ جنگی حالات میں بھی انسانوں کی جان، مال اور آبرو کے احترام کا درس اسلام کی نمایاں ہدایات میں سے ہے۔ اللہ نے اپنی حکمت کے تحت ہر انسان کو عقیدے کی جو آزادی دی ہے، اس کی بنیاد پر کسی کو ہمدردی اور رحم سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی متعدد مثالیں ہمیں قرآن و سنت سے ملتی ہیں

جن میں سے بعض کا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے۔

یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ دنیا بھر میں سرگرم بڑی امدادی ور فاہی رضاکار تنظیموں میں سے بیشتر ایسی ہیں جو انسانیت کی خدمت کا سبق مذہب سے حاصل کرتی ہیں۔ خود ریڈ کراس تحریک کا بنیادی محرک بھی عیسائیت کی تعلیمات ہی تھیں۔[11] اسلامک ریلیف، مسلم ہینڈز انٹرنیشنل، اسلامک ایڈ اور متعدد دیگر تنظیمیں بین الاقوامی سطح پر کام کر رہی ہیں۔ ان کے بنیادی اصول اور کام کرنے کا جذبہ تو اسلام سے ماخوذ ہے لیکن ان کی امدادی سرگرمیاں ہر طرح کی مذہبی، نسلی، علاقائی، لسانی، یا صنفی تقسیم سے بالاتر ہیں۔ پاکستان میں کام کرنے والی متعدد انسان دوست تنظیمیں بھی بلا تفریق انسانیت کی خدمت میں مصروف ہیں۔ ایدھی فاؤنڈیشن، خبیب ٹرسٹ اور الخدمت فاؤنڈیشن سمیت بعض پاکستانی سماجی تنظیمیں دیگر ممالک میں بھی انسانی خدمات سرانجام دے رہی ہیں یا ہنگامی حالات میں انسانیت کی خدمت کرتی رہی ہیں۔

ایسا اسی لیے ممکن ہے کہ انسانی خدمت کا اسلامی تصور نہ صرف معاصر تصورات سے ہم آہنگ ہے بلکہ متعدد حوالوں سے اِن سے زیادہ مؤثر اور جامع بھی ہے۔ اسلام میں انسانی خدمت کی تعلیمات آفاقیت اور انسانیت پر مشتمل ہیں جو مسلم افراد اور اداروں کے لیے بلا امتیازِ رنگ و نسل، مذہب و سیاسی وابستگی انسانی خدمت کی راہیں کھولتی ہیں۔

[11] سید ندیم فرحت، ضیاء اللہ رحمانی، ''اسلام اور تکریمِ انسانیت کے اصول''، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد۔ ۲۰۲۱ء، ص ۲۲ تا ۲۸

# ریاستِ مدینہ میں انسانی خدمات کے لیے وسائل کی فراہمی

ڈاکٹر حافظ وقاص خان*، اسامہ حمید**

اسلام کے بنیادی مقاصد پر ایک نظر سے ہی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلامی شریعت انسانی جان اور آبرو کی حفاظت کی ضامن ہے۔ نہ صرف تاریخ میں بلکہ عصرِ حاضر میں بھی رنگ، نسل، علاقے یا مذہب کی تقسیم تنازعات، تباہی، یہاں تک کہ انسانی خدمات میں رکاوٹ کا سبب بنتی ہے۔ عہد نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اس تفریق کا خاتمہ ہوا اور آپؐ نے ریاست کی بنیاد رکھنے کے ساتھ ہی مالی و انسانی وسائل کو حرکت میں لا کر تکریمِ انسانی کے وہ نمونے پیش کیے جو رہتی دنیا تک لائقِ تقلید ہیں۔

اس مقالے میں ریاستِ مدینہ کی جانب سے کیے جانے والے ان اقدامات کی نشاندہی کی گئی ہے جن کا مقصد انسانی خدمات کے لیے مالی و انسانی وسائل کی فراہمی تھا۔ اس تجزیہ کے ساتھ عصرِ حاضر کے لیے ایک متوازن لائحہ عمل پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ریاستِ مدینہ میں انسانی خدمات کے جذبے کے معاشرے پر اثرات، عصرِ حاضر میں انسانی خدمات میں حائل رکاوٹوں، انسانی خدمات کے حوالے سے ریاست کی ذمہ داری، اور ممکنہ حکمتِ عملی کو زیرِ بحث لاتے ہوئے ایسی تجاویز اور سفارشات مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن سے اجتماعی اور انفرادی طور پر انسانی

* لیکچرار، شعبہ علومِ اسلامیہ، رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی، اسلام آباد

** انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد

خدمت کے لیے راہنما اصول واضح ہو سکیں۔

## اہم مباحث

اسلامی تاریخ و روایت میں رسول اللہ ﷺ کی تشکیل کردہ ریاستِ مدینہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ریاستِ مدینہ کے خدوخال، اس میں ریاستی امور کو چلانے کے لیے اختیار کی گئی حکمتِ عملی، ذمہ داران کے تقرر اور صحابہؓ میں سے مختلف امور کے لیے متعین کردہ ذمہ داران کے طرزِ عمل کا مطالعہ ہر دور کی طرح عصرِ حاضر میں بھی انتہائی اہم ہے۔ ریاستِ مدینہ کا ایک اہم پہلو انسان کی تکریم اور انسانی خدمت ہے جو رنگ، نسل اور مذہب سے بالاتر ہے۔

## ریاست کا مفہوم

ریاست مدینہ کو سمجھنے سے پہلے ضروری ہے کہ ریاست کا بنیادی مفہوم مختصراً بیان کر دیا جائے۔ ریاست سے مراد ایک ایسا جغرافیائی خطہ ہے جہاں موجود آبادی بااختیار حکومت کے تحت منظم ہو۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی کتاب اسلامی ریاست میں ریاست کا مفہوم اس طرح بیان کیا گیا ہے:

ریاست وہ ہیئت سیاسی ہے جس کے ذریعے ایک ملک کے باشندے ایک باقاعدہ حکومت کی شکل میں اپنا اجتماعی نظم قائم کرتے ہیں اور اسے قوت قاہرہ اور قوت نافذہ کا امین قرار دیتے ہیں۔ انسان نے اپنی تہذیبی زندگی کے آغاز سفر ہی میں اس ادارے کی ضرورت کو محسوس کر لیا تھا اور پوری انسانی تاریخ، ریاست کے قیام و استحکام، اس کی تنظیم و تہذیب اور اس کے فروغ و ارتقاء کی تاریخ ہے۔[1]

مذکورہ عبارت سے ریاست کی اہمیت کا ادراک ہوتا ہے، یعنی پوری انسانی تاریخ ریاست کے استحکام اور فروغ کے عنوان سے عبارت ہے۔

---

[1] سید ابوالاعلیٰ مودودی، اسلامی ریاست، لاہور، اسلامک پبلیکیشنز، ۱۹۹۸ء، ص ۱۷

اسلامی ریاست کے ضمن میں ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ لکھتے ہیں:

اسلامی نظام میں ریاست اور دین و مذہب ساتھ ساتھ چلتے ہیں، دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں، دونوں ایک دوسرے کے مددگار ہیں، دونوں کے تقاضے ایک دوسرے سے پورے ہوتے ہیں۔ چنانچہ ماوردیؒ نے یہ بات لکھی ہے کہ جب دین کمزور پڑتا ہے تو حکومت بھی کمزور پڑ جاتی ہے اور جب دین کی پشت پناہ حکومت ختم ہوتی ہے تو دین بھی کمزور پڑ جاتا ہے، اس کے نشانات مٹنے لگتے ہیں۔[۲]

گویا ڈاکٹر غازیؒ اسلامی نظام میں ریاست کی اہمیت بیان کرتے ہوئے اس رائے پر تنقید بھی کرتے ہیں جو دین اور ریاست کی تفریق کی قائل ہے، ساتھ ہی دین کے استحکام کو ریاست کے استحکام سے مشروط گردانتے ہیں۔

## اسلامی تعلیمات میں اصولِ انسانیت

انسانوں کے باہم رویّے کے حوالے سے قرآن نے جو مسلم اصول پیش کیا ہے وہ اتنا واضح اور جامع ہے کہ دنیا کے کسی بھی خطے میں اس پر عمل کی جائے تو دنیا میں رونما ہونے والے تنازعات سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ سورۃ المائدہ کے آغاز میں اس اصول کو بیان کیا گیا ہے۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى[۳]

کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

یہ وہ بنیادی اصول ہے جو بنی نوع آدم کی عزت، تکریم، عدل و انصاف کے رویہ کی جانب راہنمائی کرتا ہے کہ کسی بھی قوم یا شخص سے دشمنی کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ انصاف کا دامن

---

[۲] ڈاکٹر محمود احمد غازی، محاضرات شریعت، لاہور، الفیصل ناشران، ۲۰۰۹، ص ۲۸۷

[۳] المائدہ: ۸

ہاتھ سے جانے دو اور بے اعتدالی کی روش پر چلتے ہوئے فحش الزامات اور جھوٹے بیانات دینا شروع کردو بلکہ ہر حال میں عدل کا رویہ اختیار کرو جو تمہیں تقویٰ کے قریب لے جائے گا۔

اسلامی شریعت کے مقاصد کا محور بھی انسان ہی کو تصور کیا جاتا ہے، اہلِ علم نے مقاصد شرعیہ کو مختلف انداز میں بیان کیا ہے۔

## مقاصدِ شرعیہ اور انسان

ابو حامد الغزالیؒ مقاصد شریعت کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

شریعت کا مقصد خلق خدا کے سلسلے میں پانچ چیزوں سے عبارت ہے، وہ یہ کہ ان کے دین، جان، عقل، نسل اور مال کی حفاظت کی جائے۔ ہر وہ چیز جو ان پانچ بنیادی چیزوں کی حفاظت کرنے والی ہو مصلحت شمار ہو گی اور ہر وہ چیز جو ان بنیادوں کے لیے خطرہ ہو، مفسدہ شمار ہو گی جسے دور کرنا مصلحت قرار پائے گا۔[۴]

مذکورہ مقاصد شرعیہ یعنی حفظِ دین، حفظِ جان، حفظِ عقل، حفظِ نسل اور حفظِ مال بتاتے ہیں کہ شریعت کے مقاصد کا مطمح نظر دراصل انسان ہی ہے۔ ان سب کا مشترکہ ہدف یہ ہے کہ انسان بلاخوف وخطر ایک خوشگوار زندگی بسر کر سکے۔

امام ابن تیمیہؒ ان علماء میں شامل ہیں جن کے بقول مقاصدِ شریعت کو پانچ امور تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ آپ نے اس رائے پر بھی تنقید کی ہے جس کے مطابق مقاصدِ شرعیہ کی فہرست کو صرف ان چیزوں تک محدود کر دیتے ہیں جن کے تحفظ کے لیے شریعت نے کوئی حد یعنی سزا مقرر کی ہو۔

آپ لکھتے ہیں "دنیا میں (حصولِ منفعت کی مثال) وہ معاملات اور سرگرمیاں ہیں جن میں عام لوگوں کی بھلائی مضمر ہو خواہ ان سے متعلق کوئی حد شرعی مقرر کی گئی ہو یا نہیں اور دین میں

---

[۴] ابو حامد الغزالی، المستصفیٰ فی اصول الفقہ، قاہرہ، مطبعہ امیریہ بولاق، ۱۳۲۲ھ، ج ۱، ص ۲۸۷

(حصولِ منفعت کی مثال) وہ احوال و معارف، عادات اور زہد کی باتیں ہیں جن میں انسانوں کی بھلائی مضمر ہے جن سے شریعت نے منع نہ کیا ہو، جن لوگوں نے مصالح کو ان سزاؤں سے وابستہ کر دیا جو فساد کو دور رکھنے کے لیے مقرر کی گئی ہیں یا جو اموال یا جسم انسانی کو محفوظ رکھنے کے لیے مقرر کی گئی ہیں ان میں انہوں نے کوتاہی برتی ہے''[۵]

امام ابن تیمیہؒ نے مقاصدِ شریعت کو جو وسعت دی ہے، وہ بھی دراصل انسانوں کی بھلائی ہی کو بیان کرتی ہے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ شریعت کے بنیادی مقاصد ہی اسلام میں انسانی خدمات کی اساس ہیں اور یہ انسانی خدمات ہر قسم کی وابستگی سے بالاتر ہو کر فراہم کی جائیں گی۔

## ریاست مدینہ میں انسانی خدمات کے لیے انسانی وسائل

ریاستِ مدینہ میں انسانی خدمات کے لیے نہ صرف انفرادی سطح پر اقدامات کیے جاتے تھے بلکہ اجتماعی اور سرکاری سطح پر بھی اس کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ نبی ﷺ کی تعلیمات اور آپ کی عملی رہنمائی کے ذریعے مسلم معاشرہ ایسے افراد کی اجتماعیت کی شکل اختیار کر گیا جن میں سے ہر فرد ہر دوسرے کی زندگی کی فکر کرنے لگ گیا اور اس کوشش میں انفرادی و اجتماعی طور پر شریک ہو گیا کہ دنیا اور آخرت میں جس قدر ممکن ہو دوسروں کے لیے راحت کا سامان کیا جا سکے۔ دوسروں کے لیے راحت اور تسلی کا سامان کرنے کو اللہ کی رضا اور اس کی جنت کے حصول کا ذریعہ بتایا گیا، جو ہر مسلمان کی اعلیٰ ترین منزل قرار پا گئی تھی۔ حضرت ثوبانؓ کی رسول اللہ ﷺ سے روایت کردہ حدیث اسی کی مثال ہے کہ آپؐ نے فرمایا: جو آدمی بیمار کی عیادت کرتا ہے وہ جنت کے خُرفہ میں رہتا ہے۔ جب پوچھا گیا کہ جنت کا خُرفہ کیا ہے تو آپؐ نے فرمایا جنت کے باغات۔[۶]

---

[۵] ابن تیمیہ، مجموعۃ الرسائل والمسائل، بیروت، الدار العلمیہ، ۱۹۸۳ء، ج۵، ص۱۷۶

[۶] مسلم بن حجاج بن مسلم القشیری، صحیح مسلم، مترجم: یحییٰ سلطان محمود جلال پوری، لاہور، دار السلام، ۲۰۰۴، حدیث مرفوع، حدیث نمبر: ۲۰۵۳، ج۳، ص۹۸

عیادت کا یہ حکم عام ہے۔ حضرت انسؓ کے بیان کے مطابق رسول اللہؐ کا ایک یہودی خادم بیمار ہوا تو آپؐ اس کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے۔[7]

صحابہ کرامؓ نے غیر مسلم قیدیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی وہ عملی نظیر پیش کی کہ تاریخ اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ جنگ بدر میں جب ستر قیدی ہاتھ آئے اور آپ ﷺ نے مختلف صحابہ کرامؓ کے درمیان ان کو دیکھ بھال کے لیے تقسیم کیا اور بہتر سلوک کی ہدایت دی تو صحابہ کرامؓ نے ان کے ساتھ حیرت انگیز حسن سلوک کا معاملہ کیا۔ خود بھوکے رہے یا روکھا سوکھا کھایا، مگر انھیں اچھا کھلایا پلایا۔

## سرکاری حیثیت میں انسانی خدمات

نبی ﷺ نے ریاستِ مدینہ کے سربراہ کی حیثیت میں جو انسانی خدمات انجام دی ہیں اس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

چھ افراد پر مشتمل بنو ثقیف کا وفد نبی ﷺ سے ملنے آیا تو مسجد نبوی میں ان کے لیے جگہ مختص کی گئی اور خالدؓ بن سعید بن العاص کو ان کی خدمت کے لیے مقرر کیا۔[8]

یہ بنو ثقیف کا وہ غیر مسلم وفد تھا جو نبی ﷺ سے ملاقات کی غرض سے مدینہ آیا تھا، اس وفد کی خدمات کے لیے انہیں سرکاری پروٹوکول دیا اور صحابی حضرت خالدؓ بن سعید بن العاص کی ذمہ داری لگائی کہ ان کی خدمت میں کوئی کمی واقع نہ ہو۔

سرکاری حیثیت میں انسانی خدمات کی ایک اعلیٰ مثال اس وقت سامنے آئی جب مکہ میں قحط کی صورت پیش آئی اور اہلِ مکہ نے بأمر مجبوری ریاستِ مدینہ ہی سے مدد طلب کی۔ عبداللہؓ ابن مسعود اس واقعے کو روایت کرتے ہیں:

---

[7] صحیح بخاری، ج۳، حدیث نمبر: ۶۳۵

[8] محمد عبدالملک ابن ہشام، سیرت ابن ہشام، مترجم: مولوی قطب الدین، لاہور، اسلامی کتب خانہ، ج۳، ص ۱۹۷

عَنْ ابْنِ مَسْعُوْد قَال فأخذتهم سنة حتى أُكُلُوا الْمَيْتَة وَالْجُلُوْد وَالْعِظَام فَجَاءَهُ اَبُوْ سُفْيَان وَنَاس مِّنْ اَهْلِ مَكَّةِ فَقَالُوْا يَا مُحَمَّد تزعم اِنَّكَ بُعِثْتَ رَحْمَة وَاِنَّ قَوْمكَ قَدْ هَلَكُوْا فَادْع الله لَهُمْ فَدَعَا رَسُوْلِ الله صلى الله عليه وسلم فَسُقُو االْغَيْثَ[9]

عبد اللہؓ ابن مسعود فرماتے ہیں کہ اہلِ مکہ کو قحط نے آ لیا یہاں تک کہ وہ مردار، کھال اور ہڈیاں کھانے لگے۔ ابوسفیان اور اہل مکہ میں سے چند افراد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: ''اے محمدؐ، آپ فرماتے ہیں کہ آپ کو رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔ حالت یہ ہے کہ آپ کی قوم ہلاک ہو گئی ہے۔ ان کے لیے بارش کی دعا کریں۔'' آپؐ نے دعا کی تو بارش ہو گئی۔

قابلِ ذکر پہلو یہ ہے کہ دشمن کو بھی مصیبت کی اس حالت میں اگر کسی سے امید تھی تو وہ نبی رحمت ﷺ سے ہی تھی جنہوں نے مدینہ کی ریاست میں انسانی خدمت کے لیے وہ اقدامات کیے تھے جن کی گونج پورے عرب میں موجود تھی۔

اسلام میں انسانیت کی خدمت کی اہمیت سمجھنے کے لیے یہ واقعہ نہ صرف پوری امت مسلمہ کے لیے اسوہ حسنہ ہے بلکہ رہتی دنیا تک احترامِ انسانیت کے لیے بہترین نمونہ ہے۔

ریاستِ مدینہ میں مالی وسائل کے ذریعے انسانی خدمت کی باقاعدہ ہدایات جاری کی گئیں۔ انہی ہدایات کی روشنی میں ایسا انسان دوست معاشرہ وجود میں آیا جس نے چند ہی سالوں میں پوری دنیا کے دلوں کو فتح کر لیا۔

وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِى الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ[10]

---

[9] ابو بکر احمد بن الحسین بن علی بن موسی الخُسرَوجِردی، السنن الکبری، بیروت، دار الکتب العلمیۃ، ۱۴۲۴ھ، ج۳، ص ۴۹۲

[10] النساء: ۳۶

ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو، قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ، اور پڑوسی رشتہ دار سے، اجنبی ہمسایہ سے، پہلو کے ساتھی اور مسافر سے۔

اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں: "اپنے پڑوسیوں کا خیال رکھو ان ان کے ساتھ بھی برتاؤ اور سلوک نیک رکھو خواہ وہ قرابت دار ہوں یا نہ ہوں، خواہ مسلمان یا یہود و نصرانی ہوں۔"[11]

اس حوالے سے حضرت عمرؓ کی جانب سے دی گئی ہدایات بھی قابل غور ہیں۔ حضرت عمرؓ نے بیت المال کے عامل کو غیر مسلم رعایا کی ضروریات کا خیال رکھنے کی ہدایات جاری کیں اور یہ تاویل فرمائی کہ آیت: إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ، وَالْفُقَرَاءُ هُمُ الْمُسْلِمُونَ وَهَذَا مِنَ الْمَسَاكِينِ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ[12] میں فقراء سے مراد مسلم اور مساکین سے مراد اہلِ کتاب کے مساکین ہیں۔

آپ ﷺ نے فرمایا: "مومن وہ نہیں جو خود شکم سیر ہو اور اس کا پڑوسی بھوکا رہے اور وہ اس کے بھوکا ہونے سے باخبر بھی ہو۔"[13]

اس حدیث مبارکہ میں عمومی ہدایت کے ذریعے سے بلا کسی مذہب و قوم کی تفریق کے پڑوسی کے بھوکا رہنے کو ایمان نہ ہونے کی علامت قرار دیا گیا ہے تاکہ ہر شہری کے اندر انسانیت کی قدر کرنے کا اتنا احساس پیدا ہو جائے کہ معاشرے کا کوئی فرد اپنے گھر میں بھوکا نہ سو سکے۔ پھر ساتھ ہی غور طلب پہلو یہ ہے کہ محض یہ احادیث بیان کر کے چھوڑ نہیں دیا بلکہ اس کا عملی نمونہ نہ صرف نبی ﷺ نے اور صحابہؓ نے بھی بن کر دکھایا۔ حضرت ابو بصرہؓ غفاری سے مروی ہے کہ میں قبول

---

[11] حافظ عماد الدین ابن کثیر، تفسیر ابن کثیر، کراچی، دار الاشاعت، ۱۹۸۸، ج ۲، ص ۱۴۵

[12] ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم بن حبیب، الخراج، بیروت، المکتبۃ الازھریۃ للتراث، ص ۱۳۹

[13] احمد بن ایوب طبرانی، المعجم الکبیر، مترجم: غلام دستگیر چشتی، غلام رسول، لاہور، ۲۰۱۶، ص ۲۵۹

اسلام سے پہلے ہجرت کر کے نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو نبی ﷺ نے ایک بکری کا دودھ مجھے دوہ کر دیا، جسے نبی ﷺ اپنے اہل خانہ کے لئے دوہتے تھے۔ میں نے اسے پی لیا اور صبح ہوتے ہی اسلام قبول کر لیا، نبی ﷺ کے اہل خانہ آپس میں باتیں کرتے تھے کہ ہم کل کی طرح آج بھی بھوکے رہ لیں گے۔[14]

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا عمل بھی اس حوالے سے قابل تقلید ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک بار ایک بکری ذبح کرائی اور غلام کو ہدایت کی کہ وہ سب سے پہلے پڑوسی کو گوشت پہنچائے۔ ایک شخص نے کہا: جناب! وہ تو یہودی ہے، آپؓ نے فرمایا یہودی ہے تو کیا ہوا، یہ کہہ کر رسول اکرم ﷺ کا ارشاد نقل فرمایا کہ جبریل نے مجھے اس قدر اور مسلسل وصیت کی کہ مجھے خیال ہونے لگا کہ وہ پڑوسیوں کو وراثت میں حصہ دار بنادیں گے۔[15]

## انفرادی تعاون وامداد

نبی ﷺ کی جانب سے انفرادی تعاون کی بھی متعدد نظیریں ملتی ہیں جو قابل تقلید ہیں۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ (جس کسی نے) اسلام قبول کرنے پر رسول اللہ ﷺ سے جو چیز بھی مانگی آپ نے وہ چیز عطا فرمادی۔ راوی کہتے ہیں ایک آدمی آیا، آپ ﷺ نے دو پہاڑوں کے درمیان جتنی بکریاں تھیں، اسے عطا فرمادیں۔ وہ واپس اپنی قوم کی طرف آیا اور اس نے کہا: اے قوم اسلام قبول کر لو کیونکہ محمد ﷺ اتنا عطا فرماتے ہیں کہ فاقہ کشی کا خوف ہی نہیں رہتا۔[16] رحمت للعالمین ﷺ کی جانب سے اس طرح کی تالیفِ قلب کی وجہ سے قبیلے کے قبیلے

---

[14] امام احمد بن حنبل، مسند احمد، مترجم: محمد ظفر اقبال، لاہور، مکتبہ رحمانیہ، ۲۰۰۴، صحیح، حدیث نمبر: ۶۱۹، ج ۹، ص ۹۷

[15] ابو داوٗد سلیمان بن اشعث السجستانی، سنن ابوداؤد، مترجم: ابوعمار عمر فاروق سعیدی، دارالاسلام، ۲۰۰۲، صحیح، حدیثنمبر: ۲۵۷۸، ج ۳، ص ۶۷

[16] صحیح مسلم، جلد سوم، حدیث نمبر: ۱۵۱۹

مسلمان ہوئے۔

## امدادی سامان کی فراہمی

ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے محض انسانی خدمت کے نظریہ کو فروغ دینے کے لیے آپؐ نے مدینے کی کھجور کی صورت میں اہلِ مکہ کے لیے امداد روانہ کی۔ صلح حدیبیہ سے قبل قریش کی تجارت بند ہوگئی تھی۔ ابو سفیان کا روزگار بھی تجارت پر ہی منحصر تھا۔ آپ ﷺ نے اسے کھجوروں کی اچھی خاصی مقدار بھیجی اور ایک بھلائی یہ کی کہ معاوضے کے نام پر ان سے طائف کا وہ چمڑا خرید لیا جس کا ذخیرہ شامی راستے کی بندش کی وجہ سے راستے میں پڑا پڑا خراب ہو رہا تھا۔[17]

اہلِ مکہ نے مسلمانوں کو تکلیف پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی؛ لیکن جب مکہ میں قحط پڑا، یہاں تک کہ لوگ مردار کھانے پر مجبور ہوگئے تو آپ ﷺ نے مکہ کے قحط زدہ غیر مسلموں کے لئے پانچ سو دینار بھیجے؛ حالانکہ اس وقت مدینہ کے مسلمان خود سخت مالی مشکلات سے دوچار تھے، ردالمحتار کے مطابق پانچ سو دینار کی قدر کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ بیس دینار ساڑھے ستاسی گرام سونے کے برابر ہوتا ہے۔ یہ رقم آپ نے سردارانِ قریش ابوسفیان اور صفوان ابن اُمیہ کو بھیجی کہ وہ اسے تقسیم کردیں، جو اس وقت مسلمانوں کی مخالفت میں پیش پیش تھے اور اہلِ مکہ کے قائدین تھے۔[18]

## شادی کے انتظامات

انسانی خدمت کا ایک طریقہ نکاح کے ذریعے سے انسانی ضروریات پوری کرنا بھی ہے۔ حضرت ربیعہ اسلمیؓ نبی ﷺ کے خدمت گزار تھے، آپ ﷺ نے ان کی شادی کے انتظامات کیے، آپؓ اس شادی کی تفصیل بیان کرتے ہیں: ''نبی ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ ربیعہ تم شادی کیوں

---

[17] ابو عبید القاسم بن سلام، کتاب الاموال، مترجم: عبدالرحمٰن طاہر، اسلام آباد، ادارہ تحقیقات اسلامی، ۲۰۰۱، ص ۹

[18] محمد امین ابن عابدین، ردالمحتار، باب المصرف، لاہور، ضیاء القرآن پبلیکیشنز، ۲۰۱۷، ج ۳، ص ۳۰۲

نہیں کر لیتے؟ تو میں نے عرض کیا کیوں نہیں! آپ مجھے جو چاہیں حکم دیجئے، نبی ﷺ نے انصار کے ایک قبیلے کا نام لے کر، جن کے ساتھ نبی ﷺ کا تعلق تھا، فرمایا ان کے پاس چلے جاؤ اور جا کر کہو کہ نبی ﷺ نے مجھے آپ لوگوں کے پاس بھیجا ہے اور یہ حکم دیا ہے کہ آپ لوگ فلاں عورت کے ساتھ میرا نکاح کر دیں۔ چنانچہ میں ان کے پاس چلا گیا اور انہیں نبی ﷺ کا یہ پیغام سنا دیا، انہوں نے مجھے خوش آمدید کہا اور کہنے لگے کہ نبی ﷺ کا قاصد اپنا کام مکمل کئے بغیر نہیں جائے گا، چناچہ انہوں نے اس عورت کے ساتھ میرا نکاح کر دیا اور میرے ساتھ خوب مہربانی کے ساتھ پیش آئے۔ نبی ﷺ نے میرا ولیمہ بھی کرایا اور کچھ عرصے کے بعد نبی ﷺ نے مجھے زمین کا ایک ٹکڑا مرحمت فرمادیا''[۱۹]

## دولت کی منصفانہ تقسیم کے اقدامات

عہد نبوی ﷺ میں انسانی خدمت کا ایک طریقہ یہ بھی اپنایا گیا کہ ریاستِ مدینہ میں مالیات کا ایک منظم اور مربوط نظام قائم کیا۔ اس حوالے سے پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی لکھتے ہیں:

''عہد نبوی میں مالی نظام کے افسروں کو مقرر کرنے کی نبوی حکمت عملی حکومت اور عوام دونوں کی فلاح و بہبود کے نظریہ پر قائم تھی، حکومت نہ تو محصول دہندگان کا استحصال چاہتی تھی اور نہ وہ ان کو بے لگام دولت سمیٹنے کے لیے آزاد چھوڑنا چاہتی تھی بلکہ جیسا کہ احادیث میں آیا ہے وہ مالداروں کی دولت کے ایک حصے کو وصول کر کے عوام کے غریبوں میں تقسیم کرنا چاہتی تھی۔ اس مقصد عالی کے لیے اس نے جن افسروں کا تقرر کیا ان کے لیے بعض کڑی شرائط اور اہم صفات لازمی بنادی تھیں۔ انتظام و انصرام کی ذاتی صلاحیت، تنظیمی قابلیت، خدا ترسی، انسان دوستی، تقویٰ و امانت داری، دیانت و صلابت اور بلند کرداری سب سے اہم اوصاف تھے جو عاملینِ صدقات کے عہدے پر تقرری کے لیے لازمی تھے، ان کے علاوہ قبائلی و جغرافیائی حالات اور مخصوص سیاسی

[۱۹] مسند احمد، جلد ششم، حدیث نمبر: ۲۳۸۷

محرکات کی رعایت بھی ملحوظ رکھی جاتی تھی۔"[20]

انسانی خدمت کے پیش نظر اسلام نے ہی سب سے پہلے دولت کے مستقل گردش میں رہنے کا تصور پیش کیا تاکہ اس سے ہر شخص مستفید ہو سکے۔ سورۃ الحشر میں اس تصور کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

مَا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَى فَلِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ[21]

جو کچھ بھی اللہ ان بستیوں کے لوگوں سے اپنے رسول کی طرف پلٹا دے وہ اللہ اور رسول اور رشتہ داروں اور یتامی اور مساکین اور مسافروں کے لیے ہے تاکہ وہ تمہارے مالداروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔

اس کے ساتھ ہی ایسا نظام تشکیل دیا گیا کہ دولت چند ہاتھوں میں مرکوز ہونے کی بجائے غرباء تک بھی پہنچ سکے۔ قرآنِ کریم دولت مندوں کے مال میں غریبوں کے اس حصے کو ان کا حق قرار دیتا ہے۔ لہٰذا فرمایا:

وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَعْلُومٌ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ[22]

جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک مقرر حق ہے۔

## انسان دوست قوانین کا اطلاق

ریاست مدینہ میں نبی ﷺ کی جانب سے ایک انسان دوست معاشرہ قائم کرنے کے لیے جو

[20] پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی، عہدِ نبوی ﷺ کا نظام حکومت، علی گڑھ، ادارہ تحقیقات و تصنیف اسلامی، ۱۹۸۸ء، ص۸۹

[21] الحشر: ۷

[22] المعارج: ۲۵

تعلیمات دی گئی تھیں وہ محض نظری بنیادوں پر ہی نہیں تھیں بلکہ اُن ہدایات کے اطلاق کے لیے آپ ﷺ نے بذات خود نگرانی کا عمل بھی کیا ہے اور عمل نہ کرنے والے کو سزا کا مستحق بھی قرار دیا ہے۔ آنحضرت ﷺ ایک غلہ فروخت کرنے والے کے پاس سے گزرے۔ آپؐ نے اپنا ہاتھ اس کے غلہ میں ڈالا تو انگلیوں پر نمی آگئی۔ آپؐ نے پوچھا اے اناج کے مالک یہ نمی کیسی ہے؟ اس نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ اس پر بارش ہو گئی تھی۔ آپؐ نے فرمایا کہ پھر تو نے بھیگے ہوئے اناج کو اوپر کیوں نہ رکھا تاکہ لوگ اسے دیکھ لیتے جو شخص فریب دھوکہ دے اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔[۲۳]

حضرت ابن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے دور میں (تعزیراً) لوگوں کی پٹائی ہوتے ہوئے دیکھی جب وہ تول اور ناپ کے بغیر ہی اناج خریدتے اور اسے اپنے گھر پہنچانے سے پہلے ہی فروخت کر دیتے تھے۔[۲۴]

مذکورہ بالا دونوں واقعات اس امر کی جانب نشاندہی کرتے ہیں کہ انسانی خدمت اگر نصب العین بن جائے تو اس نصب العین کے حصول کی سعی کے لیے وہ تمام اقدامات ناگزیر ہیں جو کہ اس تک پہنچنے کا باعث بنتے ہوں۔

کسی بھی ریاست کی کامیابی کے لیے ضروری امر ہے کہ وہاں کے مالی انتظامات بہتر انداز میں چلائے جائیں، آپ ﷺ نے بھی بحیثیت ریاست کے سربراہ ایک کرپشن فری معاشرہ قائم کیا کہ جہاں دیانت دار کے ساتھ انسان دوستی کی بنا پر ایک دوسرے سے معاملات طے پاتے تھے۔

[۲۳] محمد بن عیسیٰ ترمذی، جامع ترمذی، مترجم: نواب بدیع الزماں حیدر آبادی، ضیاءاحسان پبلشرز، ۱۹۸۸، حدیث نمبر: ۱۰۳۰، حسن صحیح، ج۲، ص۴۶

[۲۴] سنن ابوداؤد، ج۲، حدیث نمبر: ۳۴۹۸

## مفادِ عامہ کے کام

ریاست مدینہ کا ایک بڑا کارنامہ یہ تھا کہ وہاں مفاد عامہ کے لیے اہم اور منظم اقدامات کیے گئے تھے، مدینہ میں عوام کے لیے پینے کے پانی کا بڑا سنگین مسئلہ تھا، اس مسئلے کی سنگینی کا ادراک کرتے ہوئے آپ ﷺ نے بحیثیت حکمران پانی کی فراہمی کو یقینی بنایا۔

## بئر رومہ

"نبی اکرم ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو مدینہ میں بئرِ رومہ کے علاوہ میٹھا پانی نہیں تھا آپ ﷺ نے فرمایا جو شخص اسے خرید کر مسلمانوں کے لئے وقف کر دے گا اس کیلئے جنت کی بشارت ہے۔"[۲۵]

حضرت عثمانؓ کے حصے میں یہ سعادت آئی اور یہودی سے بئر رومہ خرید کر وقف کر دیا۔ پینے کے لیے میٹھا پانی عصر حاضر کا ایک سلگتا ہوا مسئلہ ہے، میٹھے پانی کی فراہمی انسانی خدمت کا بہت بڑا ذریعہ بن گیا ہے جو کہ کسی بھی علاقے کے ارباب و حل و عقد کی بنیادی ذمہ داری ہے۔

## تجاوزات کا خاتمہ

مفاد عامہ کے کاموں میں سے ایک بڑی انسانی خدمت تجاوزات کا خاتمہ ہے اور عصر حاضر میں بھی انسانی معاشروں کو یہ چیلنج درپیش ہے، اس کے بارے میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"خبردار! راستوں میں مت بیٹھو"[۲۶]

## صفائی کا انتظام

مفاد عامہ کے کاموں میں صفائی ستھرائی بہت اہمیت کی حامل ہے اس حوالے سے نبی ﷺ نے

---

[۲۵] جامع ترمذی، ج ۲، حدیث نمبر: ۱۶۹۹

[۲۶] صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۲۴۶۵

ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

راستے سے تکلیف دہ چیز ہٹانا صدقہ ہے۔[27]

اسی طرح حضرت عائشہؓ مدینہ کی زمین کے حوالے سے بیان کرتی ہیں کہ وہاں کی زمین وبازدہ تھی اور وادی بطحان کا پانی نہایت آلودہ تھا۔ آپ ﷺ نے اس وادی کی صفائی ستھرائی کے لیے ایسے اقدامات کیے کہ چند ہی دنوں میں نہایت صاف وشفاف پانی بہنا شروع ہو گیا۔ پھر کہتی ہیں کہ میں نے آپؐ سے سنا: یہ جنت کی نہروں میں سے ایک نہر ہے۔ اس کے بعد آپؐ نے کئی دیگر ندی نالوں کی صفائی کا حکم صادر فرمایا اور کئی نئی نہریں بھی کھودی گئیں۔[28]

## سرسبز وشاداب ماحول کی فراہمی

مدینہ کے ماحول کو سرسبز وشاداب بنانا بھی انسانی خدمت کا ایک بہترین نمونہ تھا جو کہ ریاست مدینہ کے سرپرست کی جانب سے سامنے آیا۔ اس ضمن میں آپ ﷺ نے یہ ہدایات جاری کیں:

"مدینہ کی گیلی (سبز) گھاس جڑ سے نہ اکھاڑی جائے' نہ اس کے درخت ہی کاٹے جائیں' یہاں جو شکار کے جانور ہیں' ان کو بھگایا نہ جائے۔"[29]

عہد حاضر میں جنگلات اور درختوں کے تحفظ کے لیے ادارے بنائے گئے ہیں تاکہ کسی طرح ان قدرتی خزانوں کا تحفظ کیا جائے۔

مدینہ کے ماحول کے لیے آپ ﷺ نے دعائیں بھی مانگی ہیں۔ فرماتے: "اے اللہ! مدینہ کی آب وہوا کو صحت افزا بنادے۔"[30]

---

[27] صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۳۵

[28] عمر بن شبۃ ابوزید النمیری، تاریخ المدینہ لابن شبۃ، السید حبیب محمود أحمد، جدۃ، ۱۳۹۹ھ، ص ۱۶۷

[29] صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۱۳۴۹

[30] صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۳۹۲۶

مفاد عامہ کے حوالے سے یہ وہ اقدامات تھے کہ جس کے پیشِ نظر انسانی خدمت ہی تھی۔

## انسانی خدمات اور عصرِ حاضر

عہد حاضر میں اہلِ اسلام کے اذہان میں انسانی خدمت کا محدود تصور جا گزیں ہے جو محض مسلم معاشروں کی خدمت کی طرف توجہ دلاتا ہے۔اس وقت موجودہ دینی فکر بھی غیر مسلم انسانیت کے ساتھ ایسے تعامل میں ہماری راہنمائی سے قاصر ہے جس کا امت مسلمہ کا مشن تقاضا کرتا ہے۔

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی اس ضمن میں رقمطراز ہیں:

ضروری ہو گیا ہے کہ مسلمان، خواہ وہ مسلم ممالک کی حکومتیں اور ان کے عوام ہوں یا قلیتی ممالک کے عام مسلمان اور ان کی دینی اور سیاسی قیادت ہو، موجودہ حالات کے پیش نظر کتاب و سنت سے از سر نو رہنمائی حاصل کریں۔ نئی رہنمائی اس لیے بھی ضروری ہے کہ قدیم فکر کے زیر اثر بعض مسلمان افراد اور گروہ غلط راہ پر جا پڑے ہیں وہ عام انسانوں کے ساتھ داعیانہ تعامل کی راہیں نکالنے کے بجائے امریکہ، برطانیہ اور بعض دوسرے ممالک کے حکمران ٹولے کی جارحیت کا حوالہ دے کر پورے مغرب کو دشمن اسلام قرار دیے ہوئے ہیں۔[۳۱]

عصر حاضر میں انسانی خدمت کے اس تصور کو از سر نو دنیا کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت ہے جو ریاست مدینہ میں نبی ﷺ اور صحابہ کرامؓ نے عملی طور پر پیش کیا کہ جس میں بلا تفریق رنگ و نسل، مذہب و مسلک، قوم و قبیلے کے محض انسانی خدمت کو نصب العین بنایا گیا تھا۔

ثروت صولت ریاست مدینہ کی منظر کشی کرتے ہیں: وہ عرب جو ذرا ذرا سی بات پر انسان کو قتل کر دیتے تھے وہ اب انسان کی جان کا احترام کرنے لگے۔ جھوٹ، غیبت، دغا، فریب اور وعدہ خلافی کی جگہ صداقت، وفاداری اور اخلاق نے لے لی۔ تجارت اور کاروبار سے سودی لین دین ختم

[۳۱] محمد نجات اللہ صدیقی، مقاصد شریعت، اسلام آباد، ادارہ تحقیقات اسلامی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، ۱۹۸۸، ص۳۸

ہو گیا۔ اسلام کی یہ تعلیمات جن کو مدینہ میں عملی شکل دی گئی وقتی نہیں ہیں۔ ان کی حیثیت دائمی ہے، ان سے ہر زمانے اور ہر دور میں مدد لی جاسکتی ہے۔[۳۲]

عصر حاضر میں بھی انسانی خدمات کے حوالے سے ریاست مدینہ میں کیے جانے والے اقدامات پر عمل کیا جائے تو بآسانی ایک انسان دوست ماحول قائم کیا جاسکتا ہے یہ نہ صرف دنیا میں امن وامان قائم رکھنے کا ایک ذریعہ بن سکتا ہے بلکہ خود اسلام کی دعوت کا اصل اور مثبت رُخ دنیا کے سامنے پیش کیا جاسکتا ہے۔

اس بات کو نجات اللہ صدیقی یوں لکھتے ہیں: ''امت کا مقصود شریعت کا مقصود ہوا، اس مقصد کی ادائیگی کے لیے غیر مسلم انسانیت تک پہنچنا، ان سے ہم کلامی، ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اور ایک ایسی فضا بنائے رکھنا ضروری ہے جس میں وہ اطمینان کے ساتھ مسلمانوں سے معاملات کر سکیں چنانچہ موجود اور معلوم احکام شرعی ایسا ہی نقشہ پیش کرتے ہیں۔ عام انسانوں سے نیک کاموں میں تعاون اس نقشہ کا ایک اہم جزو ہے۔''[۳۳]

اور قرآن مجید کی اس جامع آیت کو زندگی کا نصب العین بناتے ہوئے ایک مربوط حکمت عملی مرتب کرنے کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے تاکہ یہ دنیا ایک مرتبہ پھر امن وسکون کا گہوارہ بن سکے:

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ[۳۴]

جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں ان میں سب سے تعاون کرو اور جو گناہ اور زیادتی کے کام ہیں ان میں کسی سے تعاون نہ کرو۔

---

[۳۲] ثروت صولت، ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، لاہور، اسلامک پبلیکیشنز، ۲۰۱۴، ج ۲، ص ۸۶

[۳۳] مقاصد شریعت، ص ۳۱

[۳۴] المائدہ: ۲

## نتائجِ بحث

ریاست مدینہ اسلام کے نام پر وجود میں آئی تھی لیکن اس ریاست کی اہم خصوصیت وہ انسانی خدمات ہیں جو رنگ، نسل، مذہب سے بالاتر ہو کر انجام دی گئی ہیں۔ فطرتِ انسانی کی بنیاد پر تشکیل کردہ مدنی معاشرہ احترام آدمیت کی بنیاد پر استوار ہوا جس میں فطری طور پر انسانی خدمت کو معاشرت کی بنیاد قرار دیتے ہوئے ریاست کے ہر فیصلے واقدام میں انسانی فلاح کو ترجیح بنا دیا گیا۔ نہ صرف ریاست نے عمومی اور قومی سطح پر اپنے مالی و انسانی وسائل کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا وہاں رعایا کی تربیت بھی اس انداز میں کی گئی کہ وہ ہمہ وقت انسانی خدمت کے لیے اپنا مال، وقت، اور ذاتی صلاحیت استعمال کرنے پر آمادہ رہتے تھے۔ گویا ریاستِ مدینہ میں انسانی خدمت کوئی اضافی یا بتکلف شامل کردہ جز وقتی سرگرمی نہ تھی بلکہ یہ انفرادی واجتماعی مزاج کا لازمی حصہ تھی۔

حالیہ عرصے میں انسانی خدمت ایک مستقل شعبہ اور بہت سے افراد کے لیے ایک پیشہ بن چکا ہے۔ درحقیقت انسانی خدمت کسی بھی فلاحی معاشرے کا ایک اہم جزو ہے، جس کے بغیر معاشرے کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس لیے جہاں انسانی خدمت کے لیے بعض اداروں یا افراد کو مختص کرنے کی اپنی افادیت ہے، وہاں اصل کوشش یہ ہونی چاہیے کہ انسانی خدمت کو ایک مستقل رویے اور شعار کے طور پر فروغ دیا جائے۔ انسانی خدمت اور امداد کے لیے ترجیحات طے کرنا ہمیشہ ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے تاہم اسلامی فکر میں موجود مقاصدِ شریعت کسی بھی ضرورت کی نوعیت اور شدت کے تعین کی بنیاد بن سکتے ہیں۔

یہ بات مسلسل پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ ریاستِ مدینہ میں نبی مکرم ﷺ نے بذاتِ خود انسانی خدمت کا فریضہ سرانجام دیا تھا۔ دورِ حاضر میں بھی قومی سربراہان اور رہنماؤں کو یہ اسوہ اپنانے کی ضرورت ہے۔ انسانی خدمات کی نہ تو فراہمی میں کوئی امتیاز برتنا چاہیے اور نہ ہی انسانی خدمت کے عمل میں کچھ لوگوں کو استثنا ملنا چاہیے۔

# صدارتی کلمات

## محمد عبدالشکور*

جدید دور میں انسانی خدمت کے مظاہر کو سمجھنا، ان میں بہتری لانا، اس کو پورے شعبے کے طور پر متعارف کروانا اور دنیا کو احساس دلانا مسلم اور پاکستانی معاشرت کا ایک اہم پہلو ہے۔ ہم ایسی قوم سے تعلق رکھتے ہیں جو انسانی خدمت میں ایک منفرد لائحہ عمل رکھتی ہے۔ پاکستان میں عام طور پر لوگ ''ایریاز آف کنسرن'' کے حوالے سے گفتگو کرتے ہیں۔ یعنی ان عوامل پر بحث کی جاتی ہے جو ان کے بس میں نہیں ہیں۔ جبکہ ''ایریاز آف انفلوئنس'' پر بہت کم گفتگو کی جاتی ہے اور یہ وہ دائرہ ہے جس میں انسان بہت کچھ کر سکتا ہے اور جو اس کے لیے بآسانی قابل رسائی ہیں مثلاً مکتب، محلہ، شہر وغیرہ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں مقررین کی ایک بڑی تعداد جو چیزیں پڑھ کر آتی ہے اسے ہی دوہراتی ہے اور موجودہ صورتِ حال پر زیادہ غور نہیں کیا جاتا۔ میری تجویز ہے کہ تعلیمی اداروں میں اس موضوع پر سیمینارز منعقد کروائے جائیں کیونکہ جامعات کسی بھی تصور کو تعمیر کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

پاکستان ایک خوش قسمت ملک ہے جس میں گزشتہ ۲۵ سے ۳۰ سالوں میں رفاہی تنظیموں نے انسانی خدمت کے کئی میدانوں میں ترقی کی ہے اور ان میں بہت بڑی تعداد دینی فکر و نظریہ رکھنے والوں کی ہے۔ اس سلسلے میں ان تنظیموں کو پرکھنا، ان کے کام کو دیکھنا اور ان کا ساتھ دینا بہت ضروری ہے اور ان تمام کاموں کو منظم انداز میں سرانجام دینا نہایت اہم ہے۔ اسی طرح صحت کے

---

* صدر، الخدمت فاؤنڈیشن، پاکستان

میدان میں اگر دیکھا جائے تو کئی ہسپتال ایسے ہیں جو انسانی خدمت کا کام سر انجام دے رہے ہیں۔ یہی صورتِ حال تعلیم کے میدان میں بھی نظر آتی ہے۔ لیکن تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ یہ ادارے باہم کس حد تک مربوط ہیں؟

یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ لوگ اپنے عقائد و نظریات کی بنیاد پر ادارے اور تنظیمیں بناتے ہیں اور دوسروں سے ملنے جلنے تک سے گریز کرتے اور ہچکچاتے ہیں۔ ان کو باہم مربوط کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لیے میری تجویز ہے کہ اگر ایک فورم بنا دیا جائے تو اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ رفاہی ادارے اجتماعی طور پر عالمی سطح پر اپنا آپ منوا سکیں گے۔ گزشتہ عرصے میں اس سلسلے میں کئی تنظیموں کے باہم ملنے کا فائدہ یہ ہوا کہ سینیٹ اور قومی اسمبلی کی جانب سے یومِ یتامیٰ منائے جانے کی منظوری دے دی گئی جو کہ اب ہر سال ۱۵ رمضان کو منایا جاتا ہے۔ اسی طرح دیگر میدانوں میں بھی رفاہی اداروں کو ایک فورم پر جمع ہونے کی ضرورت ہے۔ اس فورم کے بنانے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے کام کو دیگر ادارے سمجھیں گے اور ساتھ دیں گے اور ہم بھی ان کے کام کو سمجھ کر اس میں تعاون کریں گے۔

میں سمجھتا ہوں کہ آج کے دور کا جدید نظام کسی نعمت سے کم نہیں ہے۔ اپنے نظریہ پر قائم رہتے ہوئے بدلے ہوئے حالات میں خود کو انسانی خدمت کے قابل بنانے کی ضرورت ہے۔ لہذا موجودہ دور میں اس سلسلے میں ہونے والی تبدیلیوں پر مقالات لکھنے اور اس سلسلے میں اپنے ادا کیے گئے کردار پر مسلسل بات کرنے کی ضرورت ہے۔

# پاکستان میں انسانی خدمات
# امکانات و مسائل

# غیر جانبدار انسانی خدمات اور پاکستان میں اطلاق

اقصیٰ تصغیر *

گذشتہ چند دہائیوں میں مسلح تصادم، ابتر امن و امان، قدرتی آفات و دیگر وجوہات کی بناء پر متاثرہ، بے آسرا و مصیبت زدہ افراد کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے چنانچہ عصرِ حاضر میں انسان دوستی، خیر خواہی اور باہمی تعاون کی اہمیت دوچند ہو چکی ہے۔ خدمتِ انسانیت کے لیے متعدد سرکاری وغیر سرکاری تنظیمیں سر گرمِ عمل ہیں۔ان میں کچھ تنظیمیں ایسی ہیں جن کا خدمت کا جذبہ مذہب کی ترغیب و تعلیم کی بنیاد پر ہے اور بعض دیگر تنظیمیں اس بنیادی وابستگی سے قطع نظر اپنے اس جذبہ کو مذہب سے بالاتر سمجھتی ہیں۔ یہ انسان دوست تنظیمیں احساس و خیر خواہی کا جذبہ لیے انسانیت، غیر جانبداریت اور آزادی کے اصولوں پر خدمات سرانجام دے رہی ہیں۔

دورِ حاضر میں انسانی خدمت کے دائرہ کار کی وسعت کی بناء پر اکثر مذہبی اور سیکولر تنظیموں کے درمیان تعامل مشاہدہ میں آرہا ہے۔ تاہم عام تاثر یہ ہے کہ کسی خاص عقیدے یا مذہب سے وابستہ تنظیمیں اپنی مذہبی شناخت یا مقاصد العمل (ایجنڈا) کی بنا پر غیر جانبدار نہیں ہو سکتیں۔ زیرِ نظر مضمون میں انسانی امداد کے اسلامی اصول و روایات کا مطالعہ کیا جائے گا اور اسلامی اور سیکولر انسان دوست تنظیموں کے درمیان مثبت روابط کے اسلامی نقطۂ نگاہ کو بھی بیان کیا جائے گا تاکہ مستقبل میں وسیع پیمانے پر خدمتِ انسانیت کا فریضہ سرانجام دینے کے لیے محکم و متفق بنیادیں فراہم کی

---

* لیکچرار، گورنمنٹ ایسوسی ایٹ کالج برائے خواتین، بند روڈ لاہور

جا سکیں جو کہ تمام امتیازات سے بالاتر ہوں۔

## فطرت اور انسانی خدمت

اگرچہ انسانی جبلّت میں لالچ اور خود غرضی جیسے منفی جذبات شامل ہیں لیکن فطرتِ انسانی میں رحم، ہمدردی اور محبت جیسے مقدس جذبات واحساسات بھی موجود ہیں۔ خدمتِ انسانیت کا جذبہ فطری اور الہامی ہے۔ انسانوں کی باہم الفت ہی کی وجہ سے خاندان تشکیل پاتے ہیں اور انسانوں کا باہم تعاون ہی معاشرہ تشکیل دیتا ہے۔ انسان فطری طور پر اپنی صلاحیتوں کو صرف خود تک یا اپنے اہل و عیال تک محدود نہیں سمجھتا بلکہ وہ اپنے ارد گرد اور معاشرت کو بھی پروان چڑھانا چاہتا ہے۔ یوں یہ تصوّر تشکیل پایا ہے کہ ہر انسان پر اس کے معاشرہ و مملکت کا بھی حق ہے۔ گویا خدمت کا تعلق کسی خاص رنگ، مذہب، عقیدہ، جنس اور جغرافیہ سے نہیں، انسانیت سے ہے۔ ایسے میں یہ امر لائقِ افسوس ہے کہ آج بنی نوع انسان کی ایک بڑی تعداد نہ صرف قدرتی آفات کی وجہ سے پریشان حال ہے بلکہ اپنے ہم جنسوں کے مسلح تصادم و مہلک ہتھیاروں کے استعمال کی بناء پر بے آسرا و مصیبت زدہ ہے۔

جنگِ عظیم اوّل اور دوم کے بعد زخمیوں، متاثرین اور مہاجرین کی امداد کے لیے غیر سرکاری سطح پر کئی کاوشوں کو منظّم کیا گیا۔ ان تنظیموں نے خدمتِ انسانیت کے تصور کو مزید جِلا بخشی۔ بیسویں صدی کے دوسرے نصف میں متعدد ممالک میں مختلف مقاصد کی تکمیل کے لیے نہ صرف سرکاری بلکہ غیر سرکاری سطح پر بھی خدمتِ انسانیت کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے فلاحی ادارے قائم کیے گئے۔ یوں رفتہ رفتہ انسانی خدمات کے اصول اور ضوابط طے ہوئے، قوانین بنے اور نظریاتی و عملی ارتباط کا آغاز ہوا۔ دورِ حاضر میں تقریباً ہر ملک و قوم اور مذہب سے وابستہ لوگ انسانیت کی فلاح کے لیے کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح سیکولر افراد اور ادارے بھی خدمتِ خلق میں مصروفِ عمل ہیں۔ یہ اس امر کا اظہار ہے کہ خدمتِ انسانیت انسان کے فطری جذبہ کو تسکین دیتی ہے۔

تیزی سے تغیر پذیر دنیا میں انسانی معاشرت کئی طرح سے متاثر ہوئی ہے اور معاشرتی تبدیلیوں کا یہ سلسلہ مسلسل جاری ہے۔ایسے میں دنیا کو ایک وسیع انسانی امدادی نیٹ ورک کی ضرورت ہے جو ذات، نسل، رنگ، ثقافت، عقیدہ، جغرافیہ اور زبان سے ماورا ہو کر بنی نوع انسان کی خدمت کرے۔اس وقت انسانی خدمت کی کئی مذہبی و لامذہبی روایات رُو بعمل ہیں۔ان میں اسلام ایک ایسی فکری و عملی روایت کا حامل ہے جس میں انسانی خدمت کو انسانیت کی بنیاد پر استوار کرنے کی مضبوط بنیادیں موجود ہیں۔

## خدمتِ انسانیت میں غیر جانبداری کا اسلامی تصور

اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو یکساں صلاحیتوں اور اوصاف سے نہیں نوازا بلکہ اُن کے درمیان فرق و تفاوت رکھا ہے تاکہ وہ باہم ایک دوسرے سے وابستہ و پیوست ہو کر اپنی اشترک و منفرد ضروریات پوری کریں۔ربِ کائنات اس بات کو پسند کرتا ہے کہ معاشرے کے ضرورت منداور مستحق افراد کی مدد وہ افراد کریں، جن کو اللہ نے اپنے فضل سے نوازا ہے تاکہ انسانوں کے درمیان باہمی الفت و محبت کے رشتے بھی استوار ہوں اور دینے والوں کو اللہ کی رضا اور گناہوں کی بخشش بھی حاصل ہو۔ سورۃ البقرۃ میں ایمان کے بعد نیکی کا معیار خدمتِ انسانیت کو قرار دیا گیا ہے۔[1]

سورۃ المائدۃ کی آیت ۳۲ میں جہاں ایک فرد کی زندگی کو ہر فرد کی زندگی کے مساوی قرار دیا گیا ہے،[2] اس میں نفس کا لفظ بغیر کسی تحدید یا تخصیص کے استعمال کیا گیا ہے جو غیر وابستگی و غیر جانبداری کا درس دیتے ہوئے واضح کرتا ہے کہ یہ حکم کسی خاص قوم یا اپنے ملک کے شہری یا کسی خاص رنگ و نسل، وطن اور مذہب کے آدمی کے تحفظِ جان کے بارے میں بیان نہیں کیا گیا بلکہ یہ حکم تمام انسانوں کے بارے میں ہے۔اس حکم میں ہر انسانی جان کو ناحق ہلاک کرنا حرام قرار دیا گیا ہے۔ جو

---

[1] البقرہ:۱۷۷

[2] ''جس نے ایک جان کو کسی جان کے (بدلے کے) بغیر، یا زمین میں فساد کے بغیر قتل کیا تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کیا اور جس نے اسے زندگی بخشی تو گویا اس نے تمام انسانوں کو زندگی بخشی''۔المائدہ: ۳۲

غیر مسلم اہلِ ایمان کے ساتھ عداوت نہیں رکھتا اور ان پر ظلم کرنے والوں میں شامل نہیں ہے اس کے ساتھ اچھے برتاؤ کی تلقین کی گئی ہے اور عام انسانی حقوق اور انسانی خدمات کے معاملے میں مسلمان اور غیر مسلم میں فرق نہ کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

خدمتِ انسانیت، غریب اور مجبور افراد کے لیے کوشش اور انفاق کو اسلام نے مذہب کا باقاعدہ حصہ بنا کر زکوٰۃ کو دین کے بنیادی ستونوں میں شامل کر دیا ہے اور دیگر فرض عبادات مثلاً نماز باجماعت، روزے اور حج کو بھی غم گساری کی تربیت کا ذریعہ بتایا ہے۔ سورہ بقرۃ[۳] میں واضح طور پر یہ حکم دیا گیا ہے کہ ایک انسان کے پاس اگر ضرورت سے زائد سامانِ زندگی موجود ہو اور ایک دوسرا انسان بنیادی ضروریات سے بھی محروم ہو تو اوّل الذکر کو چاہیے کہ اپنے زائد از ضرورت مال میں سے ثانی الذکر کی ضرورت پوری کرے۔ ایسے میں یہ ہدایت تو موجود ہے کہ ہر فرد اپنے قریب ترین افراد کی ضروریات کا لحاظ رکھے تاہم ایسا نہیں ہے کہ مذہب، رنگ و نسل کی تفریق انسانی خدمت میں آڑے آ جائے۔ اس سے بڑھ کر اللہ نے ایسے افراد کی بالخصوص تحسین فرمائی ہے جو خود ضرورت مند ہوتے ہوئے دیگر حاجت مندوں کی ضروریات پوری کرتے ہیں۔ لہٰذا انصارِ مدینہ کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ[۴] گویا اسلام ایک ایسی شخصیت تعمیر کرتا ہے جس کے لیے انسانی ہمدردی اور عملی خدمت سے ہی عبادات اور ریاضت مکمل ہو گی۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ وَ يَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ[۵]

---

[۳] ''اور لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں، تو فرما دیجیے جو ضرورت سے زائد ہو''۔ البقرۃ: ۲۱۹

[۴] ''اور وہ اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں۔'' الحشر: ۹

[۵] الماعون: ۴-۷

پس بربادی ہے ان نمازیوں کے لیے جو اپنی نمازوں سے غافل ہیں، جو کہ دکھلاوا کرتے ہیں اور روزمرہ استعمال کی چیزوں سے منع کرتے ہیں۔

یہ آیت تمام انسانوں کے ضمیر کو بالعموم اور مسلمانوں کے ضمیر کو بالخصوص جھنجھوڑ رہی ہے کہ اگر معاشرے کے افراد غربت کی چکی میں پس رہے ہوں اور ضروریات کی فراہمی کو ترس رہے ہوں تو ضرورت سے زیادہ وسائل گھر میں سنبھال کر رکھنے والا چاہے نمازوں میں مصروف ہو اور اپنے گھر میں موجود اشیائے صرف مانگنے پر بھی کسی کو دینے کے لیے تیار نہ ہو تو یہ طرزِ عمل پسندیدہ نہیں۔

قرآن کریم نے غیر جانبدارانہ خدمتِ انسانیت کو ایمان والوں کی صفت قرار دیا ہے۔ اسی لیے مسکین، یتیم، اور قیدی کو بغیر کسی دنیاوی غرض کے کھانا کھلانے کا حکم دیا[6] جو استعارہ ہے ہر ضرورت مند کی بنیادی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے دوڑ دھوپ کرنے کا۔ اسی طرح سورہ بنی اسرائیل میں ارشاد ہے کہ

وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ [7]
رشتے دار کو اس کا حق دو اور مسکین اور مسافر کو بھی۔

ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالی نے انسان کی ضرورت اور حاجت کو اپنی ضرورت اور حاجت قرار دیا ہے اور بیمار کی عیادت کرنے، بھوکے کو کھانا کھلانے اور پیاسے کو پانی پلانے پر اپنی خوشنودی کا وعدہ کیا ہے۔[8] یہی وجہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے خدمتِ انسانیت کے لیے سنہری اصول متعین فرما کر انسانی وقار کو ہمیشہ کے لیے امر کر دیا۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: تم میں سے

---

[6] الدھر: ۸-۹

[7] بنی اسرائیل: ۲۶

[8] مسلم بن حجاج القشیری، صحیح مسلم، کِتَاب الْبِرِّ وَالصِّلَةِ وَالْآدَاب، باب فَضْلِ عِيَادَةِ الْمَرِيضِ، حدیث نمبر: ۲۵۶۹

بہتر انسان وہ ہے جو لوگوں کو نفع دے۔[9]

اس حدیث کے مصداق اصل میں وہی لوگ ہیں جو انسانوں کی خیر خواہی اور نفع مندی کا باعث بنتے ہیں۔ان کے دل خدمتِ انسانیت کی جذبے سے سرشار ہوتے ہیں۔ دورِ حاضر میں بہت سے ادارے رفاہِ عامہ کے منصوبوں اور بے آسرا انسانوں کی خدمت کے لیے سرگرمِ عمل دکھائی دیتے ہیں۔ آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ جو کوئی اپنے بھائی کا نفع کر سکتا ہو تو اسے چاہیے کہ وہ ضرور ایسا کرے۔[10] اللہ کے رسول ﷺ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے کہ انسان ہر اس شخص کی مدد کا مکلف ہے جس کی مدد کی اس میں طاقت ہے۔

مندرجہ بالا آیات واحادیث خدمتِ انسانیت کے غیر جانبدارانہ تصور پر دلالت کرتی ہیں۔ ان سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام نے کس قدر وسعتِ نظری سے خدمتِ انسانیت کی تلقین کی ہے اور اس کو کسی خاص طبقے یا کسی مذہب و جماعت کے ساتھ منسلک نہیں کیا بلکہ ان تمام تر حدود و قیود سے بالاتر ہو کر انسانیت کی خدمت کا درس دیا ہے۔ مزید برآں، خدمتِ انسانیت کے غیر جانبدارانہ رویے کو پروان چڑھانے کے لیے رسول اللہ ﷺ کے ارشادات انسانوں کی کامل راہنمائی کرتے ہیں۔

## عصرِ حاضر میں انسانی خدمات

مواصلات اور ذرائع نقل و حمل کی ترقی کی بدولت خدمتِ انسانیت کا دائرہ کار محدود نہیں رہا بلکہ اب یہ پوری دنیا پر محیط ہے۔ ماضی میں خدمتِ انسانیت کے ضمن میں چندہ وغیرہ جمع کرنے کے لیے علاقائی یا ملکی سطح پر اقدامات کیے جاتے تھے۔ محلہ، قصبہ یا شہر کے دردِ انسانیت رکھنے والے حضرات مل جل کر لاچار طبقات کی امداد کرتے تھے۔ جب زکوٰۃ اور چندہ وغیرہ سے مقامی ضروریات پوری

---

[9] علاؤالدین، علی المتقی، بن حسام، کنز العمال، دار احیاء التراث العربی، ۱۹۹۸ء، ج۸، ص ۲۰۱

[10] صحیح مسلم، کِتَاب السَّلَامِ، باب اسْتِحْبَابِ الرُّقْيَةِ مِنَ الْعَيْنِ وَالنَّمْلَةِ وَالْحُمَةِ وَالنَّظْرَةِ، حدیث نمبر: ۲۱۹۹

ہو جاتی تھیں تو مرکز کی طرف سے ہدایت کے مطابق دیگر علاقوں میں امدادی سرگرمیاں کی جاتیں۔ مگر آج کل امدادی ادارے زیادہ جدید اور منظم ہوگئے ہیں جن میں غیر سرکاری تنظیموں کی ایک وسیع تعداد نمایاں ہے جو ہنگامی حالات میں سرگرمِ عمل رہتی ہے۔

انسانیت کی فلاح و بہتری کے لیے سرگرم تنظیمیں خواہ اسلامی ہوں یا سیکولر، اپنے مقاصدِ عمل اور بنیادوں کے لحاظ سے متنوع ہونے کے باوجود، نفع و خیر خواہی، محبت اور ہمدردی کے جذبات کے تحت کام کرتی ہیں۔ افراد کے دکھ درد میں کام آنا، بھوکوں کو کھانا کھلانا، پیاسوں کو پانی پلانا، مصیبت زدہ کی مدد کرنا، لباس کے محتاج کو کپڑا مہیا کرنا، بے گھر کو چھت مہیا کرنا، بیمار کی عیادت کرنا، علاج کے لیے وسائل کی فراہمی، بے روزگاروں کو روزگار مہیا کرنا، جاہل و ناخواندہ کو علم و حکمت سے آراستہ کرنے کے لیے اور مظلوم کو ظلم سے بچانے کے لیے تدابیر کرنا خدمتِ انسانیت کے اہم اقدامات ہیں، جو کہ کسی بھی فلاحی تنظیم کے اہم مقاصد میں شامل ہوتے ہیں۔

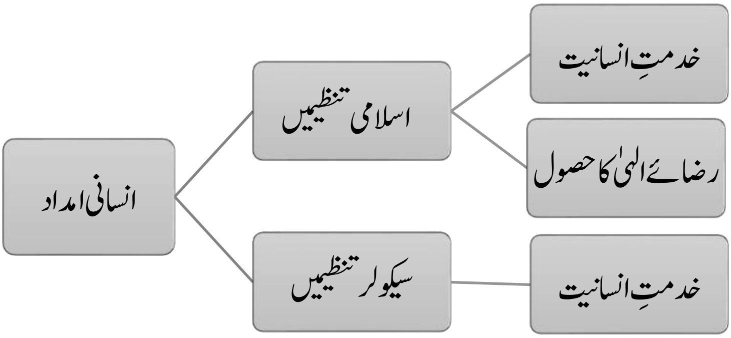


اسلامی اور سیکولر تنظیمیں انسانی امداد کے مشترکہ مقصد کے تحت کام کرتی ہیں، لیکن انسانی خدمت کا اسلامی تصور دنیاوی مقاصد کے ساتھ ساتھ دینی مقاصد بھی لیے ہوئے ہے۔ شریعت کی رُو سے خدمتِ انسانیت کا مقصد رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ اس تصوّر کے تحت انسانی خدمت چند رضاکاروں کی ذمہ داری نہیں رہ جاتی، بلکہ ہر مسلمان کا لازمی وظیفہ قرار پاتا ہے اور پورا معاشرہ باہم غمگسار بن جاتا ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ ہر ایک کی خواہش اور کوشش ہوتی ہے کہ دیگر افراد کی

معاونت اور امداد میں سبقت کرے اور دوسروں سے بڑھ کر ایسا کردار ادا کرے جس کا مقصد رب کی رضا کے حصول کے علاوہ کچھ بھی نہ ہو۔

## خدمتِ انسانیت کے اسلامی مظاہر

اسلام خدمتِ انسانیت کی صرف ترغیب ہی نہیں دیتا بلکہ یہ اپنے عقائد و عبادات کے ڈھانچے میں بھی انسانی امداد کے مختلف ذرائع و مظاہر سموئے ہوئے ہے۔ انسانی خدمت کے کچھ اسلامی ذرائع و مظاہر درج ذیل ہیں:

### ا) زکوٰۃ

زکوٰۃ خدمتِ انسانیت کا منفرد ماڈل ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ قومی زندگی میں کشادگی، وسعت اور رواداری پیدا ہو اور دولت گردش میں آئے تاکہ گداگری، مفلسی اور مفلوک الحالی کا قلع قمع کیا جا سکے۔ اس اصول کو رسول اکرم ﷺ نے یوں بیان فرمایا:

تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ وَتُرَدُّ فِي فُقَرَائِهِمْ [11]

زکوٰۃ ان کے مال داروں سے لی جائے گی اور انہی کے فقراء میں لوٹائی جائے گی۔

### ب) صدقات

زکوٰۃ کی فرضیت کے علاوہ مسلمانوں کو یہ تحریک دلائی گئی کہ فقراء، مساکین، بیوگان، یتامیٰ، اہل حاجت، قیدی اور معاشرے کے نچلے طبقات کی بلا امتیاز خدمت کی جائے اور ان کی کفالت میں اپنا حصہ ڈالا جائے۔ اسلام کے خدمتِ انسانیت کے اس تصور کے عملی مظاہر دنیا بھر میں صدقات و خیرات کی گراں قدر نشانیوں مثلاً ہسپتال، تعلیمی ادارے، مسافر خانے، سڑکیں، کنویں اور دیگر رفاہی اداروں کی شکل میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ مسلمان رفاہِ عامہ کے کام کرنے اور غرباء و مساکین کی

[11] محمد بن اسماعیل البخاری، صحیح بخاری، كِتَاب الزَّكَاة، بَابُ أَخْذِ الصَّدَقَةِ مِنَ الأَغْنِيَاءِ وَتُرَدَّ فِي الْفُقَرَاءِ حَيْثُ كَانُوا، حدیث نمبر: ۱۳۹۵

ضروریات کی کفالت اپنا دینی اور مذہبی فریضہ سمجھتے ہیں۔

## ج) صدقہ فطر

رمضان المبارک کے بعد یکم شوال کو عید الفطر منائی جاتی ہے۔ نمازِ عید کی ادائیگی سے قبل صدقہ فطر بھی مسلمانوں پر واجب کیا گیا ہے۔[12] یہ انسانیت کی خدمت و دلجوئی کا ایک بہترین انداز ہے کہ عید کے تہوار پر مسلمان نادار اور بے آسرا افراد کو فراموش نہ کریں بلکہ فطرانہ کے ذریعے ان کی امداد کر کے ان کے لیے مسرت کا باعث بنیں۔

## د) کفارات

کفارہ دراصل کسی گناہ کے ارتکاب یا واجبات کے ترک کی صورت میں شریعت کے مطابق لاگو ہوتا ہے۔ یعنی دینِ اسلام انسانیت کی خدمت کے لیے زکوۃ و صدقات کے ذریعے ترغیب دے رہا ہے تو ترہیب میں سزا کے طور پر ''کفارہ'' کے ذریعے بھی انسانیت کی بھلائی ہی مدِ نظر ہے۔ اسلام نے نہ صرف گناہوں کو مٹانے بلکہ خدمتِ انسانیت اور نادار طبقوں کی کفالت کے لیے کفارہ کا حکم دیا ہے۔ کوئی شخص کسی مجبوری کی بناء پر روزہ نہ رکھ سکے تو وہ مسکینوں کو کھانا کھلا کر کفارہ ادا کر سکتا ہے۔[13] اسی طرح سے ظہار سے رجوع کی صورت میں[14] یا قسم توڑنے کی صورت میں[15] بھی کفارہ ادا کرنا ضروری ہے۔ خطا کی تلافی کے لیے انسانی خدمت کا یہ تصوّر اسلام کا خاصہ ہے۔

## ہ) وقف

وقف کسی چیز کو اپنی ملکیت سے نکال کر خالص اللہ تعالیٰ کی ملک کر دینا ہے، اس طرح کہ اس کا نفع بندگانِ خدا کو ملتا رہے۔ مسلمانوں کی وقف کردہ املاک سے نہ صرف مسلمانوں بلکہ غیر مسلموں

---

[12] ابو داؤد السجستانی، سنن ابی داؤد، کتاب الزکاۃ، باب زَكَاةِ الْفِطْرِ، حدیث نمبر: ۱۶۳۰

[13] البقرہ: ۱۸۴

[14] المجادلہ: ۳-۴

[15] المائدہ: ۹۵

نے بھی نفع حاصل کیا۔ ابتدائے اسلام سے ہی خدمتِ انسانیت کے لیے وقف کرنے کی مثالیں موجود ہیں۔ حضرت عثمانؓ نے مشہور کنواں ''بئرِ رومہ'' کو وقف کیا، جس سے آج بھی مخلوقِ خدا فائدہ اٹھا رہی ہے۔[۱۶] جب سورۃ آل عمران کی یہ آیت نازل ہوئی ''لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون'' (تم نیکی ہر گز نہیں پا سکتے جب تک وہ خرچ نہ کرو جو تم کو زیادہ پسند ہے۔) تو ابو طلحہؓ نے اپنا انتہائی دل پسند باغ اللہ کی راہ میں صدقہ فرما دیا اور کہا کہ مجھے امید ہے کہ میری یہ نیکی آخرت میں میرے لیے ذخیرہ ثابت ہو گی۔[۱۷]

یہ روایت آج بھی مسلم معاشروں میں نمایاں ہے اور اہلِ خیر مسلمان اپنی ملکیت میں سے کچھ حصہ آخرت میں اجر کی نیت سے عام افراد کے لیے وقف کر دیتے ہیں اور بیشتر صورتوں میں ان سے استفادہ کرنے والوں میں بلا تفریقِ مذہب و قوم تمام لوگ شامل ہوتے ہیں۔

پاکستان میں متعدد سرکاری و غیر سرکاری ادارے خدمتِ انسانیت کے لیے سر گرمِ عمل ہیں۔ ذیل میں پاکستان کے ان سرکاری و غیر سرکاری اداروں پر روشنی ڈالے جائے گی جو کہ غیر جانبدارانہ طور پر انسانی امداد کے لیے کوشاں ہیں۔

## پاکستان میں غیر جانبدار خدمتِ انسانیت

پاکستان اسلامی نظریاتی مملکت ہے جس کے قیام کے آغاز سے ہی فلاحی ادارے سر گرمِ عمل رہے ہیں۔ قبل از تقسیمِ ہند قائم کردہ اکثر فلاحی اداروں نے ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد بھی یہ کارِ خیر جاری رکھا۔ مگر نوزائیدہ مملکت کے سماجی و معاشی مسائل کے حل کے لیے یہ ادارے ناکافی تھے۔ چنانچہ حکومت کی جانب سے سماجی خدمات کے ایک مربوط نظام کی بنیاد ڈالنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ ۱۹۵۱ء میں اقوامِ متحدہ کے تعاون سے حکومتِ پاکستان نے سماجی

---

[۱۶] ابو عیسی محمد الترمذی، جامع ترمذی، بَابُ مَنَاقِبُ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ، حدیث نمبر: ۳۷۰۳

[۱۷] صحیح بخاری، کِتَاب الْوَصَایَا، بَابُ مَنْ تَصَدَّقَ إِلَی وَکِیلِهِ ثُمَّ رَدَّ الْوَکِیلُ إِلَیْهِ، حدیث نمبر: ۲۷۵۸

بہبود اور امدادِ باہمی کا مربوط نظام متعارف کروایا۔ ۱۹۵۴ء سے ۱۹۵۸ء تک اس کام کو وزارتِ تعمیرات، محنت اور سماجی بہبود سرانجام دیتی رہی۔ ۱۹۵۸ء میں اس مقصد کے لیے وزارت قائم کی گئی، جس کو وزارت محنت و سماجی بہبود کا نام دیا گیا۔ اگلے سال ۱۹۵۹ء میں وزارتِ صحت، جداگانہ محنت و سماجی بہبود کو یکجا کرتے ہوئے اسے ایک مرکزی سیکرٹری کے تحت کر دیا گیا۔

۱۹۶۱ء میں ایک آرڈیننس کے ذریعے رضاکارانہ سماجی خدمات کے اداروں کے لیے (Voluntary Social Welfare Agencies) کے عنوان سے ایک قانون نافذ کر دیا گیا۔ اس قانون میں سماجی اداروں کی ہیئت ترکیبی، مقاصد، دائرہ کار اور احتساب جیسے امور وضاحت کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ یہی قانون تاحال پاکستان میں نافذ ہے۔ ۱۹۶۲ء میں سماجی بہبود کا محکمہ صوبائی سطح پر بھی قائم کیا گیا چنانچہ صوبوں میں موجودہ انتظامی ڈھانچہ وزیر سماجی بہبود، سیکرٹری (ان کا ماتحت عملہ) نظامت سماجی بہبود اور اس کے ذیلی اداروں پر مشتمل ہے۔[18]

پاکستان میں وفاقی اور صوبائی دونوں سطحوں پر ادارے سرکاری سرپرستی میں بے سہارا طبقات کی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں ہیں۔ ان میں سے کچھ اہم سرکاری رفاہی ادارے درج ذیل ہیں:

### ۱) نیشنل کونسل آف سوشل ویلفیئر
### (National Council of Social Welfare)

وفاقی سطح پر سماجی بہبود کی قومی کونسل (NCSW) وزارتِ انسانی حقوق (Ministry of Human Right) کے تحت کام کر رہی ہے۔ یہ کونسل ۱۹۵۶ء میں رضاکارانہ تنظیموں اور رفاہی اداروں کے فلاحی کاموں کو امداد اور مشاورتی خدمات کے ذریعے قوت بخشنے کے لیے تشکیل دی گئی۔ یہ تنظیم سیمینار، ورکشاپس، کانفرنسوں، سروے اور تحقیق و تالیف کے ذریعے معاشرتی انصاف کے فروغ اور معاشرتی برائیوں کے خاتمے کے لئے بھی کوشاں ہے۔ اس کونسل کے تحت

---

[18] انوار ہاشمی، این جی اوز اہداف، ترجیحات اور مقاصد، فیکٹ پبلیکیشنز لاہور، س ن، ص ۱۱

بزرگ شہری، مخنث، خواتین (بیوہ، مطلقہ، لاوارث)، بچے (یتیم، مسکین، لاوارث)، بے کس مریض، بھکاری، معذور، نشہ کے عادی افراد اور دیگر پسے ہوئے طبقات سمیت ضرورت مند افراد کی معاشرتی بہبود کے لیے کام جاری ہے۔[19] نیشنل کونسل آف سوشل ویلفیئر کی نجی ویب سائٹ پر اس کا یہ مشن مذکور ہے:

*National Council of Social Welfare (NCSW) subscribes to vision of setting up of an egalitarian society free from all sorts of exploitations, based on the principles of equality, tolerance, social justice and the promotion of social / national integration.[20]*

نیشنل کونسل آف سوشل ویلفیئر (این سی ایس ڈبلیو) برابری، رواداری، معاشرتی انصاف اور سماجی / قومی انضمام کے فروغ کے اصولوں پر مبنی ہر طرح کے استحصال سے پاک ایک مساوی معاشرے کے قیام کے مقصد کے لیے کوشاں ہے۔

کونسل کی جانب سے رضاکارانہ خدمت کو فروغ دینے کے لئے ۱۵۰۰ این جی اوز سمیت دیگر سول سوسائٹی تنظیموں کو رجسٹریشن، منصوبوں کی تیاری کے لئے ہدایت نامہ دیا گیا۔ نیز ۵۰۰ سے زائد رضاکار اس کونسل سے رجسٹرڈ ہیں۔

## ۲) محکمہ سماجی بہبود (Social Welfare Department)

سماجی بہبود کا محکمہ صوبائی حکومت کی زیر سرپرستی کام کر رہا ہے۔ جولائی ۱۹۷۰ء میں مغربی پاکستان میں ون یونٹ کے ٹوٹنے کے بعد سندھ، پنجاب، صوبہ سرحد اور بلوچستان کے سابقہ صوبوں کو دوبارہ بنایا گیا۔ اس کے نتیجے میں ویسٹ پاکستان ڈائریکٹوریٹ جنرل آف سوشل ویلفیئر اور ویسٹ پاکستان کونسل آف سوشل ویلفیئر کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ اس طرح ہر صوبے میں ایک

[19] Ministry of Human Rights, Ministry of Human Rights, accessed December 23, 2021, http://www.mohr.gov.pk/Detail/ZmVkOGNiYTgtYjA1Yy00YzU4LTljYjktMWY2YzNhOTRhMjk4.
[20] ibid

نظامت (ڈائریکٹوریٹ) اور ایک کونسل قائم کی گئی تھی۔ دوسرے لفظوں میں، صوبائی حکومتوں نے اپنے اپنے صوبوں میں سماجی بہبود کے پروگراموں کی دیکھ بھال کے لئے اصولی طور پر دو تنظیمیں تشکیل دی ہیں۔ ۱۹۷۹ء میں سوشل ویلفیئر کا ایک الگ شعبہ قائم کیا گیا۔ اس کے بعد ۱۹۹۶ میں، خواتین کی ترقی کا شعبہ اور ۱۹۹۸ میں بیت المال کا شعبہ بھی محکمہ سوشل ویلفیئر کے ساتھ منسلک ہو گیا۔[21]

اب محکمہ سوشل ویلفئیر کے تحت بہت سے شعبہ جات کام کر رہے ہیں جن میں شعبہ فلاح و بہبود، شعبہ ترقی خواتین اور بیت المال اہم ہیں۔

پاکستان میں سرکاری سطح پر یہ ادارے خدمتِ انسانیت کے لیے کوشاں ہیں۔ یہ تمام ادارے حکومت کے تحت ہیں اور بلا امتیازِ رنگ و نسل اور مذہب انسانیت کے مصیبت زدہ طبقات کی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

## پاکستان میں غیر جانبدار امدادِ انسانیت کی غیر سرکاری تنظیمیں

پاکستان میں غیر سرکاری تنظیموں نے ۱۹۴۷ء میں ہی اپنے عمل کا آغاز کیا۔ ان تنظیموں نے لوگوں کی آباد کاری، سماجی فلاح و بہبود اور غریب و متوسط طبقے کی فلاح و بہبود کے لیے شاندار خدمات سرانجام دیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد طویل عرصے تک ایسی تنظیمیں کم تعداد میں رہیں، تاہم ۱۹۸۰ء اور ۹۰ء کی دہائی میں ان میں اضافہ ہوا اور تا حال تیز رفتاری سے اضافہ مشاہدہ میں آرہا ہے۔

پاکستان میں درج ذیل پانچ قوانین کے تحت غیر سرکاری تنظیمیں معرض وجود میں آئیں:
انجمنوں کے اندراج کا قانون مجریہ ۱۸۶۰ء (The Societies Registration Act of 1860)، وقف کا قانون مجریہ ۱۸۸۲ء (The Trust Act of 1882)، معاونتی انجمنوں کا

[21] Ministry of Human Rights, Ministry of Human Rights, accessed December 23, 2021, http://www.mohr.gov.pk/Detail/ZmVkOGNiYTgtYjA1Yy00YzU4LTljYjktMWY2YzNhOTRhMjk4.

قانون مجریہ ۱۹۵۲ء(Cooperative Societies Act of 1952)، رضاکارانہ سماجی خدمت کے اداروں کے اندراج اور نظم کا قانون (The Voluntlry Social Welfare Agencies (Registration and Control) Act)، اور شراکتی اداروں کا آرڈننس مجریہ ۱۹۸۴ء(The Companies Ordinance of 1984)۔

حال ہی میں غیر سرکاری سماجی تنظیموں کی سرگرمیوں کو منضبط کرنے کے لیے متعلقہ قوانین میں ردوبدل کیا گیا ہے انہیں ایک ہی قانون کے تحت لانے کے لیے قانون سازی کی گئی ہے۔ آغاخان فاؤنڈیشن اور سوشل ڈویلپمنٹ سنٹر کے مشترکہ تجزیاتی مطالعے کے مطابق پاکستان میں پنتالیس ہزار غیر منافع بخش تنظیمیں فعال انداز میں کام کر رہی ہیں۔[۲۲] اب پاکستان میں ہزاروں علاقائی، ملکی اور بین الاقوامی غیر سرکاری تنظیمیں موجود ہیں جو معاشرے کے بے آسرا طبقات کے لیے خدمات سرانجام دے رہی ہیں۔

پاکستان میں خدمتِ انسانیت کے لیے سرگرم تنظیموں کے نقطہ ہائے نظر اور مقاصد و میدانِ عمل میں تنوع پایا جاتا ہے۔ ان میں سے کچھ تنظیمیں مذہبی ہیں، کچھ غیر مذہبی اور کچھ کا دائرہ کار محض اپنے علاقہ یا کمیونٹی تک محدود ہے۔ان تنظیموں میں ایدھی فاؤنڈیشن، چھیپا ویلفئیر ایسوسی ایشن، آغا خان فاؤنڈیشن، الخدمت فاؤنڈیشن، انصار برنی ویلفئیر ٹرسٹ، شاہد آفریدی فاؤنڈیشن، منہاج ویلفئیر فاؤنڈیشن اور فوجی فاؤنڈیشن وغیرہ شامل ہیں۔

اپنے دائرہ کار کے اعتبار سے یہ این جی اوز معاشرے کے تمام بے آسرا طبقات کی بہبود کے لیے کوشاں ہیں اور مفادِ عامہ کے کسی بھی مسئلہ پر متحرک ہو جاتی ہیں۔ مگر کچھ این جی اوز ایسی بھی ہیں جو معاشرے کے ایک مخصوص شعبہ یا طبقے کی فلاح و ترقی کے لیے کام کر رہی ہیں۔ان میں عورتوں کے حقوق کے لیے، معذوروں کی فلاح کے لیے، تعلیم و تربیت اور صحت کے لیے اور اسی

---

[۲۲] محمد انور، سماجی تنظیموں کے انتظامی معیارات کی استعداد کاری، سہ ماہی ''اخبار'' اپریل ۲۰۰۵ء، این جی او ریسورس سنٹر، آغاخان فاؤنڈیشن، پاکستان، ص ۱۴

طرح ناگہانی آفات پر مدد دینے کے لیے سرگرم تنظیمیں شامل ہیں۔

## اسلامی اور لادین تنظیموں کے درمیان روابط-اسلامی نقطۂ نظر

اسلام خدا کی سب مخلوق کو خدا کا کنبہ قرار دیتے ہوئے، ان کی خیر خواہی کا حکم دیتا ہے۔ اسلامی برادری کے ساتھ ہی عالمی انسانی برادری کا تصور بھی اسلام کا ہی عطا کردہ ہے۔ عصرِ حاضر میں انسانیت کے مسائل و مشکلات اور مصائب اتنے بڑھ چکے ہیں کہ ان کے لیے وسیع پیمانے پر امدادی سرگرمیاں درکار ہیں۔ اسی تناظر میں اکثر مذہبی اور سیکولر تنظیموں کا تعامل مشاہدہ میں آتا ہے اور یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی تنظیمیں اور مسلمان کس حد تک سیکولر یا غیر مذہبی تنظیموں کے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں قرآن زریں اصول عطا کرتا ہے:

وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰىۖ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ [23]

"اور نیکی اور خدا ترسی کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کرو، گناہ اور سرکشی کے کاموں میں نہ کرو"۔

یعنی کوئی بھی ایسا عمل جو انسانی فلاح و بہبود کے لیے ہو تو اسلام ایسے کاموں میں حصہ لینے کی نہ صرف اجازت دیتا ہے بلکہ حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ خدمتِ انسانیت کے اعلیٰ و ارفع مقصد کے لیے غیر مسلموں یا سیکولر تنظیموں کے ساتھ تعاون بھی ممکن ہے تاکہ وسیع پیمانے پر انسانیت کی خدمت سرانجام دی جا سکے۔ نبی کریم ﷺ نے زیرِ آسمان ہر مخلوق پر رحم کرنے کی تاکید کی۔ حدیث رسول ﷺ ہے:

الرَّاحِمونَ يرحَمُهم الرَّحمنُ، ارحَموا مَن في الأرضِ يرحَمْكم مَن في السَّماءِ [24]

"رحم کرنے والوں پر رحمٰن رحم فرماتا ہے، تم زمین والوں پر رحم کرو، تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا"۔

---

[23] المائدہ: ۲

[24] سنن ابوداؤد، كِتَاب الْأَدَبِ، بَاب فِي الرَّحْمَةِ، حدیث نمبر: ۴۹۴۱

یہ حدیث اس بات کا ثبوت ہے کہ جو شخص بھی ہمدردی و مدد کا محتاج ہو اس کی مدد کی جانی چاہیے، نیز اس معاملے میں انسانوں کو گروہوں اور جماعتوں میں تقسیم کرنا اور کسی کو خدمت کا مستحق نہ سمجھنا اسلام کی ہدایت کے خلاف ہے۔

اس سلسلے میں نبی کریم ﷺ کی سیرت میں روشن مثالیں موجود ہیں کہ آپ ﷺ کی امدادی و فلاحی سرگرمیوں کا دائرہ کار صرف مسلمانوں تک محدود نہ تھا بلکہ آپ ﷺ نے خدمتِ انسانیت کا غیر جانبدارانہ تصور عطا کرتے ہوئے زیرِ آسمان تمام انسانوں پر رحم کیا۔ یہاں تک آپ ﷺ کے جانی دشمنوں پر جب قحط کی صورت میں مصیبت آئی تو آپ ﷺ نے ان کی بھی مدد کی۔[۲۵] اس طرح نبی کریم ﷺ نے خدمت و ہمدردی کی بنیاد پر تعاون و امداد کا واضح تصور اور عملی مثال پیش کی۔

خدمتِ انسانیت (humanitarian aid) آج ایک سائنس بن چکی ہے جس کے لیے پوری دنیا میں لائحہ عمل وضع کیے جا رہے ہیں، قوانین بنائے جا رہے ہیں، نیز کانفرنسز منعقد کروائی جا رہی ہیں۔ عالمی سطح پر یہ موضوع زیرِ بحث ہے کہ کس طرح دکھی انسانیت کی خدمت کی جائے اور انہیں مزید مصائب و مشکلات جیسا کہ جنگ، تنازعات وغیرہ سے بچایا جا سکے۔ اس کے بنیادی اصول عصرِ حاضر میں وضع کیے جا رہے ہیں۔ اسلام نے کسی فرق و امتیاز کے بغیر خدا کی ساری مخلوق کے ساتھ حسنِ سلوک اور خدمت و فلاح کی تعلیم کا جو تصور چودہ سو سال پہلے عطا فرما دیا تھا وہ اس سلسلہ واضح رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

## تجاویز و سفارشات

اس وقت پاکستان میں سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر جو ادارے اور افراد کام کر رہے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کے مقاصد، سرگرمیاں اور کام کا انداز ایک دوسرے کے قریب ہے۔ سرکاری اداروں کو

[۲۵] السرخسی، شمس الآئمۃ محمد بن احمد، شرح کتاب السیر الکبیر، دار الکتب العلمیۃ، ۱۹۹۷، ج ۱، ص ۷۰

ان مختلف اداروں کے درمیان ایسے روابط استوار کرنے میں مدد کرنی چاہیے جس سے نہ صرف ان کی توانائیاں اور وسائل وہاں خرچ ہوں جہاں ان کی زیادہ اور فوری ضرورت ہے، بلکہ خود ان تنظیموں کی استعداد اور وسائل میں بھی اضافہ ہو۔ مختلف تنظیموں کے ارکان مشترکہ مقاصد کے حصول کے لیے تنظیمی صلاحیتوں اور سرگرمیوں کو مستحکم بنا سکتے ہیں۔ باہم رابطہ کے ذریعے معاشرے کے مختلف طبقات کے ساتھ تعلقات اور باہمی تعامل کو بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ کسی عوامی تنظیم کے لیے متعلقہ سرکاری حکام، مخیر حضرات اور دوسری فلاحی تنظیموں کے ساتھ بہتر تعلقات رکھنا نہایت اہم ہے۔

تاہم سرکاری اداروں کے لیے اس امر پر توجہ بھی ضروری ہے کہ انسانی امداد کے نام پر بعض تنظیمیں سیاسی وذاتی مقاصد کے لیے کام نہ کر رہی ہوں یا مذہبی وسیاسی انتشار پھیلا رہی ہوں۔

بین الاقوامی طور پر مسلم اقوام خدمتِ انسانیت کے لیے ایک پلیٹ فارم بنا کر لوگوں کی فلاح وبہبود کے لیے اہم کردار ادا کر سکتی ہیں، جس سے نہ صرف مسلمانوں کی نمائندگی ہو سکے گی بلکہ اسلام کے غیر رواداری ہونے کے غلط تاثر کی بھی اصلاح ہو گی۔ اس پلیٹ فارم کے ذریعے دنیا بھر میں دیگر تنظیموں کے ساتھ رابطہ کر کے خدمتِ انسانیت کے عالمی اسلامی تصور اور عمل کو فروغ دیا جاسکتا ہے۔

خدمتِ انسانیت کے لیے سرگرم تنظیموں اور ان سے وابستہ افراد کی استعداد کاری (capacity building) کی بے حد ضرورت ہے، تاکہ نہ صرف وہ انسانی خدمت کی اصل روح سے آشنا ہوں بلکہ وہ جدید ترین وسائل اور عالمی رجحانات سے آگاہی کی بنیاد پر اپنے مقاصد کے لیے زیادہ بار آور کوشش کر سکیں۔

استعداد کاری میں اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ انسانیت کی خدمت غیر جانبداری سے محض محبت و ہمدردی کے جذبہ کے تحت کی جائے۔ یہ ہمدردی صرف اپنے ہم مذاہب سے نہ ہو بلکہ پوری انسانیت سے ہو۔

اسلام کا سبق یہ ہے کہ بے لوث اور پر خلوص خدمت ایسی اخلاقی خوبیاں ہیں جو بعض تنظیموں سے وابستہ افراد تک محدود نہیں ہو سکتیں۔ ان کا معاشرے میں عام کرنا ضروری ہے۔ اس حوالے سے ذرائع ابلاغ اور خصوصی کاوشوں کے علاوہ تعلیمی نصاب کو اس انداز میں تیار کرنا اور اس کے مطابق قوم کی تربیت ضروری ہے کہ انسان دوستی، رحم، باہم تعاون اور ایثار جیسی خوبیاں نمو پائیں اور جسمانی و ذہنی صلاحیتوں اور مالی وسائل کو انسانی خدمت کے لیے استعمال کیا جا سکے۔ نصاب کے ذریعے نوجوانوں میں مساوات و انصاف، خدمتِ انسانیت اور رواداری جیسی صفات کو پروان چڑھایا جا سکتا ہے تاکہ ان کی ہمدردی صرف اپنے ہم مذہبوں کے لیے ہی نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لیے ہو۔

# سمندری حدود و علاقہ جات میں انسانی خدمات

## پاکستانی اور بین الاقوامی تناظر میں

ڈاکٹر ملیحہ زیبا خان*

انسان اور سمندر کا رشتہ قدیم، گہرا اور انوکھا ہے۔ سمندر انسان کی ناقابل تردید ضرورت بن چکے ہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ انسانی معاشرت کی تشکیل اور ارتقا میں سمندر ایک بنیادی اکائی رہا ہے تو غلط نہ ہوگا۔ انجان علاقوں کے سفر سے لے کر آج کے زمانے کے عالمی بہاؤ(global flow) تک سبھی عوامل کا تعلق سمندر سے کسی نہ کسی طور رہا ہے۔ ارتقا کے اس سفر میں مسائل اور خطرات کا سامنے آنا بھی ایک قدرتی امر ہے جس کے لیے وقت کے ساتھ ساتھ ان مسائل کی نوعیت اور وجوہات پر تحقیق اور ان کا حل نکالنے کی خاطر ادارہ سازی اور قانون سازی کی جاتی رہی ہے۔ یہ عالمی بہاؤ نہ صرف معیشت، تجارت، کاروبار، زرِ مبادلہ، خوراک و غذائیت، ثقافت، زبان دانی، مواصلات، توانائی، تحقیق، علم، معلومات، نظریات، عقائد، مذاہب، بین الاقوامی و بین العلاقائی تعلقات جیسے مثبت عوامل پر مشتمل ہوتے ہیں بلکہ بین العلاقائی منظم جرائم، اشیاء، ہتھیاروں اور انسانوں کی غیر قانونی نقل و حمل، وبائی امراض کا پھیلاؤ وغیرہ بھی اسی عالمی بہاؤ کا مرہونِ منت ہے۔ اس تمام عالمی بہاؤ کے پھیلاؤ کی ایک اہم ترین وجہ ٹیکنالوجی میں جدت، مواصلات بشمول انٹرنیٹ اور سیٹلائیٹ سگنلز کا رہنمائی نظام، اور بڑے اور جدید بحری جہاز خصوصاً مال بردار جہاز (container ships) کا استعمال ہے۔

---

* اسسٹنٹ پروفیسر، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

ماضی کے مقابلے میں بیسویں صدی میں ایک مسلسل عملِ تحقیق و ترویج کے ذریعے اقوامِ متحدہ اور دیگر متعلقہ اداروں کے تحت مختلف کانفرنسوں اور کنونشنوں کے ذریعے سمندر سے متعلق قوانین کو مروجہ صورت دی گئی جس میں بحری قانون سے متعلق اقوامِ متحدہ کا معاہدہ (United Nations Convention on the Law of the Sea-UNCLOS) ایک واضح مقام رکھتا ہے۔ یہ قوانین (UNCLOS) ساحلی ریاستوں کے لیے سمندری حدود اور ان کے علاقہ جات متعین کرتے ہیں اور حقوق و فرائض کی واضح تشریح تمام ریاستوں کی رہنمائی کرتی ہے۔ اسی ضمن میں دوسرا جنیوا کنونشن ۱۹۴۹ سمندر میں جنگ اور حادثات کی صورت میں انسانی خدمات کے رہنما اصول وضع کرتا ہے۔ ان اصولوں میں غیر جانبداری کے اصول کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

امن کے دنوں میں سمندر میں محفوظ و مامون جہاز رانی اور دوسری معاشی سرگرمیوں کا تسلسل ریاستی اداروں کی سب سے اہم ذمہ داری سمجھی جاتی ہے۔ اس مقصد کے لیے بحری قزاقی، انسانوں، ہتھیاروں اور دیگر اشیاء کی غیر قانونی نقل و حرکت جیسے دیگر جرائم کی روک تھام ایسے امور ہیں جن کی انجام دہی میں سب سے نمایاں کردار قانون کا نفاذ کرنے والے ادارے ادا کرتے ہیں؛ مگر ایسے میں بھی اس امر کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ انسانی جان کا نقصان نہ ہو۔

پاکستان کے بحری علاقہ جات کی حد اگرچہ ۳۵۰ ناٹیکل میل ہے لیکن ۸۴۰ ناٹیکل میل تک کی سمندری حدود و علاقہ جات میں انسانیت کی بنیاد پر کی جانے والی تلاش اور بچاؤ پر مبنی کارروائیوں کی ذمہ داری بھی متعلقہ پاکستانی ادارے سرانجام دیتے ہیں۔ موجودہ ریاستی اور بین الاقوامی قوانین کے مطابق یہ اہم کردار پاکستان میری ٹائم سیکیورٹی ایجنسی (PMSA) ادا کرتی ہے۔

زیرِ نظر تحقیق کے ذریعے سمندر میں مختلف نوعیت کے انسانی مسائل، ان سے پیدا ہونے والی متنوع صورتِ حال اور ان سے نمٹنے کے لیے موجود قواعد و انتظام کا جائزہ لے کر یہ جاننے کی کوشش کی گئی ہے کہ سمندر میں انسانی خدمات کی فراہمی میں غیر جانبداری کے اصول کو کس قدر مدِ نظر رکھا جا رہا ہے۔ تحقیق کے مرکب طریقہ کار کے ذریعے کیفیتی اور شماریاتی مواد کا تجزیہ کر کے

یہ جاننے کی کوشش کی جائے گی کہ سمندر کو محفوظ و مامون بنانے اور وہاں درپیش خطرات و مسائل سے نمٹنے کے لیے پاکستان میری ٹائم سیکیورٹی ایجنسی کا کردار انسانی خدمت کے بین الاقوامی اصولوں سے کس قدر ہم آہنگ ہے۔

ان تمام پہلوؤں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے زیرِ نگاہ مقالے کے لئے جو بنیادی دلیل مرتب کی گئی ہے وہ درج ذیل ہے: اگرچہ سمندر انسانی حیات اور اس سے منسلک معاملات کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے مگر اس حقیقت سے مفر نہیں کہ سمندر میں ممکنہ واقعات و حوادث کی سنگینی کے پیشِ نظر انسانی جان کی حفاظت (human security) قطع نظر قومیت، رنگ و نسل، پیشہ یا نوعیتِ قانون شکنی، ایک اہم ترین ذمہ داری ہے جو نہ صرف بذریعہ حقِ انسانیت بلکہ ریاستی و بین الاقوامی قوانین کے ذریعے بھی ریاستی و غیر ریاستی اداروں اور دوسرے انسانوں پر عائد ہوتی ہے اور اس سلسلے میں ریاستی ادارے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں بہت سا مواد دستیاب ہے اور مختلف ممالک اپنے اپنے زاویہ نظر کے مطابق انسانی جان کی حفاظت کے موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں۔ زیادہ تر مضامین و مقالہ جات مغرب کے ترقی یافتہ ممالک کے نقطۂ نظر کی عکاسی کرتے ہیں۔ بحر ہند کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو انڈیا یا پھر افریقہ کی ساحلی ریاستوں کے متعلق علمی یا پیشہ ورانہ مواد میسر ہے۔ اسی خلا کو بھرنے کے لئے اس مقالے کا مرکزی خیال پاکستان کی سمندری حدود اور علاقہ جات میں کی جانے والی انسانی خدمات کے علمی اور تحقیقی بنیادوں پر لیے جانے والے جائزے پر مشتمل ہے۔

انسانی حقوق کی پاسداری سمندر کے روایتی قانون میں اسی طرح مقدّم ہے جیسا کہ یہ کسی بھی دوسرے دائرۂ عمل میں ہے۔ مثلاً زندگی کا حق ایک ایسا حق ہے جو ہمیشہ سے، ہر مقام پر، اور ہر مذہب و نظریہ میں اہم ہے۔ بہت سے حقوق زندگی کے اسی بنیادی حق کی بنیاد پر تشکیل پاتے ہیں۔ کھلے سمندر میں یا ساحلی ریاست کے زیرِ انتظام علاقائی سمندر میں مصیبت یا خطرے میں مبتلا افراد یا جہازوں کی مدد کرنا ایک ایسا انسانی اصول ہے جو ہمیشہ سے مسلّم رہا ہے۔ سمندر میں مصیبت زدہ افراد

کی مدد کرنا اسلامی قانون کے مطابق ایک اخلاقی فرض اور مذہبی فریضہ سمجھا جاتا ہے۔ اسلامی قانون کے مطابق مسلمانوں کے لیے مصیبت زدہ افراد کو مدد فراہم کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے الّا یہ کہ ایسا کرنے سے خود ان کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو جائے۔ انفرادی حقوق مسلم ممالک کے زیرِ انتظام سمندر میں اور ان کی حدود سے باہر اسی طرح لاگو ہیں جیسے ان کا اطلاق بر سرِ زمین ہوتا ہے۔ ہر شخص کو اس کی جان اور اس کی املاک کے تحفظ کی ضمانت دی گئی ہے، خواہ سمندر میں ہو یا خشکی پر۔ جبکہ ان حقوق کی خلاف ورزی ہر صورت میں قابلِ سزا ہے۔ مثال کے طور پر ڈکیتی اور بحری قزاقی کو یکساں طور پر دیکھا جاتا ہے اور متاثرہ فرد کے نقصان کا ممکن حد تک ازالہ لازم ہے۔ ایسی کسی بھی صورت میں ریاست مجرم کے مذہب یا قومیت سے قطع نظر سزا دینے کی پابند ہے۔ قرآن میں انصاف کے معیارات نسلی، مذہبی، سماجی اور معاشی تفریقوں سے بالاتر ہیں، اس لیے مسلمانوں کو ہر سطح پر انصاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ایک ایسا فرد جس سے بظاہر کسی بھلائی کی امید یا طلب نہ ہو، اس کے ساتھ بھلائی زیادہ اجر کا باعث ہوتی ہے سورۃ الممتحنہ کی آیت ۸ میں مسلمانوں کو کافروں کے ساتھ حسنِ سلوک اور انصاف سے پیش آنے کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ یہ خدا کے قانون کے تحت تمام انسانوں کا فطری حق ہے۔[1]

پاکستان کی سمندری حدود و علاقہ جات میں انسانی خدمات فراہم کرنے کا فریضہ عملی طور پر پاکستان میری ٹائم سیکیورٹی ایجنسی کے سپرد ہے جو اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کے ساتھ متعلقہ علاقے میں مشکل میں مبتلا افراد اور کشتیوں کی تلاش اور مدد کی اضافی ذمہ داری بھی نبھاتا ہے۔ اس مقالے میں شماریاتی یعنی quantitative اور کیفیتی یعنی qualitative مواد کا استعمال کیا گیا ہے اور ایک کیس اسٹڈی کے طور پر پاکستان کے زیرِ انتظام سمندری علاقوں میں پیش آنے والے حادثات کی نوعیت اور اس حوالے سے کی جانے والی سرگرمیوں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس حوالے

---

[1] Khalilieh, Hassan S., *Islamic Law of the Sea: Freedom of Navigation and Passage Rights in Islamic Thought*, Cambridge University Press, (2019), 29-30 http://ijtihadnet.com/wp-content/uploads/Hassan-S.-Khalilieh-Islamic-Law-of-the-Sea_-Freez-lib.org_.pdf

سے قومی اور بین الاقوامی قانون کی متعلقہ شقوں کی بنیاد پر بحث کی گئی ہے جو اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ سمندر میں انسانی خدمت کے اصول اسلام کے عطا کردہ اصولوں سے متصادم نہیں ہیں۔ شماریاتی مواد اس تحقیق کو بنیاد فراہم کرتا ہے تاکہ متعلقہ ادارے کی کارکردگی کی جانچ کی جا سکے اور اس کے لئے دو پیمانے استعمال کیے گئے ہیں:

۱۔ فرائض کی ادائیگی اور خصوصاً بچاؤ کی سرگرمیوں کی نوعیت؛

۲۔ غیر جانبداری کا اصول

کیفیتی مواد کا تجزیہ اس مقصد سے کیا گیا ہے تاکہ جانچا جا سکے کہ ادارہ سمندر کو جہاز رانی اور دیگر معاشی سرگرمیوں کے لئے محفوظ بنانے کے ساتھ سمندروں میں مصروفِ عمل انسانوں کی حفاظت اور مجموعی طور پر حادثات کی صورت میں انسانی خدمات کے لئے موجود ریاستی اور بین الاقوامی قوانین کی روشنی میں کس طرح ایک مؤثر کردار ادا کرتا ہے۔

مقالے کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے پہلے حصے میں سمندر، اس سے متعلق قوانین اور انسانی سرگرمیوں کو بیان کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں سمندروں میں غیر روایتی خطرات کا مختصر تجزیہ ہے۔ تیسرا حصہ پاکستان کی سمندری حدود و علاقہ جات سے متعلق ہے۔ چوتھے حصے میں پاکستان میری ٹائم سیکیورٹی ایجنسی کے کردار، ذمہ داریوں اور انسانی خدمات کو پیش کیا گیا ہے۔ پانچواں اور حتمی حصہ خلاصۂ بحث بیان کرتا ہے۔

## ۱۔ سمندر، قوانین اور انسانی سرگرمیاں

ہزاروں سال پر مبنی تاریخ گواہ ہے کہ سمندر ہمیشہ سے انسان کی حسِ تجسس کو نہ صرف مہمیز کرتے رہے ہیں بلکہ اس تجسس کی تسکین کا سامان بھی سمندروں کے ذریعے ہی ممکن ہوتا رہا ہے۔ انجان علاقوں کی کھوج، بڑھتی ہوئی غذائی ضروریات، نئے لوگوں اور نئی تہذیبوں کو جاننے کا شوق، نئی زمینوں اور ان کے وسائل تک رسائی اور قبضے کی خواہش، معاشی و تجارتی معاملات، اور نئے علوم

اور جاننے کی لگن سمندروں کے سفر کے ذریعے ہی پوری ہوتی رہی ہے۔ جیسے جیسے سمندروں کا استعمال بڑھتا گیا، ویسے ویسے مسائل اور خطرات بھی بڑھتے گئے اور ان کے حل کے لئے قانون و قواعد سازی کا عمل شروع ہوا۔ سمندروں سے متعلقہ معاملات، استعمالات اور قوانین سازی ایک مسلسل ارتقائی عمل سے گزرتے رہے ہیں جو تاحال جاری ہے۔ ہیوگو گروشیئس ( Hugo Grotius) سے شروع ہونے والا بین الاقوامی قوانین سازی کا عمل آج بھی مؤثر اور متحرک ہے کیونکہ گروشیئس کے دیئے گئے اصول(*mare liberum*)یعنی ''آزاد سمندر'' (free sea) نے سمندری قوانین کو وہ بنیاد دی جس پر سمندر سے متعلق قوانین و قواعد استوار ہوئے۔ بنیادی طور پر یہ اصول اسپینی تاجروں اور پرتگالیوں کی سمندری راستوں پر گرفت اور اثر ورسوخ ختم کرنے کی خاطر مرتب کیا گیا تھا مگر آنے والے وقت میں یہ سمندری قوانین کی بنیاد قرار پایا۔[2] سمندروں سے متعلق قوانین سازی ایک مسلسل عمل کے ذریعے موجودہ صورت تک پہنچی ہے اور ابھی بھی یہ ارتقاپذیر ہے۔

سمندر کو بنی نوع انسان کے لئے مشترکہ ورثے کی حیثیت حاصل ہے اور اسی لئے اس کی حفاظت سب کا مشترکہ فریضہ ہے۔ خاص طور پر بلاروک ٹوک عالمی بہاؤ بشمول تجارت اور دوسرے متعلقہ کاروبارِ حیات، ممالک کی مضبوط معیشت اور سماجی بڑھوتری کی ضمانت ہے۔ اس کو یقینی بنانے کے لئے سمندری قوانین محفوظ جہاز رانی کا تصور دیتے ہیں اور سمندری شاہراہوں یعنی sea lines of communication کو ایک مشترکہ ذمہ داری قرار دیا جاتا ہے۔ سمندر میں کسی بھی نوعیت کے خطرے یا مسئلے سے نمٹنے کے لئے بین الاقوامی سمندری قوانین کی رہنمائی میں ریاستیں نہ صرف یہ کہ اپنے قواعد وضوابط اور قوانین مرتب کرتی ہیں بلکہ ان کو لاگو کرنے کے لیے ادارے بھی تشکیل دیئے جاتے ہیں۔ بیسویں صدی عیسوی میں سمندروں سے متعلق قانون سازی

[2] Hugo Grotius, *The Free Sea*, translated by Richard Hakluyt with William Welwod's Critique and Grotius's Reply, edited and with an Introduction by David Armitage (Indianapolis: Liberty Fund, 2004), 3, 10, 13, 15, 17, 20, 38, 39, 49, 51, 52, 53, 54, 57.

کا عمل نہ صرف یہ کہ تیز ہو گیا، بلکہ اس کی اثر پذیری میں بھی خاطر خواہ اضافہ نظر آیا۔ اس سلسلے میں اقوام متحدہ اور دیگر بین الاقوامی اداروں نے مؤثر کردار ادا کیا ہے اور ساحلی ریاستوں کی بحری حدود اور علاقہ جات اور وہاں ریاستوں کے حقوق و فرائض اور معاشی سرگرمیوں سے متعلقہ قوانین، خصوصاً سمندری جہاز رانی کی آزادی کے اصول پر کافی کام کیا جا چکا ہے۔

## بین الاقوامی سمندری قوانین کا ارتقا اور انسانی خدمات

سترھویں صدی میں گروشیئس سے شروع ہونے والا آزاد سمندر کا اصول اسپین اور پرتگال کی سمندروں پر گرفت کو چیلنج کرنے میں تو کامیاب رہا مگر جوں جوں ٹیکنالوجی کی ترقی کا سفر تیز ہوا، سمندروں میں کی جانے والی سرگرمی کو ضوابط و قواعد کے تحت لانے کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ چھوٹی ساحلی ریاستیں خود کو اس بات کا اہل نہیں سمجھتی تھیں کہ وہ بڑی ریاستوں کے مقابلے میں اپنے علاقائی سمندر اور وسائل کو استعمال میں لا سکیں۔

اٹھارویں صدی میں اس سوچ میں اثباتی نظریے (positivist theory) نے ہلچل مچا دی اور ریاستوں کی آزادانہ مرضی کو اوّلیت دی جانی شروع کر دی گئی۔ اس تمام عرصے میں بین الاقوامی قوانین میں رہنما اصول 'رواجی قانون' یعنی customary law ہی رہا اور سمندروں سے متعلق معاملات اور مقدمات ریاست کی admiralty courts ہی حل کرتی تھیں۔[3] مگر وقت کے ساتھ ان قوانین میں موجود کمی و کجی واضح ہونے لگی اور ضرورت محسوس کی جانے لگی کہ نئے سامنے آنے والے مسائل کے ایسے حل سامنے لائے جائیں جن پر ریاستوں کا اجماع ہو سکے۔ اسی طرح دنیا میں جنگوں اور متشدّد تنازعات کے واقعات نے بھی اس سوچ کو شکل دی کہ اگرچہ بین الاقوامی قوانین کو بزور لاگو نہیں کیا جا سکتا، مگر سمندر سے متعلق واضح قوانین کی موجودگی موجودہ اور نئے مسائل کے حل میں کسی حد تک مثبت کردار اور رہنمائی کر سکتی تھی۔ انیسویں صدی میں سمندر

[3] Alexander Pearce Higgins and Constantine John Colombos, *The International law of the sea* (London: Longmans, Green, 1943), 7.

سے متعلق قوانین کو لے کر کچھ اہم پیش رفت ہوئی جب ''پیرس اعلامیہ -۱۸۵۶'' میں بحری جنگوں کے حوالے سے مختلف معاملات سامنے لائے گئے، بالخصوص جنگوں اور تنازعات میں غیر جانبداری کا اصول، تنازعات کو مخصوص و متعلقہ ممالک تک محدود رکھنا، اور بحری راستوں میں رکاوٹوں کے ذریعے تجارت اور دیگر معاشی سرگرمیوں کو محدود کرنا یا روک دینا۔ اسی اعلامیے کو بنیاد بنا کر چند بہت اہم قواعد و ضوابط وضع کیے گئے اور باضابطہ طور پر دونوں Hague Peace Conferences منعقدہ ۱۸۹۹ء اور ۱۹۰۷ء، اور پھر اس کے بعد ۱۹۰۹ء میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی نیول کانفرنس میں ان ضوابط کو بین الاقوامی سمندری قوانین کا حصہ بنا دیا گیا۔[۴]

بیسویں صدی اس حساب سے ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے کہ اس میں بین الاقوامی سمندری قوانین کی واضح ترتیب و تدوین کی گئی اور وہ بنیاد فراہم کر دی گئی کہ جس پر عمل کرتے ہوئے بہت سے مسائل سے نمٹنا نسبتاً آسان ہو گیا۔ دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ قوانین زیادہ تر بحری جنگوں پر مرتکز تھے اور دیگر بحری اقتصادی مسائل کو اکثر نظر انداز ہی کیا جاتا رہا تھا۔ ۱۹۱۳ء میں ادارہ برائے بین الاقوامی قانون (Institute of International Law) کی جانب سے بحری جنگوں سے متعلق ایک خاص مینوئل مرتب کیا گیا۔[۵] ۱۹۲۴ میں لیگ آف نیشنز

---

[4] James Harrison, "Evolution of the law of the sea: developments in law-making in the wake of the 1982 Law of the Sea Convention," Ph. D. dissertation, School of Law, University of Edinburgh, 2007, p. 21, accessed on September 18, 2021, https://era.ed.ac.uk/bitstream/handle/1842/3230/J%20Harrison,%20Evolution%20of%20the%20Law%20of%20the%20Sea,%20PhD%20Thesis,%202008.pdf?sequence=1&isAllowed=y

[۵] اس مینوئل کا نام تھا:

*Oxford Manual on the Laws of Naval War Governing the Relations Between Belligerents.*

نے بین الاقوامی قوانین پر دوبارہ سے کام شروع کیا اور ۱۹۳۰ء میں Hague Codification Conference کا انعقاد کیا گیا جو مجموعی طور پر کسی متفقہ نتیجے پر نہ پہنچ سکنے کی بنا پر ناکام ہو گئی۔[6]

اقوام متحدہ کے وجود میں آنے کے بعد بین الاقوامی قوانین پر پھر سے کام شروع ہوا اور دوسرا جنیوا کنونشن-۱۹۴۹ء ایک جامع دستاویز کے طور پر سامنے آیا جس نے ۱۹۰۷ء کے ہیگ کنونشن میں متفق علیہ بحری جنگ میں اختیار کئے جانے والے اصولوں کو دوسرے جنیوا کنونشن کے اصولوں سے بدل دیا جو بحری جنگ یا مسلح ٹکراؤ کی صورت میں بحری جہاز پر بیماروں اور زخمیوں کی مدد، علاج معالجے اور بچاؤ پر مبنی تھے۔[7] جنیوا کنونشن کے ان اصولوں نے سمندروں میں انسانی خدمات کی ایسی بنیاد ڈالی کہ یہ صرف حالتِ جنگ میں ہی نہیں بلکہ حالتِ امن میں بھی رہنما اصول قرار پائے۔

بین الاقوامی قوانین کا ارتقا اور موجودہ شکل تک کا سفر ایک لمبا مگر فائدہ مند سفر رہا۔ اگرچہ ابھی بھی بہت سے مسائل حل طلب ہیں مگر ان قوانین کی مدد سے بہت سے مسائل حل بھی ہوئے ہیں۔ اس دورانیے میں اقوام متحدہ کے تحت کانفرنس برائے سمندری قوانین کے دوران تشکیل کردہ سمندری قوانین سے متعلق جنیوا کنونشنز-۱۹۵۸ء کی روشنی میں بہت سے متنازعہ معاملات مثلاً علاقائی سمندری حدود، ملحقہ علاقہ، کھلے سمندروں کی حدود کے ساتھ دیگر اہم تکنیکی، سیاسی، معاشی، حیاتیاتی خصوصاً مچھلی پکڑنے کے معاملات کے حل میں ایک پیش رفت ثابت ہوئے۔[8]

---

6 Shabtai Rosenne, ed., *League of Nations Conference for the Codification of International Law (1930),* (New York: Oceana Publications, 1975), xliii-xlvi.b

7 International Committee of the Red Cross (ICRC), "The Geneva Conventions of 1949 and their Additional Protocols," October 10, 2010, Overview, accessed on August 12, 2021, https://www.icrc.org/en/doc/war-and-law/treaties-customary-law/genevaconventions/overview-geneva-conventions.htm

8 United Nations Audiovisual Library of International Law, "1958 Geneva Conventions on the Law of the Sea," accessed on September 02, 2021, https://legal.un.org/avl/pdf/ha/gclos/gclos_ph_e.pdf

اقوام متحدہ نے ان کانفرنسوں کے ذریعے سمندری قوانین کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا اور ۱۹۸۲ میں ان قوانین کو باضابطہ معاہدے کی صورت میں حتمی شکل دے دی گئی۔ باوجود اس کے کہ تمام تر ممالک ان کو مکمل حالت میں نہیں قبول کرتے مگر بہر حال سمندروں میں ممالک کے بیچ معاملات و تنازعات کے حل کے لئے ان قوانین کی کلیدی حیثیت ہے اور کسی بھی لاینحل مسئلے کے لئے یہ رہنما اصولوں کا کام کرتے ہیں۔ قانونی طور پر یہ قوانین جنیوا کنونشنز کا متبادل ہیں۔ عالمی سطح پر یہ قوانین اقوام متحدہ کنونشن برائے سمندری قوانین(UNCLOS) کے نام سے جانے جاتے ہیں اور ان کو بہرِ طور بعد میں کی جانے والی قوانین سازی میں بھی ایک ممتاز حیثیت حاصل ہے۔

سمندر میں سر انجام دی جانے والی انسانی خدمات کے سلسلے میں، خصوصاً بحری جنگوں اور مسلح ٹکراؤ کے دوران جانی و مالی نقصانات سے بچنے کے لئے ایک بڑی پیش رفت ایک دستور العمل یعنی San Remo Manual کی صورت میں ۱۹۸۸ سے ۱۹۹۴ کے دورانیے میں ہوئی جس کے ہر مرحلے کے دوران ریڈ کراس کی بین الاقوامی تنظیم نے شمولیت و رہنمائی کے تقاضے بحسن و خوبی ادا کئے۔[9] اس دستور العمل کی رو سے سمندروں میں جنگوں سے ہونے والے ریاستی، جانی و مالی نقصانات کو کم سے کم کرنے اور متاثرہ انسانوں کی مدد کے قوانین بھی وضع کر دیئے گئے۔

## ۲۔ سمندروں میں غیر روایتی خطرات کے خلاف تحفظ

سمندری قوانین و ضوابط سمندر کی جغرافیائی انفرادیت کے لحاظ سے براعظمی زمین سے مختلف ہوتے ہیں۔ علاقائی سمندر کے بارہ ناٹیکل میل کے علاوہ، تمام تر سمندر کی حیثیت عالمی سمندر کی سی ہے جس میں سے بنا گزند راہداری کا اصول(principle of safe navigation) ہر قسم کے بحری جہاز پر لاگو ہوتا ہے؛ حتیٰ کہ علاقائی سمندر میں سے بھی جہازوں کو گزرگاہ کا حق (right of

[9] International Lawyers and Naval Experts, "San Remo Manual on international Law Applicable on Armed Conflicts at Sea," International Institute of Humanitarian Law, June 1994.

(innocent passage) حاصل ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے جہاز رانی کی صنعت کے ساتھ ساتھ سمندروں سے منسلک مزید بہت سی صنعتوں اور کاروباری ذرائع کو عالمی سطح پر فروغ دیا ہے۔ جہاں ممالک کے لئے اپنی معیشتوں کو پائیدار ترقی کے راستے پر گامزن کرنے کے مواقع ملے ہیں، وہیں سمندروں میں موجود خطرات یا پھر ممکنہ مسائل میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

روایتی طور پر سمندر میں درپیش ایک خطرہ تو بحری جنگوں اور مسلح ٹکراؤ کا رہا ہے مگر جب سے ۱۹۸۲ء کے سمندری قوانین کو صراحت کے ساتھ متعارف کروایا گیا ہے، تب سے ممالک ان پانیوں کو مشترکہ ذمہ داری کے طور پر لیتے ہیں اور اختلافات کو مذاکرات کے ذریعے حل کرنے کا رجحان واضح طور پر بڑھا ہے کیونکہ جنگ کی صورت میں عالمی بہاؤ سب سے زیادہ متاثر ہوگا اور ممالک کی معیشتیں غیر مستحکم ہو جائیں گی۔ آج بھی ملکی سالمیت اور سیاسی خود مختاری کے ساتھ قومی سرحدوں کی حفاظت اور سمندری حدود میں دراندازی ایک بڑا خطرہ ہے مگر ممالک ارادتاً ایسے اقدامات سے اجتناب کرتے ہیں جو علاقائی امن و سلامتی کے لئے خطرہ بن سکتے ہوں۔ خاص طور پر ایسی صورتحال میں جب بہت سے ممالک جدید ترین اسلحے اور یہاں تک کہ ایٹمی صلاحیت کے بھی حامل ہوں، ایسے خطرات مول لینا دنیا کو جنگ کے دہانے پر لا کھڑا کرنے کے مترادف ہوگا۔

آج کے زمانے میں سمندر میں درپیش خطرات کی نوعیت میں واضح تبدیلی دیکھی جا سکتی ہے۔ زیادہ تر خطرات و مسائل غیر روایتی نوعیت کے ہیں جن کا حل روایتی حربی طریقہ نہیں ہے اور نہ ہی روایتی بحری افواج کو ان خطرات سے نمٹنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ غیر روایتی تحفظ کا نظریہ (Theory of non-traditional security) سرد جنگ کے خاتمے کے بعد سامنے آیا جب تحفظ کو محض روایتی حربی ذرائع کے استعمال کے علاوہ بھی سوچا جانے لگا۔ تحفظ کی سوچ کی روایتی محدودیت اور ریاستی کردار سے باہر نکل کر نئے زاویہ نگاہ شامل کئے گئے اور ملکی تحفظ کو غیر روایتی نقطۂ نظر سے بھی دیکھا جانے لگا۔ اگرچہ تحفظ کے روایتی نظریہ اور سوچ کو اس سے پہلے رائٹ (Quincy Wright) نے ۱۹۴۲ میں وسعت دینے کی کوشش کی تھی جب اس نے جنگ کے دیگر پہلوؤں مثلاً تاریخی، سماجی، حیاتیاتی، نفسیاتی اور فلسفیانہ جواز پر سوچ بچار کو بھی قیامِ امن کے

لئے اہمیت کا حامل قرار دیا تھا۔[10] لیکن ریاستی تحفظ میں غیر روایتی سوچ کی شمولیت نے ایک باضابطہ نظریہ کی شکل تب اختیار کی جب بعض دیگر ماہرین نے سلامتی کے روایتی تصور کو کشادہ کرتے ہوئے نئے غیر روایتی نظریے کی بنیاد رکھی[11] اور سیاسی، اقتصادی، حربی، سماجی اور ماحولیاتی پہلوؤں کو ملکی تحفظ و سلامتی کے لئے اہم اور بنیادی اہمیت کا حامل قرار دیا۔[12] بنیادی طور پر تحفظ اور سلامتی کا غیر روایتی نظریہ ریاست کے روایتی تصور اور محدودیت سے اختلاف کرتا ہے اور اس میں انسانی تحفظ کے مختلف پہلو شامل کرتے ہوئے اس کو وسعت دیتا ہے۔ اس سلسلے میں درج بالا پانچ پہلو ایسے ہیں جو انسانوں اور ریاستوں کے لئے خطرات کا ماخذ ہیں اور مزید مسائل کو جنم دیتے ہیں۔

اس نظریے کی روشنی میں سمندروں میں درپیش خطرات اور ممکنہ مسائل کی نوعیت مجموعی طور پر غیر روایتی تحفظ و سلامتی کے زمرے میں آتی ہے۔ان خطرات میں بحری قزاقی، معمول سے ہٹ کر موسمیاتی تغیرات، درجہ حرارت کا بڑھاؤ، سمندری حیات و وسائل کا بے دریغ استحصال، بحری آلودگی، اتھلے پانیوں یا گہرے سمندروں میں غیر قانونی ماہی گیری، سمندری ریت اور بجری کی چوری یا سمگلنگ، ممالک کا ایک دوسرے کی بحری حدود میں ماہی گیری یا وسائل کی چوری، قدرتی آفات مثلاً زلزلے، ساحلی یا زیرِ زمین آتش فشاں یا کیچڑ فشاں کا پھٹنا، جزائر کا ابھرنا یا پھر زیرِ آب چلے جانا، جہازوں یا کشتیوں کے حادثات بشمول تیل یا ضرر رساں مواد کا رساؤ، اشیا یا منشیات کی غیر قانونی نقل و حمل، بحری جرائم پیشہ گروہوں کے سرحد پار تعلقات اور سہولت کاری، وبائی امراض، افراد یا گروہوں کی بے قاعدہ ہجرت یا غیر قانونی نقل و حمل، اور بحری ذرائع مواصلات اور سمندری تجارتی راہداریوں کو دہشت گردی کا نشانہ بنانا شامل ہیں۔ان تمام خطرات و ممکنہ مسائل

---

[10] Karl W. Deutsch, “Quincy Wright’s Contribution to the Study of War: A Preface to the Second Edition,” The Journal of Conflict Resolution 14, no. 4 (Dec. 1970): 474-45.

[11] Barry Buzan, Ole Waever, Jaap de Wilde, *Security: A New Framework for Analysis* (Boulder: Lynne Rienner, 1998), 2.

[12] Barry Buzan, *Peoples, States and Fear: An Agenda for International Security in the Post-Cold War Era,* 2nd ed. (Boulder: Lynne Rienner, 1991).

کی اہمیت کو مد نظر رکھا جائے تو یہ تمام ریاستی و قومی تحفظ و سلامتی سے کسی نہ کسی طرح سے وابستہ ہیں مگر ان کا حل روایتی طریقہ یعنی محض حربی قوت کے استعمال سے ممکن نہیں۔ ان مسائل کا حل بھی غیر روایتی طریقہ کار سے ہی ممکن ہے جس کے لیے بین الاقوامی قوانین رہنما اصولوں کا کام سرانجام دیتے ہیں۔

ان غیر روایتی خطرات و مسائل سے نبرد آزما ہوتے ہوئے ایک اہم اور نظرانداز نہ کیا جا سکنے والا پہلو انسانی جان ہے۔ ہر وہ انسان جو کسی بھی طور سمندروں سے منسلک ہے اور بحری کاروبارِ حیات کا جزو ہے، قطع نظر اس کے کہ اس کے کام کی نوعیت کیا ہے اور آیا یہ کہ وہ کسی قانونی یا غیر قانونی کام میں ملوث ہے یا ریاست کی طرف سے کسی ذمہ داری کی انجام دہی میں مصروف ہے، سمندروں میں اس کی زندگی کی حفاظت اولیت رکھتی ہے۔ اسی طرح حادثات کی صورت میں بلا تخصیص قومیت و پیشہ انسانوں کی مدد کی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ قانون کے نفاذ کے دوران بھی اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ ملزمان کو جانی نقصان پہنچائے بغیر قانون کے تقاضے پورے کیے جائیں۔ اس سلسلے میں بھی بین الاقوامی قوانین اور بین الاقوامی سطح پر دیگر مسلمہ قواعد و ضوابط کی روشنی میں ریاست قوانین و ضوابط مرتب کرتی ہے جو غیر روایتی خطرات و مسائل کے حل سے متعلق ہوں، تاکہ انسانی جان و وسائل کی حفاظت کو یقینی بنایا جا سکے۔

## ۳۔ پاکستان کی سمندری حدود و علاقہ جات

اقوام متحدہ کے سمندری قوانین (UNCLOS) کے تحت ساحلی ریاستوں کے لیے سمندری حدود و علاقہ جات متعین کیے جاتے ہیں۔ اس عمل کے لیے مخصوص قوانین سے مدد اور رہنمائی لی جاتی ہے۔ ان قوانین کے مطابق عمومی اصول یہ ہے کہ بنیاد (baseline) سے بارہ ناٹیکل میل تک ساحلی ریاست کا علاقائی سمندر مانا جاتا ہے جہاں اس ریاست کی اپنی قانونی عملداری ہوتی ہے۔ اس ضمن میں ریاست کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ سمندر کے بیشتر علاقے کی عالمی اثاثہ کی حیثیت کو مد نظر رکھتے ہوئے بین الاقوامی سمندری قوانین کے مطابق باقی کے سمندری علاقہ جات میں

محفوظ جہاز رانی کو ممکن ئے اور ساتھ ہی سمندر میں موجود افراد کی جان کی حفاظت کو بھی یقینی بنایا جائے۔

پاکستان کی سمندری حدود و علاقہ جات کو سمجھنے کے لیے دیا گیا نقشہ بہتر کردار ادا کرتا ہے۔ اس نقشہ میں مخصوص رنگوں کی مدد سے ان علاقہ جات کو سمجھنے میں رہنمائی ملتی ہے۔

تصویر نمبر ا: پاکستان کی سمندری حدود و علاقہ جات

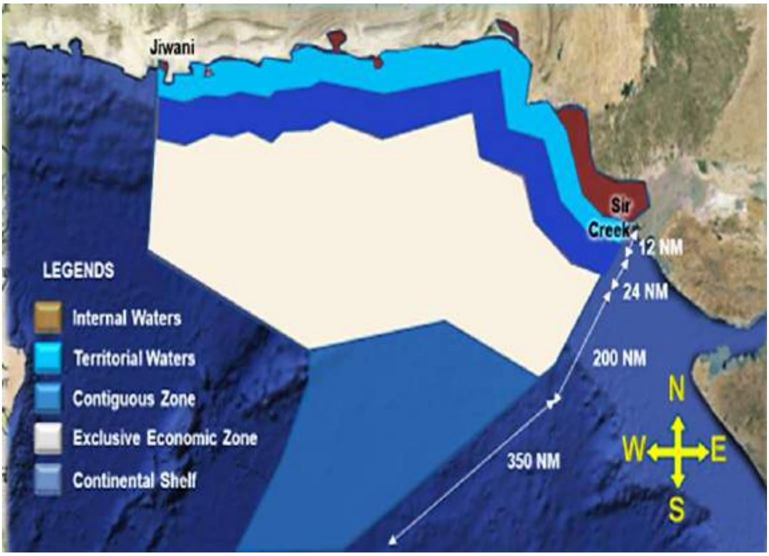


ماخذ: پاکستان میری ٹائم سیکیورٹی ایجنسی

پاکستان بحر ہند میں ایک بڑے علاقے میں بین الاقوامی قوانین کو لاگو کرنے کا پابند ہے۔ یہ علاقہ کل ملا کر تقریباً دو لاکھ نوّے ہزار مربع کلو میٹر بنتا ہے جس میں قانون کے نفاذ اور امن و امان کی ذمہ داری پاکستان پر عائد ہوتی ہے۔ پہلے بارہ ناٹیکل میل پاکستان کا علاقائی سمندر کہلاتا ہے۔ اس کو پہلا بحری علاقہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ اگرچہ ریاست اس علاقے میں مکمل خود مختاری اور ریاستی قانون کی عملداری رکھتی ہے مگر دیگر ریاستوں کے بحری جہاز پاکستان کے علاقائی پانیوں یا سمندر

سے گزرگاہ کا حق رکھتے ہیں۔ گزرگاہ کا یہ حق ہر ملک کو دوسرے ممالک کے علاقائی پانیوں پر حاصل ہوتا ہے مگر وہ ان پانیوں سے دیگر معاشی فوائد حاصل کرنے کے مجاز نہیں ہوتے۔اسی طرح ایسے جنگی جہاز جو ریاستی قوانین کی پاسداری نہ کر رہے ہوں، ان کو علاقائی سمندر سے نکل جانے کا حکم سنایا جاسکتا ہے۔

اگلے بارہ ناٹیکل میل ملحقہ علاقے کی تعریف میں آتے ہیں مگر بین الاقوامی سمندری قانون کے مطابق یہاں سے بین الاقوامی پانیوں کا آغاز ہوتا ہے لہٰذا یہاں سے بین الاقوامی قوانین کا اطلاق شروع ہوتا ہے۔ان پانیوں سے دیگر ممالک کے جہاز راہداری کے حق کے تحت جہاز رانی کر سکتے ہیں مگر ان کو یہاں سے ماہی گیری یا دیگر معاشی سرگرمیوں کی اجازت حاصل نہیں۔ ملحقہ علاقے کے بعد مخصوص معاشی علاقہ (exclusive economic zone) شروع ہوتا ہے جس کی حد ۱۲ ناٹیکل میل کی بنیاد سے دوسو ناٹیکل میل تک ہے۔اس علاقہ میں ریاست کو اختیار ہوتا ہے کہ وہاں ہر طرح کی معاشی سرگرمی کر سکے، یہاں تک کہ مصنوعی جزیرے تک بنائے جاسکتے ہیں۔

سال ۲۰۱۶ تک پاکستان کے پاس دو لاکھ چالیس ہزار مربع کلو میٹر تک کا علاقہ بحری علاقہ جات کے زمرے میں آتا تھا۔اقوام متحدہ کے کمیشن برائے حد بندی براعظمی شیلف (United Nations Commission on Limits of Continental Shelf- CLCS) نے پاکستان کے دعویٰ کی تائید کرتے ہوئے پاکستان کے سمندری علاقے میں براعظمی شیلف (continental shelf) کے ایک سو پچاس ناٹیکل میل کا اضافہ کر دیا جس کے بعد پاکستان کے ماتحت آنے والے سمندری علاقے کی حد دو لاکھ نوّے ہزار ناٹیکل میل ہو گئی۔اس سمندری علاقے میں پاکستان کو خصوصی حقوق حاصل ہیں اور یہ ایک امتیاز ہے جو پاکستان کو حاصل ہے کیونکہ اس علاقے میں بھی ریاست مخصوص معاشی سرگرمیوں کا حق رکھتی ہے۔

## ۴۔ پاکستان میری ٹائم سیکیورٹی ایجنسی: کردار، ذمہ داریاں اور انسانی خدمات

پاکستان کے سمندر میں وسیع علاقہ جات ایک طرف ملک کے لئے ماہی گیری، جہاز رانی، جہاز سازی

اور جہاز توڑنے کی صنعتوں سے متعلق مواقع کے حساب سے فائدہ مند ہیں، تو دوسری جانب ان میں نئی اور جدید صنعت و حرفت کو استعمال میں لاتے ہوئے مزید معاشی سرگرمیوں کے ذریعے ملک کی پائیدار اقتصادی بڑھوتری کو یقینی بنایا جاسکتا ہے۔ ان ممکنہ مواقع کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ریاستی ادارے ایسے انتظامات کرتے ہیں جن کے ذریعے ایسی معاشی سرگرمیوں کو محض ممکن ہی نہ بنایا جائے بلکہ سمندروں کو ان کاموں کے لئے محفوظ و مامون بنایا جائے اور ان سے منسلک افرادی قوت کی حفاظت، اور مشکلات و حادثات کی صورت میں مدد اور رہنمائی میں کوئی فروگذاشت نہ کی جائے۔

تحفظ و سلامتی کے غیر روایتی نظریے سے آشکار ہوتا ہے کہ سمندروں میں درپیش اور ممکنہ خطرات و مسائل میں بیشتر کا تعلق پانچ - سیاسی، اقتصادی، حربی، سماجی اور ماحولیاتی - پہلوؤں سے ہوتا ہے اور ان کا حل بھی غیر روایتی طریقہ کار سے نہ صرف ممکن بلکہ بہتر ہوتا ہے۔ پاکستان کی سمندری حدود و علاقہ جات میں ان خطرات و مسائل سے نبرد آزما ہونے اور اس دوران انسانی جان کا تحفظ یقینی بنانے کی ذمہ داری پاکستان میری ٹائم ایجنسی کے سپرد ہے۔ اس سلسلے میں اس ادارے کی بنیادی ذمہ داریاں ہر پہلو سے قومی سلامتی اور انسانی جان کی حفاظت سے متعلق ہیں۔

نفاذِ قانون ایک ایسا پہلو ہے جو زمین کی نسبت سمندروں میں زیادہ پر خطر اور احتیاط کا متقاضی ہوتا ہے۔ اس پس منظر میں ملکی سمندری حدود سے گزرنے والے جہازوں اور سمندری علاقہ جات سے راہداری کے حق کی حفاظت سے لے کر ماہی گیروں کی حفاظت تک، یہ بندوبست خصوصی طور پر تشکیل دیئے گئے اسی ادارے کی سپردگی میں آتا ہے ادارہ نہ صرف یہ کہ اپنے ذمے ریاست کی جانب سے عائد کردہ ذمہ داری نبھاتا ہے، بلکہ اقوام متحدہ کے تحت ایک وسیع تر علاقے میں مشکل میں مبتلا افراد، کشتیوں یا جہازوں کی تلاش اور بچاؤ کی ذمہ داری بھی اسی کے سپرد ہے جو کہ یہ ادارہ بحسن و خوبی نبھاتا ہے۔

ریاست کا سمندر میں قانون نافذ کرنے والا یہ ادارہ 'پاکستان میری ٹائم سیکیورٹی ایجنسی' یکم جنوری ۱۹۸۷ کو باضابطہ طور پر قائم کیا گیا۔ اس ادارے کے قیام کا ایک بڑا محرک ۱۹۸۲ کا

اقوامِ متحدہ کا سمندری قوانین کا کنونشن (UNCLOS) تھا جس کی رو سے سمندری علاقہ جات کو لے کر بہت سی مبہم چیزیں واضح ہوئیں اور ریاستوں کے لیے ان علاقوں سے حاصل ہونے والے فوائد کو حاصل کرنے کے ضمن میں یہ لازم قرار پایا کہ سمندر میں متعلقہ حدود اور علاقوں میں ریاستی قانون اور ضوابط کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی قوانین نافذ کئے جائیں۔ ۱۹۹۴ میں پاکستان کی پارلیمنٹ سے ادارے کا قانون (PMSA Act) پاس ہوا جس سے ادارے کو واضح قانونی جواز، ذمہ داریوں اور فرائض کی ادائیگی کے حدود و قواعد کا صراحت سے حوالہ مل گیا۔[۱۳]

اس قانون کی رو سے ادارے کی بنیادی ذمہ داری ریاست کے سمندری حدود و علاقہ جات، بحری مفادات وافرادی قوت کا تحفظ ہے اور اس سلسلے میں ایک رہنما اصول غیر جانبداری کا ہے جس کا التزام ادارے کے قانون کا جزو ہے۔

پاکستان بین الاقوامی قانون کے تحت سمندر میں زندگی کی حفاظت (Safety of Life at Sea (SOLAS) – 1974) کا حصہ ہے اور اس کی پاسداری میں سمندروں میں انسانی خدمات سرانجام دینا اس ادارے کا امتیاز ہے اور اس بات کا التزام کیا جاتا ہے کہ اس عمل میں کوئی جانبداری نہ روا رکھی جائے۔ یہاں تک کہ غیر جانبداری کے اصول کو ایکٹ کا حصہ بنا دیا گیا تاکہ اگر کوئی اہلکار اس کی خلاف ورزی کرتا پایا جائے تو قانون حرکت میں آسکے۔

پاکستان میری ٹائم سیکیورٹی ایجنسی کے سپرد سمندر میں ایک وسیع علاقہ وہ ہے جہاں کسی بھی قسم کے حادثے، کشتی یا جہاز کی گمشدگی کی صورت میں تلاش اور بچاؤ کی ذمہ داریاں ہیں۔ یہ علاقہ آٹھ سو چالیس ناٹیکل میل پر پھیلا ہوا ہے جو پاکستان کے اپنے سمندری علاقہ جات کی حدود یعنی تین سو پچاس ناٹیکل میل سے کہیں زیادہ ہے۔ دیا گیا نقشہ اس سمندری وسعت اور یہاں ادارے کو

---

13 Ministry of Defense, "The Maritime Security Agency, Act, 1994," accessed on September 12, 2021, https://mod.gov.pk/SiteImage/Misc/files/PMSA%20Act%201994.pdf

تفویض کردہ خصوصی علاقہ برائے ذمہ داری مہماتِ تلاش اور بچاؤ کی اہمیت کو سمجھنے میں مدد کر سکتا ہے۔

تصویر نمبر ۲: نقشہ خصوصی علاقہ برائے ذمہ داری مہماتِ تلاش اور بچاؤ (پاکستان میری ٹائم سیکیورٹی ایجنسی)

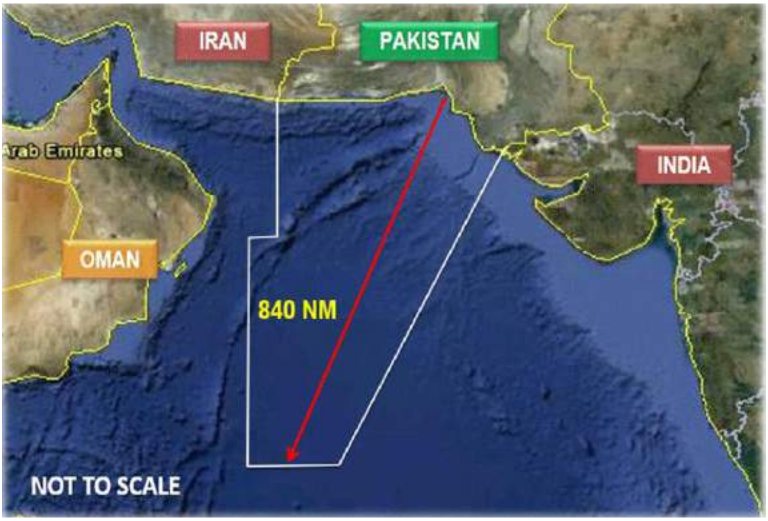


ماخذ: پاکستان میری ٹائم سیکیورٹی ایجنسی

سمندر میں حادثات کی صورت میں فوری مدد نہ پہنچ سکے تو بڑے نقصانات کا باعث ہو سکتا ہے۔ پاکستان کے اس ادارے نے سمندر میں انسانی جان کی حفاظت میں ہمیشہ بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ اس سلسلے میں اگر ادارے سے حاصل کردہ شماریاتی مواد کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بہر حال اس ادارے کی جانب سے پاکستان کی سمندری حدود و علاقہ جات میں ۱۹۹۳ء سے ۲۰۲۰ء تک سرانجام دی جانے والی مہمات مشکل میں مبتلا دو سو دو کشتیوں اور جہازوں کی مدد کی ہے اور اس طرح دو ہزار پانچ سو تیرہ قیمتی جانیں ضائع ہونے سے بچا لی گئی ہیں۔ ان افراد میں بشمول بھارتی اور ایرانی ماہی گیروں کے بحر ہند کے دیگر ساحلی علاقوں سے تعلق رکھنے والے افراد بھی شامل تھے۔ یہ

امر اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ تلاش اور بچاؤ کی سب مہمات غیر جانبداری کے اصول پر مبنی ہوتی ہیں اور بنا کسی تفریقِ قومیت اور پیشہ کے، ابتلا کے شکار سبھی افراد کی مدد کی مکمل کوشش کی جاتی رہی ہے۔ اسی طرح سمگلنگ، غیر قانونی ماہی گیری اور قانون شکنی پر مبنی دیگر سرگرمیوں کو روکنے کے لیے اور سمندری علاقے میں قانون کے نفاذ کے دوران بھی اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ بڑے جانی نقصان کے بغیر ہی قانون کے تقاضے پورے کیے جاتے رہیں۔

پاکستان میری ٹائم سیکیورٹی ایجنسی کی مجموعی کارکردگی کا جائزہ بتاتا ہے کہ ادارے کے بننے سے لے کر ۲۰۲۱ تک سرانجام دی جانے والی مہمات کی تعداد میں ایک بڑا حصہ براہِ راست سمندری علاقہ جات میں تلاش اور بچاؤ کا ہے جو قریباً پینسٹھ ٦٥ فیصد بنتا ہے۔ اسی طرح ایک اور انسانی خدمت جو یہ ادارہ سمندر میں انجام دیتا ہے، وہ بچوں سے لی جانے والی مشقت کو روکنے کے سلسلے میں کیے جانے والے آپریشن ہیں جو کہ ماہی گیری کی کشتیوں پر مزدوری کرنے والے بچوں کی بازیابی کے ہوتے ہیں۔ اس طرح کی مہمات سے ایسے رجحانات کی واضح حوصلہ شکنی ہوتی ہے کہ بچے پڑھنے کی عمر میں مزدوری کریں اور ان کا استحصال جاری رہے۔

سمندری علاقہ جات میں حادثات کی صورت میں وقت ایک انتہائی قیمتی متاع ہے اور تاخیر کی صورت میں نقصان کا اندیشہ بہت بڑھ جاتا ہے۔ اس حقیقت کو مد نظر رکھتے ہوئے عالمی سطح پر خاص اقدامات کیے جاتے ہیں تاکہ بر وقت اطلاع پہنچ سکے اور مطلوبہ مدد فراہم کی جا سکے۔ اس مقصد کے لیے بین الاقوامی طور پر میری ٹائم ریسکیو کوآرڈینیشن سنٹر (Maritime Rescue Coordination Centre-MRCC) قائم کیے جاتے ہیں اور پاکستان میری ٹائم سیکیورٹی ایجنسی کے سپرد ایک یہ ذمہ داری بھی ہے جس کے لیے ادارہ افرادی قوت اور مہارت مہیا کرتا ہے۔ اسی طرح پاکستان کی سمندری حدود یعنی بارہ ناٹیکل میل میں کسی مشکل میں گھر جانے کی صورت میں کشتیوں اور جہازوں کے لیے علاقائی اور مقامی سطح پر فوری مواصلاتی نظام بھی وضع کیا گیا ہے تاکہ وہ فوری مدد اور بچاؤ کا پیغام بھیج سکیں۔ اس کو ''کسی بھی وقت سمندر میں کہیں بھی مدد''

(Assistance Anytime Anywhere at Sea-AAAS) کا نام دیا گیا ہے اور ماہی گیروں، کشتی بانوں اور جہازوں کو اس نظام کے بارے میں بار بار آگاہی دی جاتی ہے تاکہ وہ مشکل یا حادثے کی صورت میں مدد حاصل کر سکیں۔ اس نظام کے ذریعے مقامی استعمال کنندگان، مچھیروں اور متعلقہ لوگوں تک فوری اعلانات یا پیغامات کی رسائی بھی ممکن ہو جاتی ہے جو رابطے کے عمل کو مزید مؤثر کرتی ہے۔

انسانیت کی مدد اور خدمت کا عمل کسی بھی قسم کی تفریقِ قومیت، رنگ و نسل، صنف، مذہب یا پیشے کے کیا جانا چاہیے اور اسی مقصد کے لیے غیر جانبداری کے اصول پر مدد، تلاش اور بچاؤ کے عمل کو پاکستان میری ٹائم سیکیورٹی ایجنسی کے قانون کا حصہ بنایا گیا ہے اور اس کا واضح اظہار ادارے کے دائرہ عمل کے ضمن میں شِق نمبر ۱۰ (Section 10. Powers and Functions of the Agency) کے ذیلی حصے میں کر دیا گیا ہے۔ ذیلی حصہ ڈی (d) تلاش اور بچاؤ کی مہمات کے دوران ہر ممکن مدد فراہم کرنے کے بارے میں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سمندروں میں فرض کی ادائیگی اور انسانیت کی خدمت، دونوں عمل بحسن وخوبی سرانجام دیئے جا سکتے ہیں اور اس میں کوئی جانبداری نہیں برتی جاتی۔

پاکستان میری ٹائم سیکیورٹی ایجنسی کی جانب سے ابتلا اور حادثے کا شکار ہونے والے انسانوں کی جان بچانے کا یہ عمل براہِ راست انسانی خدمات کے زمرے میں آتا ہے۔

علاوہ ازیں انسانی خدمات کا ایک پہلو سمندر میں سرزد ہونے والے جرائم اور مسائل کا سدِباب کرنا بھی ہے تاکہ معاشرہ محفوظ رہ سکے اور معاشی اور اقتصادی سرگرمیاں متاثر نہ ہوں۔ قانون کا نفاذ اور اس سلسلے میں ادارے کی خدمات تمام تر غیر روایتی خطرات سے نمٹنے میں مدد دیتی ہیں اور سمندری حدود و علاقہ جات میں موجود وسائل کا استحصال اور غیر قانونی معاشی سرگرمیاں روک کر قوم کو معاشی نقصانات سے بچانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ مجموعی طور پر سمندر کا

محفوظ ماحول نہ صرف ملک کی اقتصادی حالت کو بہتر بناتا ہے بلکہ ہموار عالمی بہاؤ کو یقینی بنانے میں اپنا کردار ادا کرتا ہے جس کے لئے مذکورہ ادارے کا کردار قابلِ تحسین ہے۔

## ۵۔ اختتامیہ

زندگی کا کوئی بھی دائرہ ہو قانون کا نفاذ بذاتِ خود انسانیت کی حفاظت ہے مگر سمندر کی وسعتوں میں جان پر کھیل کر دوسرے انسانوں کی جان بچانا اور مشکل کی گھڑی میں ان کے کام آنا غیر معمولی اہم بات ہے۔ چونکہ سمندر میں درپیش خطرات و مسائل کی نوعیت خشکی سے کسی حد تک مختلف ہے اور روایتی پیمانے سے زیادہ غیر روایتی تحفظ و سلامتی کسی بھی ساحلی ملک کی سمندری حدود و علاقہ جات میں بہت ضروری ہے۔ پاکستان میں سمندر کے اندر ان غیر روایتی خطرات سے نبرد آزما ہونے کے لیے پاکستان میری ٹائم سیکیورٹی ایجنسی ریاستی اور بین الاقوامی قوانین کے تحت مکمل غیر جانبداری برتتے ہوئے اپنے فرائض ادا کرتی ہے اور مذکورہ علاقے میں انسانیت کی خدمت بذریعہ تلاش اور بچاؤ کی مہمات کے دوران کوئی کسر نہیں رکھی جاتی۔ یہ تحقیقی مقالہ شماریاتی اور کیفیتی تحقیقی مواد کے ذریعے اس بات کو واضح کرتا ہے کہ سمندر میں ان مہمات کے ذریعے براہِ راست انسانی خدمات کے ساتھ ساتھ قانونی معاشی سرگرمیوں، محفوظ و مامون جہاز رانی، سمندری وسائل کی حفاظت اور جائز استعمال کو یقینی بنانے اور قانون کے نفاذ کے ذریعے بالواسطہ انسانی خدمات بھی سرانجام دی جاتی ہیں جو بین الاقوامی سطح پر ملک کی نیک نامی اور دوسرے ممالک کے ساتھ بہتر تعلقات کی بنیاد رکھتی ہیں۔ سمندری حدود و علاقہ جات میں امن و سلامتی اور جہاز رانی کے لئے محفوظ و مامون سمندر کو ممکن بنانے میں پاکستان ایک ممتاز مقام رکھتا ہے اور اسی طرح انسانیت کی خدمت میں غیر جانبداری کے اصول پر عمل کرتے ہوئے تمام موجود وسائل کو بروئے کار لاکر پاکستان میری ٹائم سیکیورٹی ایجنسی اپنی ذمہ داریاں ادا کرتی ہے جو سمندر میں پائیدار امن کو یقینی بناتا ہے۔

# پاکستان میں انسانی خدمات: نوعیت اور مسائل

راحیلہ خان*

انسانی خدمت یا اپنے جیسے دوسرے انسانوں کی خیر خواہی کے جذبے کا تصور بھی اتنا ہی پرانا ہے جتنی بنی نوع انسان کی تاریخ ہے۔ انسانی خدمت کا سادہ مفہوم یہ ہے کہ انسان جو خیر خواہی و بھلائی اپنے لئے چاہتا ہے وہی دوسروں کے لئے بھی چاہے۔ دنیا میں اس جذبہ کے تحت انفرادی اور اجتماعی سطح پر کئی کوششیں ہر وقت جاری رہتی ہیں۔ مخیر افراد اور تنظیمیں انسانیت کی خدمت کرنے میں مصروف ہیں۔ تاہم اسلام بطور ایک نظامِ زندگی سب سے زیادہ زور دوسروں کے حقوق کی ادائیگی پر دیتا ہے۔

اسلام اپنے نظامِ اخلاق اور نظامِ معیشت کے ذریعے ایسا معاشرہ تشکیل دیتا ہے جس میں دولت اوپر والے ہاتھ سے نیچے والے ہاتھ کو منتقل ہوتی ہے اور بالعموم مستحق کو ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ زکوٰۃ کا منفرد نظام دنیا کے کسی بھی مذہب یا معیشت میں موجود نہیں ہے۔[1] اسلام میں ایک دوسرے پر خرچ کرنے کی فضیلت کا اندازہ اس آیت سے بھی لگایا جاسکتا ہے جس میں اللہ کی راہ میں خرچ کو ایسا قرض قرار دیا گیا ہے جو خود ربِ کائنات کو دیا گیا ہو۔ ارشاد باری تعالی ہے: ''کون ہے جو اللہ کو قرض دے؟ اچھا قرض، تاکہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا کر واپس دے، اور اس

---

* ایڈووکیٹ۔ ریسرچ آفیسر، ویمن اسلامک لائیرز فورم

[1] مولانا سید ابوالاعلی مودودی، اسلامی نظام زندگی اور اس کے بنیادی تصورات، ستمبر ۲۰۱۶، اسلامک پبلی کیشنز، ص۳۱۹

کے لئے بہترین اجر ہے"۔[2]

## پاکستان میں انسانی خدمات کی ضرورت

قیام پاکستان کے بعد نوزائیدہ مملکت کو بے پناہ مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔[3] ان مسائل کی نوعیت کچھ ویسی ہی تھی جو پہلی اسلامی ریاست کو چودہ سو سال قبل اپنی تشکیل کے وقت درپیش تھے۔ ان مسائل میں مہاجرین کی آبادکاری سمیت معاشی، سیاسی، سماجی اور ان سے بڑھ کر سلامتی کو درپیش مسائل تھے۔ اِن مسائل کو رسول اللہ ﷺ کی بہترین قائدانہ صلاحیتوں اور صحابہ کرام[4] کی بے مثال محنت اور اخلاص سے حل کر لیا گیا تھا۔[5]

قیامِ پاکستان کے بعد درپیش مسائل کو بھی حل کر لیا جاتا اگر اسوۂ رسول ﷺ پر عمل کر لیا جاتا۔ تاہم بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا بلکہ ان مسائل کی تعداد اور ان کی نوعیت بھی بدلتی رہی۔ ان مسائل نے پاکستان کو ایک فلاحی ریاست بننے نہ دیا۔ اس بہت بڑے خلا کو پورا کرنے کے لیے مخیّر افراد اور فلاحی تنظیموں نے عوامی محرومیوں اور مسائل کو کم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

## پاکستان میں انسانی خدمات اور ان کی اہمیت

سماجی، معاشرتی و معاشی مسائل اور ناہمواریوں نے پاکستان میں انسانی خدمات کی اہمیت کو بڑھا دیا ہے۔ تاہم ان متعدد مسائل کے ساتھ پاکستان میں انسانی امداد کا جذبہ بھی ہمیشہ سے عروج پر رہا ہے۔ پاکستانی قوم اپنی جی۔ڈی۔پی کا تقریباً ایک فی صد سے زیادہ ہر سال زکوٰۃ، فطرانہ، صدقات و خیرات کی مد میں خرچ کرتی ہے جو کہ امیر ممالک یعنی برطانیہ، کینیڈا اور پڑوسی ملک انڈیا سے دوگنا

---

[2] الحدید: ۱۱

[3] زاہد منیر عامر، سید عطاءاللہ شاہ بخاری اور پاکستان، ص ۲۰۷

[4] شاہ معین الدین احمد ندوی، خلفائے راشدین، مکتبہ اسلامیہ، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۱۵

[5] مولانا عبدالحئی، حیات طیبہ، ۲۰۱۳ء، اسلامک پبلی کیشنز لاہور، ص ۱۴۹-۱۵۲

ہے۔[6] اس میدان میں پاکستان میں انسانی امداد انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر سرگرم ہے۔ بعض ایسی سرگرمیوں کا تذکرہ ذیل میں کیا گیا ہے۔

## پناہ گزینوں کی میزبانی

پاکستان نے ۴۰ سال سے زیادہ عرصے سے لاکھوں افغان مہاجرین کی میزبانی کی ہے۔ اب بھی پاکستان میں تقریباً چودہ لاکھ (۱.۴ملین) افغان مہاجرین کا باقاعدہ اندراج ہے[7] جبکہ غیر مندرج افراد کی تعداد بھی لاکھوں میں ہے۔ اگرچہ افغانستان کے حالات عالمی طاقتوں کے پیدا کردہ ہیں لیکن پاکستان ان کے اثرات سے کسی نمایاں بین الاقوامی مدد کے بغیر نمٹ رہا ہے۔ یقیناً اس میں عوام اور حکومت کا جذبۂ اخوّت اور انسانی ہمدردی کار فرما ہے۔ اس کے علاوہ بھی دنیا بھر میں عام مصیبت کے شکار افراد کی مدد کے لیے پاکستانی حکومت اور عوام پیش پیش ہوتے ہیں۔ سری لنکا، شام، برما، فلسطین اور افغانستان سمیت پاکستانی عوام بلا تفریقِ رنگ و نسل مالی اور ذاتی خدمات کی فراہمی میں کردار ادا کر چکے ہیں۔

## ملک میں قدرتی آفات و مصائب

پاکستان پے در پے قدرتی خطرات کا شکار ہے جن میں خشک سالی، سیلاب، گرمی کی لہریں، شدید سردی اور زلزلہ شامل ہیں۔ کلائمیٹ رسک انڈیکس (climate risk index) ۲۰۲۰ کے

---

[6] The News ,Pakistan with most generous people to mark day of charity on sep 5, Islamabad, 30 August 2020,https://www.thenews.com.pk/print/707761-pakistan-with-most-generous-people-to-mark-day-of-charity-on-sept-5
Munnazzah Raza, these charities could use your support in 2021, jan, 2021 https://images.dawn.com/news/1186358
Shazia. M. Amjad & Muhammad Ali ,Philanthropy in Pakistan Mar, 2018, https://ssir.org/articles/entry/philanthropy_in_pakistan
Ayesha Imtiaz, bbc, April 2020 https://www.bbc.com/travel/article/20200331-the-law-of-generosity-combatting-coronavirus-in-pakistan

[7] UNHCR, Operational Data Portal, n.d https://data.unhcr.org/en/country/pak

مطابق، پاکستان شدید موسمی تغیرات سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والے ممالک کے لحاظ سے ۵ویں نمبر پر ہے، اور موسمیاتی خطرات میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ ۲۰۰۵ کے تباہ کُن زلزلے میں پاکستانی قوم کے جذبۂ ایثار و خدمت نے دنیا بھر کو متاثر کیا۔ ۲۰۱۰ میں ملک بھر میں آنے والے سیلاب اور ملک کے مختلف حصوں میں وقتاً فوقتاً پیدا ہونے والی خشک سالی کی کیفیات میں عوامی امداد ہی زندگیاں بچانے اور حالات کو معمول کی طرف لانے میں کلیدی کردار ادا کرتی رہی۔ ۲۰۲۰ کے اوائل میں دنیا کے بیشتر خطوں کی طرح پاکستان میں بھی کووِڈ ۱۹ نے شدید حملہ کیا۔ ایسے میں جب اس عالمی وبا نے دنیا کے بیشتر ممالک میں انسانی المیہ پیدا کر دیا تھا، پاکستان میں عوام کی باہم ہمدردی اور غمگساری نے بے روزگار ہو جانے والوں اور دیگر ناداروں کی امداد کی نمایاں مثال قائم کی۔[۸] انفرادی سطح پر تعاون و امداد کے علاوہ کرونا ریلیف فنڈ میں بھی پاکستانیوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ اعداد و شمار کے مطابق وزیر اعظم کی جانب سے مختلف ٹی وی چینلز کے ساتھ مل کر کیے گئے احساس ٹیلی تھون پروگرام (ایک دن کے پروگرام) کے تحت ۱۲ ارب ۶۷ کروڑ روپے سے زائد کے عطیات جمع ہوئے۔[۹]

## انفاق کا عمومی رجحان

ایک حالیہ اندازے کے مطابق پاکستانی سالانہ ۵۰۰ ارب روپے زکوٰۃ اور صدقہ کے نام پر دیتے ہیں جو کہ ملک کی جی ڈی پی کا ۳ فیصد ہے۔ اگر فی کس آمدنی کی بنیاد پر دیکھا جائے تو یہ دنیا میں سب سے زیادہ فی صد ہے۔[۱۰] سال ۲۰۰۵ کے زلزلہ میں عوام نے متاثرین کی مالی اور جسمانی طور پر بڑھ چڑھ کر امداد کی۔ اسی طرح کی دیگر کئی مثالیں ہیں جو کہ پاکستانی عوام کی سخاوت کو ظاہر کرتی ہیں۔

---

8 https://reliefweb.int/report/pakistan/pakistan-humanitarian-response-plan-2021-april-2021

۹ ضیاء الرحمٰن، پاکستان میں ٹیلی تھون کے ذریعے عطیات جمع کرنے کی مہم کتنی شفاف، اپریل ۲۴، ۲۰۲۰، https://www.urduvoa.com/a/coronavirus-live-telethon/5390012.html

10 THE NEWS, Pakistanis donate Rs500 billion yearly, equal to 3pc of GDP, Mar, 2020 https://www.thenews.com.pk/print/628950-pakistanis-donate-rs500-billion-yearly-equal-to-3pc-of-gdp

پاکستانیوں کی اکثریت روزانہ کی بنیاد پر براہِ راست صدقہ وخیرات بھی کرتی ہے۔ مگر بدقسمتی سے روزانہ کے صدقہ وخیرات کی ایک بڑی مقدار پیشہ ور بھکاریوں کو چلی جاتی ہے۔ جس سے مستحقین کی حق تلفی ہوتی ہے۔ اس حوالے سے درست اعداد وشمار دستیاب نہیں ہیں تاہم بعض پیش کردہ اعداد وشمار واضح طور مبالغہ آمیز ہیں ایک اندازے کے مطابق ملک میں ۵ سے ۲۵ ملین کے درمیان بھکاری ہیں جو کہ ہماری آبادی کا تقریباً اڑھائی سے ۱۱ فی صد ہیں۔[11]

پاکستان میں انفرادی خدمت کے جذبہ کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ کئی افراد نے انفرادی طور پر لوگوں کے لئے فلاح وبہبود کا کام کیا اور پھر اپنی انفرادی کوششوں کا دائرہ کار وسیع کرتے ہوئے کئی تنظیمیں قائم کیں۔[12] کئی تنظیمیں انسانی خدمت کے انفرادی جذبے سے وجود میں آئیں اور اس وقت کئی دائرہ کار میں وسیع طور پر کارِ خیر میں مصروف ہیں۔

## اجتماعی سطح پر خدمات

اجتماعی انسانی امداد کے لئے پاکستان میں قائم کئی تنظیموں کا تعلق برصغیر میں قائم ہونے والی رجسٹرڈ این جی اوز سے ہے۔ جس وقت انگریز حکومت نے انفرادی سطح پر لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے سوسائٹی رجسٹریشن ایکٹ آف ۱۸۶۰ منظور کیا، اس دور کے کئی ادارے آج بھی پاکستان میں سرگرمِ عمل ہیں۔ ان میں انجمن حمایتِ اسلام (۱۸۸۶)[13]، دیال سنگھ ٹرسٹ (۱۸۹۵)[14] اس

---

[11] DAWN News, Beggar mafia, from the newspaper, 18 may, 2020 https://www.dawn.com/news/1557949

[12] ایدھی فاؤنڈیشن، سیلانی ویلفیئر انٹرنیشنل ٹرسٹ، جی ڈی سی فاؤنڈیشن، شوکت خانم کینسر ہسپتال، شاہد آفریدی فاؤنڈیشن، چھیپا ویلفیئر ایسوسی ایشن، انصار برنی ٹرسٹ انٹرنیشنل، عورت فاؤنڈیشن، زندگی ٹرسٹ اور صارم برنی ٹرسٹ، عالمگیر ویلفیئر ٹرسٹ ایسی ہی چند نمایاں مثالیں ہیں۔

[13] روف طفر، انجمن حمایت اسلام ادارہ ہی نہیں، تحریک بھی، میگزینز، سنڈے میگزین جنگ ۱۰ نومبر ۲۰۱۹
https://jang.com.pk/news/696539

[14] اشرف علی، دیال سنگھ ٹرسٹ پبلک لائبریری، روزنامہ دنیا، جنوری ۲۰۱۶
https://dunya.com.pk/index.php/special-feature/2016-01-16/14624

عرصے کے دوران قائم کیئے گئے۔اس کے علاوہ اسی دور میں ایک نمایاں مقامی انسان دوست شخصیت سر گنگارام کی بھی تھی جن کی خدمات کو برطانوی راج نے تسلیم کرتے ہوئے انھیں سر کے خطاب سے نوازا۔ ان کے نام سے موسوم ٹرسٹ بھی موجودہ پاکستان میں کام کر رہا ہے۔[۱۵] اس وقت پاکستان میں نہ صرف سوسائٹی رجسٹریشن ایکٹ[۱۶] کے تحت ایک تنظیم کو رجسٹر کروایا جاسکتا ہے بلکہ ملک میں اس مقصد کے لئے ۱۳ مختلف قوانین موجود ہیں جن کے تحت ایک تنظیم قانونی طور پر کام کر سکتی ہے۔[۱۷] پاکستان سنٹر فار فلانتھراپی کے حوالے سے بیان کردہ ایک اندازے کے مطابق پاکستان میں ایک سے ڈیڑھ لاکھ غیر سرکاری، غیر منافع بخش فلاحی تنظیمیں (این جی اوز) مصروفِ عمل ہیں۔[۱۸] یہ تعداد اس حوالے سے مبالغہ آمیز محسوس ہوتی ہے کہ پنجاب کے شعبہ سماجی بہبود کی ویب سائٹ پر ضلع وار دستیاب تعداد کے مطابق ۲۰۱۶ء میں صوبہ پنجاب میں رجسٹرڈ کل غیر سرکاری سماجی تنظیموں کی تعداد ۴۸۴۷ تھی۔[۱۹] جبکہ سندھ سوشل ویلفئیر

---

[۱۵] عقیل عباس جعفری محقق و مورخ، سر گنگارام فادر آف لاہور کون تھے اور ان کے شہر نے ان کو کیوں بھلا دیا؟ کراچی، بی بی سی، اپریل ۲۰۲۱ https://www.bbc.com/urdu/regional-56726808

[16] The Societies Registration Act ,1860 http://pakistancode.gov.pk/pdffiles/administrator0dc721bb2bef23db45633e35e344ae27.pdf

[17] The Societies Registration Act, 1860, The Trusts Act (II of 1882), The Voluntary Social Welfare Agencies Registration and Control Ordinance 1961), The Companies Act, 2017, The Religious Endowments Act 1863, The Charitable Endowments Act (VI of 1890), The Mussalman Wakf Validating Act, 1913, The Charitable and Religious Trusts Act, 1920, The Mussalman Wakf Act, 1923, The Cooperative Societies Act, 1925, The Mussalman Validation Act, 1930, The Local Government Ordinance, 2001, Income Tax Ordinance 2001 (For Tax benefits after registration with CSO Law),
حال ہی میں ایسی قانون سازی کی گئی ہے جس کے ذریعے مختلف قسم کی رفاہی سرگرمیوں کو ایک قانون کے تحت یکجا کر دیا گیا ہے تاہم یہ عمل ابھی تمام صوبوں اور انتظامی علاقوں میں مکمل نہیں ہوا۔

[18] Faiza Shah, The rise of NGOs and their harmful impact on Pakistan, update 11 Aug, 2016, https://herald.dawn.com/news/1152863

[19] Social Welfare Department, *List of NGOs*, Government of the Punjab, https://swd.punjab.gov.pk/list_of_ngos

ڈیپارٹمنٹ کے اعداد و شمار کے مطابق سندھ میں ۶۹۰۴ رضاکار ادارے ہیں۔[20] حکومتی سطح پر بعض کوششوں کے ذریعے غیر سرکاری تنظیموں کو ایک انتظامی ڈھانچے میں لانے اور ان کی سرگرمیوں کو مربوط انداز میں جاری رکھنے کے لیے کوشش کی جارہی ہے۔ تاہم اس جائزے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ تمام رجسٹرڈ این جی اوز سے متعلق اعداد و شمار اور معلومات کا یکجا ہونا کس قدر ضروری ہے۔ ایک اندازے کے مطابق تقریباً ۴۶ فیصد رفاہی تنظیمیں تعلیم کے شعبہ میں، ۱۷ فی صد شہری حقوق اور باقی صحت، امداد، ثقافت، اور تفریح کے شعبوں میں سماجی خدمات فراہم کر رہی ہیں۔[21]

## تنظیموں کی قانونی حیثیت

دنیا بھر میں بڑی تعداد میں ایسی غیر سرکاری تنظیمیں کام کر رہی ہیں جو حکومتی اثر سے آزاد ہیں اور غیر منافع بخش بنیادوں پر کام کرتی ہیں۔ پاکستان میں غیر سرکاری تنظیم یا فلاحی تنظیم سے متعلق کئی قوانین رائج ہیں جن میں ان کی مختلف اصطلاحیں بیان کی گئی ہیں۔ سوسائٹی رجسٹریشن ایکٹ ۱۸۶۰ کے تحت اس سے مراد ادبی، سائنسی یا فلاحی مقصد کے لئے بنائی گئی تنظیم ہے۔[22] چیریٹیبل انڈوومنٹس ایکٹ ۱۸۹۰ کے تحت تنظیم سے مراد غریبوں کے لئے ریلیف، تعلیم، طبّی امداد اور ہر کسی کے لئے ترقی یا مفاد عامہ ہے جس کا مقصد صرف مذہبی تعلیم یا عبادت تک مخصوص نہ ہو۔[23] کمپنیز ایکٹ ۲۰۱۷ کی دفعہ ۴۲ کے مطابق "فروغ دینے کے لئے بنائی گئی انجمنوں سے مراد تجارت،

---

[20] Social Welfare Department, Sindh, voluntary agencies, https://swd.sindh.gov.pk/voluntary-agencies

[21] Giving to Pakistan: Guidelines for Donors, Pakistan Centre for Philanthropy https://www.pcp.org.pk/uploads/Giving-to-Pakistan-24052021.pdf

[22] The societies Registration Act 1860, Preamble, page 2 http://pakistancode.gov.pk/pdffiles/administrator0dc721bb2bef23db45633e35e344ae27.pdf

[23] Charitable Endowments Act (VI of 1890), section 2. Definition https://balochistan.gov.pk/wp-content/uploads/2019/07/CHARITABLE-ENDOWMENTS-ACT-1890.doc.pdf

فن، سائنس، مذہب، کھیل، سماجی خدمات، صدقہ یا کوئی اور مفید چیز ہے"[24]۔ دوسری طرف ماہرین کے نزدیک پاکستان میں فلاحی تنظیم کی پہلی باضابطہ تعریف انکم ٹیکس آرڈیننس ۲۰۰۱ میں کی گئی ہے جس کی دفعہ ۲ کی ذیلی دفعہ (۳۶) کے تحت غیر منافع بخش تنظیم سے مراد مذہبی، تعلیمی، فلاحی یا فلاحی کاموں کے لئے قائم کردہ (مفاد عامہ کے مقاصد کے لئے)، یا کسی شوقیہ کھیل کے فروغ کے لئے یا غیر منافع بخش ادارے کے طور پر کسی بھی ملکی قانون کے تحت تشکیل کردہ رجسٹرڈ تنظیم ہے۔[25] گویا ان تمام قوانین کے تحت ایک تنظیم سے مراد مفادِ عامہ کے لئے قائم کردہ ایک غیر سرکاری اور غیر منافع بخش ادارہ ہے۔

## فلاحی خدمات کے لیے وسائل کی فراہمی

فنڈز کسی بھی فلاحی کام کو کرنے کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آج کل کے دور میں افرادی قوت سے بھی زیادہ اہمیت فنڈز کی ہے۔ کیونکہ فنڈز سے افرادی قوت بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ فلاحی کام انفرادی ہو یا اجتماعی، دونوں صورتوں میں مالی وسائل کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ ماضی میں فلاحی کاموں میں استعمال ہونے والے فنڈز کے متعلق حکومت کی کوئی سخت پالیسی نہیں تھی، مگر ان فنڈز کے غلط استعمال کی خبریں سامنے آنے پر اور کئی فلاحی کاموں کے نام پر کالا دھن سفید کرنے، فلاحی رقوم کو ملکی سلامتی کے خلاف استعمال کی شکایات کی بنا پر اور فنانشل ایکشن ٹاسک فورس یعنی ایف اے ٹی ایف کی پابندیوں کی وجہ سے حکومت نے زیرو ٹولرنس (zero tolerance) کی پالیسی بنائی اور منی لانڈرنگ ایکٹ منظور کرنے سمیت کئی سخت اقدامات اٹھائے۔ جس کی وجہ سے کسی بھی فلاحی تنظیم، مدرسہ یا کسی بھی قسم کے فنڈز کے لیے آنے والی رقوم (سوائے اندرونی یا بیرونی امدادی فنڈز کے) سٹیٹ بینک، وزارت داخلہ اور خارجہ کی این او سی

---

[24] The Companies Act, 2017, section 42 https://www.secp.gov.pk/document/companies-act-2017/?wpdmdl=28472

[25] Income Tax Ordinance, 2001 section 2 (36) https://download1.fbr.gov.pk/Docs/20217141672549772IncomeTaxOrdinanceAmendedupto30.06.2021.pdf

کے بغیر نہیں آسکیں گی۔[26]

چنانچہ فلاحی تنظیموں کو ان وجوہات کی بنا پر سخت قواعد وضوابط کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے (زیادہ تر بڑی تنظیمیں اپنی آمدنی اور خرچ کو اپنی سالانہ رپورٹ میں سامنے لارہی ہیں) اور ماضی کے مقابلے میں اب غیر رجسٹرڈ تنظیموں کی تعداد بھی کم ہو کر رہ گئی ہے۔ ملک بھر کے ۳۵ ہزار سے زائد مدارس کی رجسٹریشن کو ایک اہم ہدف کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ مدارس کی ایک بڑی تعداد نہ صرف دینی تعلیم بلکہ طلبہ وطالبات کی فلاح وبہود (رہائش، خوراک، صحت کی سہولیات وغیرہ) میں مصروف کار ہیں۔

## ٹیکس سے استثنیٰ

تمام فلاحی تنظیمیں جو کہ غیر منافع بخش اور غیر سرکاری ہوتیں ہیں ان کو قانوناً ملکی ٹیکس سے استثنیٰ (بمطابق انکم ٹیکس رولز ۲۰۰۲) دیا جاتا ہے۔ ان کے فنڈز پر کوئی ٹیکس عائد نہیں ہوتا۔[27]

## انفرادی اور اجتماعی انسانی خدمات فراہم کنندگان کا تقابلی جائزہ

### جامع اور منضبط کام

انفرادی امداد اجتماعی انسانی امداد کے مقابلے میں جامع اور منضبط نہیں ہوتی۔ اجتماعی امداد یعنی مختلف این جی اوز اور رضاکار تنظیمیں ایک مربوط نظام کے تحت کام کرتی ہیں۔ یہ این جی اوز سال بھر کا منصوبہ بناتی ہیں اور پھر اس کے تحت فنڈز حاصل کرکے امداد فراہم کرتی ہیں۔ اجتماعی انسانی امداد انسانی خواہشات کے برعکس ریسرچ سے جڑی ہوتی ہے۔ ان کے منصوبے میں یہ بات شامل ہوتی ہے کہ کن علاقوں میں کس قسم کی اور کتنی امداد کی ضرورت ہے، مزید یہ کہ اس امداد کو کس طرح

---

[26] FATF, Pakistan, related publications, https://www.fatf-gafi.org/countries/#Pakistan

[27] Pakistan Centre for Philanthropy, NPO Certification https://www.pcp.org.pk/ngo.html

بہتر انداز میں مستحقین تک پہنچایا جاسکتا ہے۔

## تسلسل کے ساتھ کام

فلاحی تنظیموں کے کاموں میں ایک تسلسل ہوتا ہے اور انفرادی شخصیات کے فلاح و بہبود کے کام وقتی ہوتے ہیں۔ یہ شخصیات وقتی طور پر اپنی پسند کی امداد فراہم کرنے کے بعد اپنے کاروبارِ زندگی میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ فلاحی کاموں میں تسلسل نہ ہونے کی وجہ سے دیرپا فوائد حاصل نہیں ہوتے۔ عام طور پر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ انفرادی سطح پر مالی امداد کو ہی زیادہ فوقیت دی جاتی ہے۔

## قواعد وضوابط کی پابندی

ایک طرف اجتماعی فلاحی کام کرنے والی تنظیمیں ملکی قوانین کی پابند ہوتی ہیں، تو دوسری طرف انفرادی شخصیات فلاحی کام کرتے وقت عام طور پر قواعد وضوابط کی پابند نہیں ہوتیں کیونکہ ان کا کام کسی قانون کے تحت رجسٹر ہو کر نہیں ہوتا۔

## دائرہ کار میں وسعت

انفرادی امداد محدود ہوتی ہے جبکہ اجتماعی سطح یعنی فلاحی تنظیموں کا دائرہ کار بہت وسیع ہوتا ہے۔ انفرادی امداد شخصیات کی پسند وناپسند پر بھی مشتمل ہوتی ہے۔ یعنی اگر کسی کو صحت کے حوالے سے امداد پسند ہے یا اس کی دلچسپی اس کام میں ہے تو وہ اپنی تمام تر امداد کسی ہسپتال کو دے کر فارغ ہو جائے گا۔ جبکہ دوسری طرف تنظیمیں صرف صحت کے حوالے سے کام نہیں کریں گی بلکہ انسانی ضروریاتِ زندگی کے ہر شعبے کے لیے امداد فراہم کریں گی۔

## غیر جانبداری

پاکستان میں تمام بڑی فلاحی تنظیمیں غیر جانبدار ہیں اور بغیر کسی رنگ ونسل یا مذہبی امتیاز کے انسانی خدمات کی فراہمی میں مصروف ہیں۔ اسی طرح انسانی خدمات سرانجام دینے والی شخصیات بھی غیر جانبدار رہ کر غربا و مساکین اور مسکینوں کے کام آتی ہیں۔ گویا غیر جانبداری فلاحی امور کے لئے

روح کی حیثیت رکھتی ہے اور جانبداری فلاح بہود کے کاموں پر سوالیہ نشان لگا دیتی ہے۔

## سیاسی و مذہبی وابستگی

پاکستان میں انسانی خدمات میں مصروف بیشتر تنظیموں اور انفرادی شخصیات کا نہ تو کوئی سیاسی ایجنڈا ہے نہ ہی وہ کوئی سیاسی وابستگی رکھتی ہیں۔ بعض تنظیمیں مذہبی شناخت کے ساتھ کارِ خیر میں مصروف ہیں۔ پاکستان میں زلزلے کے بعد سیلابی صورتحال میں بھی مذہبی جماعتوں کا فلاحی کردار قومی اور بین الاقوامی سطح پر ابھر کر سامنے آیا۔ بعض تنظیموں پر حکومت نے پابندی بھی عائد کی۔[۲۸] کچھ تنظیمیں مذہبی شناخت رکھتے ہوئے بھی بغیر کسی امتیاز کے عوام کی خدمت کرنے میں مصروف ہیں۔[۲۹]

## تجربہ اور کام کا جذبہ

فلاحی کام کرنے والی زیادہ تر تنظیمیں تجربہ کار ہوتیں ہیں۔ وہ تقریباً ہر پروجیکٹ کو پوری تیاری اور ریسرچ کے ساتھ سرانجام دیتی ہیں تاکہ ان کے وسائل ضائع نہ ہوں۔ جبکہ دوسری طرف انفرادی شخصیات ناتجربہ کار ہوتی ہیں اور ان کو فلاحی امور کے متعلق زیادہ علم بھی نہیں ہوتا۔ تاہم ان کے اندر فلاحی کام کرنے کا جو شوق اور جذبہ ہوتا ہے وہ تنظیمی سطح پر افراد میں نسبتاً کم یا بالکل نہیں ہوتا۔ تنظیمیوں کے افراد کام کو ڈیوٹی کی طرح بغیر جذبہ کے یا مشین کی طرح انجام دیتے ہیں۔

---

[۲۸] ریاض سہیل، بی بی سی اردو، اگست ۲۰۱۰
https://www.bbc.com/urdu/pakistan/2010/08/100810_banned_outfits_relief_work

علی سلمان، بی بی سی اردو
https://www.bbc.com/urdu/pakistan/story/2008/12/081216_jamatudawa_react_fz

[29] Alkhidmat foundation, review of introduction n.d. https://alkhidmat.org/introduction/

## تنظیموں کے مثبت اور منفی اثرات

پاکستان میں کام کرنے والی تنظیموں میں کچھ بڑی ہیں تو کچھ چھوٹی، کچھ جانب دار تو کچھ غیر جانبدار، کچھ سیاسی وابستگی رکھتی ہیں تو کچھ مکمل طور پر سیاسی اثر ورسوخ سے آزاد ہیں۔ کچھ مذہبی شناخت رکھتی ہیں تو کچھ لبرل کہلاتی ہیں۔ کچھ کا دائرہ کار محدود ہے تو کچھ کئی معاملات میں مصروفِ کار ہیں۔ کچھ سرکاری اثر ورسوخ رکھتی ہیں تو کچھ اس سے محروم ہیں۔ کچھ عوام میں مقبول ہیں تو کچھ مشکوک ہیں۔ ذیل میں فلاحی کام کرنے والی تنظیموں کے مثبت اور منفی کردار کا جائزہ لیا جارہا ہے۔

### حکومت کا بوجھ بانٹنا

اگر یہ کہا جائے کہ پاکستان میں فلاحی تنظیموں نے بڑی حد تک حکومت کا بوجھ خود اپنے کندھوں پر اٹھالیا ہے تو غلط نہیں ہوگا۔ یہ فلاحی تنظیمیں نہ صرف صحت، تعلیم اور خوراک جیسی بنیادی ضروریات زندگی کی فراہمی میں مصروف ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ زندگی کے تقریباً ہر شعبہ میں حکومت سے آگے بڑھ کر کام کررہی ہیں۔

### سہولت کار/سروس فراہم کنندہ کا کردار

حکومت مختلف فلاحی اور انسانی حقوق کے لئے کام کرنے والی تنظیموں کی کارکردگی کا نہ صرف اعتراف کررہی ہے، بلکہ بعض نئے قوانین میں رجسٹرڈ این جی اوز کو سروس کنندہ قرار دے کر ان سے باقاعدہ مدد لے رہی ہے۔ مثلاً انٹی ریپ آرڈیننس ۲۰۲۰ء اور گھریلو تشدد کا قانون برائے ۲۰۲۱ء وغیرہ میں متاثرین کی طبّی، جسمانی، نفسیاتی امداد، نیز سماجی اور قانونی امداد کے لئے ان کو سروس کنندہ قرار دیا گیا ہے۔ تاہم ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد کے عالمی منظر نامے میں مذہب کی بنیاد پر انسانی خدمات فراہم کرنے والی مسلم تنظیموں کے لیے مشکلات میں اضافہ بھی ہوا ہے۔

### بڑے شہروں میں کام

پاکستان میں تنظیموں کی ایک بڑی تعداد بڑے شہروں میں کارِ خیر میں مصروفِ عمل ہے۔ یہ درست

عمل اس وقت غلط ہو جاتا ہے جب یہ تنظیمیں چھوٹے چھوٹے شہروں اور علاقوں کو نظر انداز کر دیتی ہیں یا ان کے پاس اتنے وسائل ہی نہیں بچتے کہ یہ ان علاقوں میں بھی فلاحی کام کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات کئی افسوس ناک واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔[۳۰]

## مقامی افراد کی شمولیت

کئی تنظیمیں جس شہر میں امدادی کام یا پروجیکٹ شروع کرتی ہیں، اس شہر کے مقامی افراد کے بجائے بڑے شہروں کے افراد کے ساتھ کم کرنے کو ترجیح دیتی ہیں۔ یوں مقامی افراد کی حق تلفی کے ساتھ ساتھ پروجیکٹ میں خاطر خواہ فوائد بھی حاصل نہیں ہو پاتے۔

## مقامی ثقافت

فلاحی تنظیموں کے لیے ضروری ہے کہ جس علاقے میں وہ کام کر رہی ہیں وہاں کی مقامی ثقافت کو ملحوظِ خاطر رکھیں اور اپنے پروجیکٹس کو مقامی ثقافت سے ہم آہنگ کریں۔ بعض تنظیمیں اس مقصد میں کافی حد تک ناکام ہیں۔

## تشہیر اور امدادی رقوم

شہر کی سڑکوں پر لگے مختلف اشتہارات (خاص طور پر رمضان کی آمد پر) سے ظاہر ہوتا ہے کہ مختلف تنظیمیں امداد کے لئے اشتہارات لگانے پر کثیر رقم خرچ کر رہی ہیں۔ حالانکہ اس کام پر صرف کردہ رقم ان کو فلاح و بہبود کے لیے دی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں معروف سماجی کارکن مولانا عبدالستار

---

[۳۰] چند واقعات کی تفصیلات ملاحظہ فرمائیے:

ویب ڈیسک، مارچ ۲۰۲۱

Siasat.pk https://urdu.siasat.pk/news/2021-03-16/news-86394

جیو نیوز، ویب ڈیسک، جون ۲۰۲۰

https://urdu.geo.tv/latest/224027

جاوید چوہدری، مانیٹرنگ ڈیسک، مئی ۲۰۱۸

http://javedch.com/pakistan/2018/05/30/453745

ایدھی کا کہنا تھا کہ وہ اشتہارات کی اس قسم کی جنگ یا بہت بڑی اشتہاری مہم چلانے پر یقین نہیں رکھتے۔ان کے مطابق خیرات کا اس طرح کی اشتہار بازی پر ضائع کیا جانا مناسب نہیں ہے۔[31]

## عزتِ نفس کا تحفظ

بعض تنظیموں کا مقصد صرف دکھاوا کرنا ہوتا ہے۔ان کے اس عمل سے ان تنظیموں کا تاثر بھی خراب ہوتا ہے جو حقیقی معنوں میں فلاحی کام کر رہی ہوتی ہیں۔اس سے عام افراد کی عزتِ نفس کو بھی ٹھیس پہنچتی ہے کیونکہ بعض اوقات راشن کا ایک تھیلا دیتے وقت کئی تصاویر لی جاتی ہیں جو کہ اکثر میڈیا کی زینت بھی بنتی ہیں۔اور یوں سفید پوش افراد کی عزتِ نفس مجروح ہوتی ہے۔

## امداد کا عادی بنانا

تنظیموں کا فلاحی کام بعض شہروں میں اسقدر تسلسل کے ساتھ ہو رہا ہے کہ ایک عام آدمی اس امداد کا عادی بنتا جا رہا ہے۔ نتیجتاً محنت کی عادت ختم ہوتی جا رہی ہے۔مثال کے طور پر کراچی کے چوراہوں پر پابندی کے ساتھ تین وقت دستر خوان لگائے جاتے ہیں جن میں بہترین کھانا باعزت فراہم کیا جاتا ہے۔راشن کے ساتھ ساتھ یہ تنظیمیں علاج، تعلیم اور دیگر ضروریات زندگی بھی فراہم کر رہی ہیں۔ جس کا نہ صرف یہ نقصان ہوا کہ حکومت ان شعبوں میں اب کام نہیں کر رہی، بلکہ عوام نے بھی امداد کو اپنا حق سمجھ لیا ہے۔

## غیر ملکی تنظیموں کا کردار

پاکستان میں ایک طویل عرصے سے کئی غیر جانبدار غیر ملکی تنظیمیں فلاحی کاموں میں مصروف ہیں۔ پاکستان ہیومنیٹرین فورم[32] کے مطابق بین الاقوامی غیر سرکاری تنظیموں سے تقریباً تین کروڑ افراد

---

[31] بی بی سی اردو، رفاہی اداروں میں زکوۃ کی جنگ
https://www.bbc.com/urdu/pakistan/story/2003/11/printable/031125_zakat_war_jr

[32] Pakistan Humanitarian Forum (PHF). https://pakhumanitarianforum.org/

کو فائدہ پہنچتا ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے ۲۰۱۶ میں ۲۸ کروڑ ڈالرز ترقیاتی اور امدادی منصوبوں پر لگائے۔یہ تنظیمیں پانچ ہزار افراد کا ذریعۂ ملازمت بھی ہیں۔ان تنظیموں میں ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن (WHO)،یونیسیف(UNICEF) کے ساتھ کئی اور تنظیمیں شامل ہیں۔ان کے پاکستان سمیت دنیا بھر میں نیٹ ورکس قائم ہیں۔یہ پاکستان میں صحت، تعلیم اور دیگر انسانی حقوق بالخصوص بچوں اور عورتوں کے حقوق کے شعبے میں کام کر رہی ہیں۔

تاہم ان فلاحی کاموں کے ساتھ ساتھ کچھ تنظیموں کے دہشت گردی کی روک تھام اور ملکی سلامتی کے خلاف کام کرنے کے معاملات بھی سامنے آئے جس کی وجہ سے کئی تنظیموں خاص طور پر غیر ملکی این.جی.اوز پر پابندی لگائی گئی اور ان کو فوری طور پر پاکستان کو چھوڑنے کی ہدایات بھی جاری کی گئیں۔مزید یہ کہ اس شرط کے ساتھ ان غیر ملکی تنظیموں کو کام کرنے کی اجازت دی گئی کہ وہ اپنے آپ کو نئی ملکی پالیسی کے تحت رجسٹرڈ کروالیں۔یہ پالیسی یکم اکتوبر ۲۰۱۵ میں منظور اور نافذ کی گئی تھی۔[۳۳] اسی طرح کچھ تنظیموں کی وجہ سے عالمی سطح پر پاکستان کو بدنام کرنے کے معاملات بھی سامنے آئے۔جس کی وجہ سے انسانی خدمات کے نظریئے کو نقصان پہنچا۔[۳۴]

## تجاویز

یہاں ان اقدامات کو تجویز کیا گیا ہے جن کی مدد سے انسانی خدمات فراہم کرنے والے افراد اور تنظیموں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

---

[۳۳] شہزاد ملک،ہارون رشید،بی بی سی اردو،دسمبر ۲۰۱۷

https://www.bbc.com/urdu/pakistan-42351017
Government Of Pakistan MINISTRY OF INTERIOR and Narcotics Control https://ingo.interior.gov.pk/

[۳۴] شہزاد ملک بی بی سی اردو ڈاٹ کام اسلام آباد جولائی ۲۰۱۵

https://www.bbc.com/urdu/pakistan/2015/07/150709_nisar_ngos_as

شہزاد ملک بی بی سی اردو ڈاٹ کام اسلام آباد جون ۲۰۱۵

https://www.bbc.com/urdu/pakistan/2015/06/150612_nisar_ngo_policy_zz

بڑی تنظیموں کو کوشش کرنی چاہیے کہ ملک میں ایک ایسانیٹ ورک بن سکے جس میں فلاحی تنظیمیں باہم تعاون کر سکیں تاکہ زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کیے جاسکیں۔اس طرح یہ تنظیمیں ایک دوسرے کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مزید آگے بڑھیں گی۔

مقامی تنظیموں کی رجسٹریشن کے لئے ملک میں ایک ہی قانون ہونا چاہیے تاکہ ایک ہی سسٹم کے تحت ان تنظیموں کے معاملات کو دیکھا جاسکے۔مقامی اور غیر مقامی تمام فلاحی تنظیموں کو نہ صرف حکومت رجسٹر کرے، بلکہ ان کے تمام معاملات کو دیکھنے کے لئے ایک ایسا غیر جانب دار ادارہ بھی بنائے جو نہ صرف ان تنظیموں کی فہرست مرتب کرے بلکہ ان کے منصوبوں کی فہرست بھی بنائے۔مزید یہ کہ ان تنظیموں کو ایسے علاقوں کی معلومات مہیا کرے جہاں ان پروجیکٹس کی اشد ضرورت ہو۔

ایسی انسانی امداد کو فوقیت دینی چاہیے جس سے مستحقین میں خود کفالت کا جذبہ پیدا ہو۔یعنی فلاحی تنظیمیں مچھلی کھلانے کی بجائے مچھلی پکڑنا سکھائیں۔ایسے پروجیکٹس کو ترجیح دی جانی چاہیے جن سے روزگار کے مواقع پیدا ہوں۔اسی طرح پڑوسیوں اور رشتہ داروں کی خیر خواہی کے جذبے کو بڑھایا جائے اور سنت پر عمل کرتے ہوئے پڑوسیوں کی خبر گیری کی جائے۔نیز بیماری، مصیبت اور تکلیف کے وقت ان کے کام آیا جائے۔

انفرادی امداد کا ایک بڑا حصہ پیشہ ور بھکاریوں کو چلا جاتا ہے۔لہٰذا جہاں گداگری کی حوصلہ شکنی،اس پیشے سے وابستہ افراد کی بحالی اور قومی دھارے میں شرکت کے لیے اقدامات ضروری ہیں، وہاں عوام میں یہ شعور پیدا کرنا بھی اہم ہے کہ وہ اپنے صدقات وخیرات کو ضرورت مند افراد تک پہنچانے کا اہتمام کریں یا ایسے منصوبوں میں شامل کریں جو دیرپا اثرات کے حامل ہوں۔

ورلڈ بینک،اسلامک ریسرچ اور ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ اور اسلامک ڈویلپمنٹ بینک (آئی ڈی بی) کی ایک تحقیق کے مطابق عالمی زکوۃ فنڈز ۵۵۰ بلین سے ۶۰۰ بلین ڈالر سالانہ تک پہنچ گئے

ہیں۔[35] دنیا کے ۴۷ مسلم اکثریتی ممالک میں سے زیادہ تر میں زکوٰۃ دینا لازمی نہیں ہے لیکن پاکستان ان چھ ممالک میں سے ہے جہاں زکوٰۃ کے لیے ایک قانون موجود ہے اور حکومت اسے جمع کرتی ہے۔ پاکستان میں زکوٰۃ اور عُشر کا قانون صدر جنرل ضیاءالحق کے دور میں ۱۹۸۰ میں اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کی روشنی میں نافذ کیا گیا۔[36] اس قانون کے تحت فیڈرل زکوٰۃ کونسل اس قانون پر عملدرآمد کی نگران تھی جس کی سربراہی وفاقی سطح پر سپریم کورٹ کا جج جبکہ صوبائی سطح پر ہائی کورٹ کا جج کرتا تھا۔ بنیادی سطح پر بالغ مسلمان، اساتذہ اور علماء ایک مسجد میں بیٹھ کر زکوٰۃ کونسل کے چیئرمین اور دیگر اراکین کو منتخب کرتے تھے۔ ۱۹۸۳ میں شائع شدہ گزٹ کے مطابق ملک بھر میں ۳۲ ہزار زکوٰۃ کمیٹیاں قائم کی گئی تھیں۔ زکوٰۃ کے مستحق افراد کے ناموں کی فہرست زکوۃ کونسل تیار کرتی تھی جبکہ زکوۃ کونسل کے اراکین پر مجموعی زکوٰۃ کا دو سے دس فیصد، اخراجات کی مد میں خرچ کیا جاتا تھا۔

زکوٰۃ کا یہ نظام تقریباً ۳۰ سال تک ملک میں رائج رہا اور پھر ۲۰۱۰ میں ۱۸ ویں آئینی ترمیم کے بعد یہ معاملہ صوبوں کو چلا گیا اور یہ وفاقی قانون ختم کر دیا گیا۔ (اس ضمن میں اب صوبائی قانونی سازی کی جا سکتی ہے جیسا کہ سندھ میں ۲۰۱۰ میں زکوۃ کا قانون منظور کیا گیا۔[37]) اگرچہ زکوٰۃ کی رقم جو بینکوں سے کاٹی جاتی ہے وہ رقم فیڈرل زکوٰۃ کونسل کے اکاؤنٹ میں ہی جاتی ہے تاہم وہاں سے یہ رقم آبادی کے تناسب سے صوبوں میں تقسیم کر دی جاتی ہے، یعنی زکوٰۃ فنڈز میں جو رقم اکھٹی ہوتی ہے اس میں ۹۳ فیصد حصہ صوبوں کو چلا جاتا ہے جبکہ ۷ فیصد وفاق کے پاس رہتا ہے۔ جس میں صوبہ پنجاب کو ۵۷ فیصد، سندھ کو ۲۴ فیصد، صوبہ خیبر پختونخوا کو ۱۴ فیصد اور بلوچستان کو زکوٰۃ فنڈز

---

[35] Nicky aulia Widadio, world zakat forum, 2019 https://www.aa.com.tr/en/middle-east/world-zakat-forum-optimizing-funds-to-reduce-poverty/1640107

[36] Zakat and Ushr Ordinance 1980 https://zakat.punjab.gov.pk/system/files/zakatushr1980.pdf

[37] The Sindh Zakat and Ushr Ordinance 2010, http://sindhlaws.gov.pk/setup/publications_SindhCode/PUB-16-000226.pdf

میں سے ۵ فیصد حصہ دیا جاتا ہے۔ وفاق کے ۷ فیصد حصے میں اسلام آباد کے لیے ۳۵ فیصد، سابقہ فاٹا کے لیے ۴۶ فیصد اور گلگت بلتستان کے لیے ۱۹ فیصد مقرر کیا گیا ہے۔ ۱۸ ویں ترمیم کے بعد اب زکوٰۃ کو جمع کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ حکومت کی جانب سے زکوٰۃ کے نصاب کے اعلان کے بعد بینکوں میں سیونگ اکاؤنٹس میں جمع کروائی گئی رقم سے اڑھائی فیصد کے حساب سے زکوٰۃ کی رقم کو منہا کیا جاتا ہے۔

ضرورت یہ ہے کہ زکوٰۃ فنڈ اور بیت المال میں شفافیت کو یقینی بنا کر عوامی اعتماد بحال کیا جائے۔ زکوۃ اور بیت المال کے فنڈز میں کرپشن کرنے والوں کے لئے نئے سخت قوانین بنائے جائیں۔ تمام مکاتبِ فکر اور ماہرین کی مشاورت سے زکوٰۃ، عشر و صدقات کے لیے ایسا نظام وضع کیا جائے جو قابلِ اعتماد بھی ہو اور مؤثر بھی۔ زکوۃ کی وہ تمام رقم جو وفاقی اور صوبائی سطح پر ابھی تک استعمال نہیں ہوئی، اس کو فوری استعمال میں لایا جائے۔

# آراء و سوالات

**سوال:** مختلف تنظیموں کی باہم معاونت کی بات کی جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسلامی رفاہی تنظیمیں اسلام کے عطا کردہ اصولوں کے مطابق خدمت کر رہی ہیں تو کیا سیکولر لوگ ان اسلامی تعلیمات کی وقعت و اہمیت کو قبول کرتے ہیں؟ یہاں تک کہ لامذہبیت کے اپنے فلسفے کی بنیاد پر کیا وہ لفظ ''اسلام'' تک کو تسلیم کرتے ہیں؟ عام طور پر تو شعائرِ اسلام کی بات پر ان کا رُخ بدلتا نظر آتا ہے۔ کیا ایسا تو نہیں کہ اشتراکِ عمل کی ہر صورت میں مسلم تنظیموں کو ہی اپنا طرزِ عمل بدلنا پڑتا ہو؟

**جواب از اقصیٰ تصغیر:** اسلام کی جانب سے دیا گیا انسانی خدمت کا بنیادی اصول ''**تعاونوا علی البر**'' ہے۔ مسلمانوں کو اسی کے مطابق اپنی زندگی گزارنی ہوگی جبکہ سیکولر ریاستوں کے اپنے اصول ہو سکتے ہیں۔ ہر کوئی اپنے مذہب کے اندر رہ کر کام کرتا ہے اور کر رہا ہے۔ مل جل کر خدمت کرنے کے لیے دوسرے کے مذہب کو قبول کرنا ضروری نہیں ہے۔ جو لوگ اس میدان میں موجود ہیں ان کے تجربات و مشاہدات بتاتے ہیں کہ نظریہ و سوچ کے اختلاف کے باوجود ضرورت مند انسانیت کی خدمت کی بنیادی قدر کی بنیاد پر تعاون کیا جا سکتا ہے۔

**سوال:** کیا یہ کافی ہے کہ ضرورت مند افراد کی فوری ضرورت پوری کر دی جائے۔ کیا رفاہی تنظیمات کو اپنا دائرۂ عمل وسیع کر کے مؤثر قوانین کے نفاذ کی کوشش نہیں کرنی چاہیے؟

**جواب از راحیلہ خان:** قوتِ نافذہ افراد یا تنظیموں کے پاس نہیں ہوتی بلکہ انتظامیہ کے پاس ہوتی ہے۔انتظامیہ قوانین نافذ کرتی ہے اور افراد اور تنظیمیں ان قوانین کی پابندی کر کے اپنا فرض پورا کر سکتے ہیں۔یہ درست ہے کہ اپنے تجربات کی روشنی میں مختلف طبقات کی طرح یہ تنظیمیں بھی زیادہ مؤثر قوانین کے لیے اپنی آراء دے سکتی ہیں تاہم اگر وہ اس محاذ پر بھی سر گرم ہوں گی تو انسانوں کی فوری ضروریات سے ان کی توجہ یقیناً ہٹ جائے گی۔ مناسب یہ ہو گا کہ معاشرہ اور حکومتیں اس حوالے سے بھی انسان دوست تنظیموں کی پُشت پر کھڑی ہوں اور بہتر قانون سازی کے ذریعے انسانوں کی مشکلات کم کرنے کی مسلسل کوشش جاری رہے۔

# صدارتی کلمات

## کنور وسیم*

انسان فطری طور پر ایک سماجی اور روحانی مخلوق ہے جو اپنی پرورش کے لیے دوسرے انسانوں کا محتاج ہے۔ جب افراد باہم کام کرتے ہیں تو کچھ لوگ زیادہ پھل پاتے ہیں، کچھ کم اور بعض بالکل محروم رہ جاتے ہیں۔ ان محروم افراد کے لیے جب گزر بسر مشکل ہو جاتی ہے تو اسلام اہلِ ثروت کو حکم دیتا ہے کہ ضرورت مندوں کی مدد کریں۔ اسلام کے تصورِ جزا و سزا سے اس حکم کو تقویت بخشی گئی ہے۔ حقوق العباد کی ادائیگی انتہائی ضروری ہے تاکہ معاشرہ برابری سے چل سکے۔ تمام افراد پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ غریبوں، مسکینوں اور لاچاروں کی مدد کریں۔ اس مدد کو منظم طریقے سے کرنے کے لیے دنیا بھر میں ہر سطح پر انسان دوست تنظیمیں بنائی گئی ہیں۔

آج سے چودہ سو سال قبل خطبہ حجۃ الوداع میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انسانی حقوق کا جو چارٹر پیش کیا تھا وہ ہمارے لیے ایک رہنما اصول تو ہے ہی لیکن ہمارے عمل کے لیے ایک کسوٹی بھی ہے۔ آئی سی آر سی طویل عرصے سے اپنے اصولوں پر کاربند رہ کر انسانی خدمت کا وسیع کام کر رہی ہے۔ اس کے وضع کردہ سات بنیادی اصول پوری دنیا میں قائم قومی انجمنوں کے لیے معیار اور رہنمائی کی بنیاد ہیں اور یہ تمام انجمنیں انسان دوست عالمی تحریک کا حصہ ہیں۔ تاہم انسان دوستی کی اس عالمگیر روِش کے باوجود مختلف النوع رفاہی تنظیموں کے مابین اتحاد کا نہ ہونا ایک المیہ بھی ہے۔

---

* صوبائی سیکرٹری، انجمن ہلالِ احمر سندھ

اس کے باوجود جو لوگ اس راہ پر گامزن ہیں انہیں ہر حال میں انسانیت کی ہر ممکن خدمت میں لگے رہنا چاہیے۔ مؤذن تو یہ سوچے بغیر وقتِ مقرر پر مسلسل اذان دیتا رہتا ہے کہ نماز کے لیے دو افراد آئیں گے یا دو سو۔ اسی طرز پر ہم نے انسانیت کی خدمت کرنی ہے۔

فیض احمد فیض نے کیا خوب کہا ہے:

یوں ہی ہمیشہ الجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ ان کی رسم نئی ہے، نہ اپنی رِیت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے، نہ اپنی جیت نئی

یہ خدمت کا تسلسل یونہی چلتے رہنا چاہیے۔ قانونِ فطرت ہے کہ پُر خلوص نیکی لوٹ کر اپنے ٹھکانے پر ضرور آتی ہے۔

# مذہب، انسانی خدمات اور انسان دوست تنظیمیں

# مذہب، انسانی خدمات اور انسان دوست تنظیمیں

عمیر حسن، محمد عبدالشکور، ڈاکٹر شاہدہ نعمانی، پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد

کسی قوم یا گروہ کے پاس نظری تعلیمات کا ذخیرہ کتنا ہی وافر کیوں نہ ہو اور ان کی اصولی بنیاد کتنی ہی پختہ کیوں نہ ہو، اصل اہمیت اس بات کی ہوتی ہے کہ ان تعلیمات و اصولوں کو یہ قوم یا گروہ کس حد تک عمل میں لا سکے ہیں۔ بطور ایک نظامِ زندگی اسلام کی تعلیمات ہمہ گیر اور مؤثر ہیں اور متعدد افراد، ادارے اور تنظیمیں ان اصولوں کو اپنے لیے رہنما قرار دے کر انسانی خدمت کے میدان میں موجود ہیں، تاہم ایسے عالمی ماحول میں جہاں زندگی کا غالب نظریہ دین و دنیا کی علیحدگی ہو اور نظریہ و عقیدہ کو زندگی کے بیشتر دائروں سے بے دخل کر دیا گیا ہو، وہاں ایک واضح نظری بنیاد پر کام کرنے میں متعدد سوالات اور مسائل بھی درپیش ہوتے ہیں اگرچہ اس کے ساتھ بیشتر صورتوں میں نظریہ کی جامعیت اور اُمت کا جذبۂ اخوّت ان تنظیموں کے لیے بے حد مددگار بھی ہوتا ہے۔

اسلام کے نظریۂ خدمت کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کر لینے کے بعد یہ جاننا ضروری ہے کہ اسلام کی بنیاد پر استوار رفاہی تنظیمیں کس انداز میں کام کر پا رہی ہیں؟ ان کی سوچ اور کام کا انداز دیگر تنظیموں سے کس قدر مختلف ہے؟ غیر مسلم اور لادین معاشروں اور اداروں کے ساتھ تعاون کی کیا صورتیں اپنائی جاتی ہیں اور یہ تنظیمیں اپنی سرگرمیوں میں کس حد تک غیر جانبدار رہ پاتی ہیں؟ مندرجہ ذیل مکالمہ اسی پس منظر میں پیش کیا جا رہا ہے۔

## عمیر حسن*

اسلامک ریلیف ۱۹۸۴ میں برطانیہ میں قائم ہوئی اور ۱۹۹۲ سے پاکستان میں سر گرمِ عمل ہے۔ میں پچھلے ۲۱ سال سے انسانی خدمت سے باقاعدہ طور پر اور کُل وقتی کارکن کے طور پر منسلک ہوں اور لگ بھگ چودہ پندرہ ممالک میں خدمات سر انجام دے چکا ہوں۔ اسلامک ریلیف کے ساتھ گزشتہ ۳سال سے میں کنٹری ڈائریکٹر کے طور پر کام کر رہا ہوں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مذہب کو ہمیشہ سے جانبدار تصور کیا جاتا ہے اور مذہب سے وابستہ ہر شخص اپنے مذہب کے معاملے میں ایسا ہی ہے۔ اس سب کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دنیا بھر میں اس وقت جو نظام رائج ہے اس کی تشکیل میں مذہب بطور حوالہ موجود نہیں ہے۔ محض یہ کہہ دینا خود فریبی اور خوش فہمی ہے کہ سیکولر ریاستوں نے جو چارٹر ترتیب دیا ہے وہ بنیادی طور پر ہمارا ہے اور مغرب نے دراصل حضرت عمرؓ کے قائم کردہ اصول لاگو کر لیے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانیت و انسانی خدمت کے یہ تمام یا ان میں سے بیشتر اصول قبل از اسلام دیگر مذاہب میں بھی موجود تھے۔ یہ درست ہے کہ اسلام نے انہیں وضاحت و صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ تاہم یہ بھی ماننا چاہیے کہ ان کے عملی اظہار کے وقت فرقہ وارانہ تفریق ان تمام اصولوں کو پامال کر دیتی ہے۔ ایسی صورتوں میں عدل اور اعتدال پر قائم رہنے کے لیے مذہب سے لاتعلق اداروں نے ایسے اصول وضع کیے ہیں جن پر وہ عمل کر سکیں۔ انہوں نے آپ کے اصولوں کو بنیاد بنا کر اس پر اعلیٰ ترین معیارات قائم کیے اور عملاً درخشاں مسلم روایات کے وارثوں کو اس میدان سے باہر کر دیا ہے۔ اب چونکہ ہم میں سے بیشتر نے ان اداروں اور ان کی فکر سے کسی طرح کا تعلق نہ رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو ہماری اپنی ہی ایک انجمن ہے جس میں ستائشِ باہمی کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ ہمیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس میدان میں دیگر ادارے اور افراد کس قدر ترقی کر چکے ہیں۔

* قومی سربراہ، اسلامک ریلیف، پاکستان

اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ آئی سی آر سی کے سات بنیادی اصولوں سے کتنے لوگ واقف ہیں۔ بے شک یہ اسلامی اقدار اور اصولوں سے ہم آہنگ ہیں اور ہم اپنے نقطۂ نظر سے انہیں دیکھیں تو ہم ان کی بنیاد اسلامی تعلیمات میں پاتے ہیں مگر سیکولر لوگ اس کو سمجھنے میں ترقی کر گئے ہیں۔ اس سلسلے میں پہلے پہل تو بحث میں مذہب شامل نہیں تھا مگر گزشتہ کچھ عرصے سے مذہب پر مبنی اداروں نے اپنے اپنے مذہب کے مطابق خود کو الگ کر لیا ہے۔ ان کا احساس ہے کہ غیر مذہبی بنیادوں پر استوار اصولوں اور نظام ہائے عمل نے ہمیں ہمارے ہی ورثے سے محروم کر دیا ہے۔ اس کمی اور محرومی کا احساس کرتے ہوئے تمام مذاہب نے رفتہ رفتہ اس جانب پیش رفت شروع کی ہے لیکن اس سلسلے میں ایک بڑا خلا اب بھی موجود ہے۔

ہم یہاں یا اپنے اپنے مقامات پر بیٹھ کر اقوام متحدہ اور عالمی انتظام سے متعلق چاہے کتنی ہی وقیع گفتگو کر لیں، یہ آواز ان تک نہیں جائے گی۔ اہم یہ ہے کہ باہم تعاون اور حکمت سے ایسی صلاحیت حاصل کی جائے جس کے نتیجے میں آپ ان عالمی اداروں کی رائے سازی اور فیصلہ سازی میں حصہ لے سکیں، وہاں جا کر بحث کریں، اپنا نقطۂ نظر پیش کریں، اور دنیا کو بہتر متبادل سے روشناس کروائیں۔ اس مقصد کے لیے عمومی اصول طے کریں اور اپنے ہاں انسانی خدمات کے مختلف پہلوؤں پر باقاعدہ کمیٹیاں ترتیب دیں جو عالمی اداروں کی متعلقہ کمیٹیوں میں رسائی حاصل کریں۔ آپ کے علم میں ہونا چاہیے کہ آئی سی آر سی اور اقوامِ متحدہ کے تحت مختلف اداروں سمیت عالمی سطح پر تمام مذاہب کے حوالے سے بحث ہوتی ہے۔ یہ مکالمہ اب بھی جاری ہے۔ ہمیں اپنی آواز وہاں تک پہنچانے کی فکر کرنی چاہیے۔

مذہب سے متعلق منفی پروپیگنڈا کو ختم کرنے کے لیے انسانی خدمت سے بڑھ کر کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ چاہے ہمیں کوئی قبول کرے یا نہ کرے، انسانی خدمت کا کام کرتے رہنا چاہیے اور یہ حضور اکرم ﷺ کی سنت سے صاف ظاہر ہے۔ اس سلسلے میں آگے بڑھنا خاصا دشوار ہے۔ میں علمی سطح پر کی گئی بحث سے متفق ہوں مگر یہ کسی حد تک دھندلی تصویر ہے۔ خود کو محض اس بات پر

شاباش دیتے رہنا کہ ہم مذہبِ اسلام پر پیدا ہوئے ہیں، کسی طور درست نہیں۔ بلکہ اس پہلو پر بات کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم کس حد تک اس پر قائم ہیں۔

جو افراد یا تنظیمات آپ کے مذہب سے متعلق منفی تاثرات کو ختم کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں ان کی مدد کرنا آپ کی ذمہ داری ہے۔ انہیں یہ کہتے ہوئے ردّ کر دینا کہ یہ ہمارے خلاف سازش ہے، کسی طور درست نہیں۔ بلکہ درست یہ ہے کہ مذہب کے تصورِ غیر جانبداری کو دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔

## محمد عبد الشکور*

میں عمیر حسن صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ماضی کی بھول بھلیوں کا ذکر کر کے وقت نہیں گزارا بلکہ نہایت اہم موضوعات پر بات کی ہے۔ میری گفتگو کا عنوان Faith based organizations ہے۔ اس کا بہتر ترجمہ ''عقیدے کی بنیاد پر تنظیمیں'' ہی ہو گا۔ میری گفتگو کا مقصد الخدمت فاؤنڈیشن کا تعارف نہیں ہے۔ ہمارے کام کا دارو مدار اسی پر ہے جس کا ذکر ہماری گفتگو میں ہوتا ہے اور جس کی خوبصورت جھلک ہمیں سیرت سے ملتی ہے۔ یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ خدمت کے کام میں آگے بڑھتے ہوئے مذہب، رنگ اور نسل کی پرواہ نہ کی جائے اور اس سے قطع نظر تمام لوگوں سے محبت و ہمدردی کا سلوک روا رکھا جائے۔ یونہی معاشرہ ایک خوبصورت پھلواری کی صورت اختیار کرے گا ورنہ یہ وہی دھواں دھواں تصور کہلائے گا جس میں کسی کو معلوم نہ ہو کہ کیا ہو رہا ہے۔

کورونا کی وبا کے دوران بہت شعوری طور پر الخدمت سمیت بہت سی تنظیموں نے تمام امتیازات سے بالا ہو کر خدمت کا کام سر انجام دینے کی کوشش کی ہے۔ اس کی ایک مثال جراثیم کُش سپرے کی ہے۔ سپرے کرتے وقت مسجد و مندر کی تفریق سے بالاتر ہو کر کام کیا گیا۔ اسی

* صدر، الخدمت فاؤنڈیشن، پاکستان

دوران ہمیں پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ خواجہ سراؤں کی حالت ویسی نہیں ہے جیسی ہمیں نظر آتی ہے۔ بلکہ جب ان کے گھروں کی تنگی اور ان کی مشکلات کا جائزہ لیا تو دل دہل گیا۔

میں اکثر کہتا ہوں کہ مذہب، جنس اور ذات کی بنیاد پر پسماندہ رہ جانے والے افراد اگر یہ کہیں کہ ہم پاکستان میں اپنے پڑوسیوں کے ہمراہ خوش ہیں اور اسی سرزمین میں رہنا چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے۔ لیکن اگر ہم یہ مقصد حاصل نہیں کر پاتے تو یہ کہنا درست ہو گا کہ ہمارے ہاں اسلامی تعلیمات محض فلسفہ ہیں۔ وہ تمام افراد جو انسانی بنیادوں پر خدمت کا کام سرانجام دے رہے ہیں، ان کے لیے ضروری ہے کہ ان کا تاثر اسلام کی تعلیمات کے عملی علمبرداروں کا ہو۔ بہت سے مقامات پر مخاطب آپ سے اجنبیت محسوس کرتا ہے اور کھل کر بات نہیں کرتا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ آپ کا ان سے تعلق روٹی پانی سے بڑھ کر محبت و حسنِ سلوک پر استوار ہو۔

میرا موضوع یہ ہے کہ مختلف ادارے کس طرح باہم مل کر آگے بڑھ سکتے ہیں۔ پاکستان میں اس کے لیے ہم کوشاں ہیں اور مختلف میدانوں میں کام کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کو چاہیے کہ ان کی مدد کریں، ان کے ساتھ تعاون کریں، ان کی تعلیمات اور کام دیکھیں اور اس پر بحث کریں۔ ملکی سطح کے علاوہ بین الاقوامی سطح پر بھی اس پر ہم نے کام کیا ہے اور مختلف ممالک اور مذاہب و نظریات کے ساتھ انسانیت کی بنیاد پر ہم آہنگی پیدا کی ہے۔ میں اسلامک ریلیف کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے عالمی سطح پر پاکستان کا ایک اچھا تاثر قائم کیا اور بہت سے اہم معاملات پر بحث کی۔

میں پاکستان کو خوش قسمت تصور کرتا ہوں کہ یہاں گزشتہ تین یا چار دہائیوں کے دوران کئی ایسی تنظیمات تشکیل دی گئی ہیں جن کے فعال اور مؤثر کردار کی وجہ سے ہم پر سے وہ خطرہ ٹل گیا ہے، جس کا سامنا صومالیہ اور ایتھوپیا میں مسلمانوں کو کرنا پڑا۔ یہاں کام اچھا ہو رہا ہے مگر اس پر بہت محنت کی ضرورت ہے۔ اس کانفرنس کی شکل میں ہونے والا یہ علمی کام بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس پر مسلسل سیمینارز ہوتے رہنے چاہییں۔ این جی اوز کو اکٹھا کر کے مل کر اس کام کو آگے

بڑھانا چاہیے۔ ہمیں اپنی کارکردگی کے میدان میں آگے بڑھنے کی بہت ضرورت ہے۔ ایمانیات کی بنیاد پر ترکی اور دیگر کئی ممالک میں فورم بنائے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں امکانات بہت اچھے ہیں لیکن صلاحیتوں کی کمی ہے۔ نیز باہم عدم تعارف کی وجہ سے پیدا شدہ خلا بہت زیادہ ہے۔ بہت سی خامیاں موجود ہیں مگر مجھے یقین ہے کہ مسلم دنیا کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ایمانیات کی بنیاد پر انسانی خدمت میں بہت ترقی ہو رہی ہے۔ البتہ مشرق وسطیٰ کے وہ ممالک جن میں پابندی لاگو کی گئی ہے، ان میں خاصی محنت کی ضرورت ہے۔

پاکستان میں دینی مدارس کا نظام بہت وسیع ہے۔ یہ درست ہے کہ مجموعی طور پر یہ سب سے بڑی این جی او ہے مگر ان کے کام کرنے کے ہتھیار پرانے ہیں جن میں جدت لانے کی ضرورت ہے۔ وہ اپنے ہی محور میں رہتے ہوئے کام کرتے ہیں تو ان کا وہ امیج نہیں بن پا رہا۔ باوجود اس کے کہ یہ پسماندہ طبقات کے کئی ملین بچوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کر رہے ہیں۔

ان سارے خطرات و مواقع کے لحاظ سے میں ایک بات کہہ کر اجازت چاہوں گا کہ لیڈر شپ، چاہے کسی این جی او کی ہو، سیاسی جماعت کی ہو یا حکومت کی، اگر وہ خطرات میں سے مواقع نہیں ڈھونڈتی اور اس کی بنیاد پر چیلنجز قبول نہیں کرتی تو یہ سراسر میدان کو چھوڑ کر بھاگنے والی بات ہے۔ میں رسول اللہ ؐ کی سیرت سے مشکل ماحول کو بھی آگے بڑھنے کے مواقع میں بدلنے کا واقعہ بیان کرتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ غزوۂ بدر مسلمانوں کے لیے پہلا بڑا امتحان تھا، جس سے متعلق طبعی طور پر کئی خدشات بھی موجود تھے۔ جنگ میں فتح یاب ہونے کے موقع پر کئی کفار قیدی بن کر آئے تھے۔ ان سے ان کی زمین، ان کی جائیداد کو تاوان کی صورت میں وصول کیا جا سکتا تھا مگر حضور اکرم ﷺ نے دیکھا کہ بہت سے قیدی پڑھے لکھے ہیں اور مسلمانوں میں سے کئی لوگ ہیں جن کے پاس علم کی دولت نہیں ہے۔ کیا خوبصورت معاہدہ کیا کہ جو پڑھے لکھے لوگ ہیں وہ اگر ہمارے اتنے لوگوں کو تعلیم دے دیں تو ان کو رہا کر دیا جائے گا۔ یہ آگ کے شعلوں کے اندر سے علم کا دیا جلانے کا ایک سلسلہ تھا۔ اس سے ہماری این جی اوز کو سبق ملتا ہے کہ اگرچہ مشکلات

بہت ہیں مگر ان ہی میں سے راستہ بنا کر ہم نے آگے بڑھنا ہے۔ ورنہ یقین رکھیں کہ بازی کوئی اور لے جائے گا۔

نہ تھا اگر تو شریکِ محفل، قصور میرا ہے یا کہ تیرا؟

مرا طریقہ نہیں کہ رکھ لوں کسی کی خاطر مئے شبانہ

## ڈاکٹر شاہدہ نعمانی*

سب سے پہلے میں آئی پی ایس اور آئی سی آر سی کو اس اہم کانفرنس کے انعقاد پر مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ اس طرح کی بہت سی کانفرنسز ہوتی ہیں، ہم آتے ہیں، جمع ہوتے ہیں، سیکھتے سکھاتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ جبکہ ہمیں چاہیے کہ ہم ایسے مواقع کو مفید بنائیں۔ ہم اپنے حصے کا انقلاب لانے کا آغاز کر دیں تو اچھائی کی طرف بآسانی بڑھ سکیں گے۔

میرا تعلق شعور ویلفیئر فاؤنڈیشن سے ہے اور میرا پی ایچ ڈی کا موضوع عالمی مذاہب میں پیشہ وارانہ سماجی بہبود کا تصور اور عصرِ حاضر میں اس کا اطلاق ہے۔ میرا ماننا ہے کہ الہامی و غیر الہامی تمام مذاہب خیر بانٹنے کے لیے آئے اگرچہ وقت کے ساتھ ان میں تحریف کر دی گئی۔ انسانی خدمت کی ضرورت ہر دور میں رہی ہے اور اس دور میں بھی ناگزیر ہے۔

یہ سمجھنا ضروری ہے کہ انسانی خدمت کو اسلامی تناظر میں کیونکر کیا جا سکتا ہے؟ اللہ کریم نے ہمیں ان لوگوں کی ذمہ داری سونپی ہے جو مفلوک الحال ہیں۔ جن کے حالات کو سن کر ہی نہیں بلکہ دیکھ کر اور محسوس کر کے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ جو لوگ عام گلی محلے کی سطح پر انسانیت کا مشاہدہ کرتے ہیں وہ اس کرب سے آگاہ ہیں۔

بہت سے لوگ شاید یہ نہ جانتے ہوں کہ ہمارے اِرد گرد کئی خاندان ایسے ہیں جو پانی میں مرچیں گھول کر روٹی سے کھاتے ہیں۔ مزدور بچے، جو کچرا چنتے ہیں وہ بنیادی ضروریاتِ زندگی سے

---

* صدر، شعور ویلفیئر فاؤنڈیشن، پاکستان

ہی محروم ہیں۔ کتنے ہی معصوم انتہائی سردی میں جانوروں سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ غربت خود ایک آزار ہے مگر غربت کے ساتھ جب بیماری مل جاتی ہے تو الامان والحفیظ۔ جہالت، غربت، بے روزگاری، طبقاتی تقسیم، جیلوں کے حالات اور دیگر کئی مسائل ہمارے لیے کسی چیلنج سے کم نہیں۔ یعنی ایک بہت بڑا انحطاط ہے جسے ہم نے ختم کرنا ہے۔

انسانی خدمت کی راہ میں حائل رکاوٹوں میں پہلا نکتہ عوام میں دین کا انتہائی محدود تصور ہے۔ بعض اوقات تو مجھے لگتا ہے کہ مذہبی لوگ بھی اقلیت ہی ہیں۔ وہ معاشرے میں پوری طرح ضم نہیں ہو رہے۔ ہم اسلام کے فلاحی نظام کو معاشرتی سطح پر نافذ نہیں کر پا رہے۔ اس کا حل شعور کی بیداری اور قوتِ نافذہ کے ذریعے اس پر عمل ہے۔ میں نے اپنے ادارے کا نام 'شعور' رکھا ہے کیونکہ مجھے تمام مسائل کا حل بیداریٔ شعور میں نظر آتا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ دین کے ہمہ جہت تصور کو عوام تک پہنچائیں۔ اس سلسلے میں ہم میں جو کمی رہ گئی اس کا نقصان یہ ہوا کہ بعض لوگ اس کمزوری کو اپنے لیے موقع بنا رہے ہیں۔

اسلام ریاست و معیشت کا ایک کامل نظام فراہم کرتا ہے۔ میری نظر میں ثقافت، مذہب کا حصہ ہے اور مذہب بھی ثقافت کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔ جب ہم اپنے مذہب و ثقافت سے ہٹ کر چلتے ہیں تو ناکام ہو جاتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں اعلیٰ اقدار میں روز بروز کمی دیکھنے میں آ رہی ہے۔ یہ درست ہے کہ پاکستانی معاشرت میں صدقات و تعاون کے جذبے نے بہت سے نادار لوگوں کو سہارا دیا ہے لیکن یہ بھی درست ہے کہ یہ نادار لوگ اسی معاشرے کے بعض افراد کی بے حسی اور بے ایمانی کی پیداوار ہیں۔ یہی ہمارے زوال کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ ہم جب تک اپنی قوم کو ایمان نہیں سکھائیں گے، مسائل کو حل نہیں کر پائیں گے۔

اس کے علاوہ حقیقی مسائل کا ادراک نہ ہونا بھی ایک سنگین مسئلہ ہے۔ اپنے معاشرے کے مسائل کو جب مغربی نگاہ سے دیکھا جائے تو ان کا حل نظر نہیں آتا۔ لہٰذا انہیں اپنے مذہب و ثقافت ہی کی روشنی میں حل کرنا چاہیے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی خاندانی نظام کی خرابی ہے۔ ماضی میں

ہمارے بہت سے مسائل خاندان میں رہ کر ہی حل ہو جاتے تھے۔ ہمیں ادارے بنانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔اب حال یہ ہے کہ غربت کی وجہ سے اولاد اپنے ماں باپ کو بوجھ سمجھتی ہے۔اپنی نوجوان نسل میں اس بات کی آگاہی پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ بہت سے مسائل کا حل ادارے نہیں بلکہ منظم خاندانی نظام ہے۔

اس کے علاوہ کفالت سے خود کفالتی تک کا سفر طے کرنا بہت ضروری ہے۔ ہم نے ایک خود مختار معاشرہ تشکیل دینا ہے،مادیت کی بجائے احساس کو جگانا ہے اور اسلامی نظام ترتیب دینا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم ایک اچھے انسان بن کر انسانیت کی خدمت کریں۔

# صدارتی کلمات

## پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد*

اسلام کا ایک بنیادی اصول اور تعلیم زکوٰۃ ہے اور اس کا اہتمام فرد، ادارے اور حکومت تینوں پر فرض ہے۔ زکوٰۃ کا نظام قائم کرنے کی ذمہ داری قرآنِ حکیم میں واضح طور پر حکومت پر عائد کی گئی ہے،[1] اور اس کے لیے عاملین کے تقرر کا نظام بتایا گیا ہے۔[2] پھر حکومت ہی کے بیت المال میں آمدن میں دیگر ذرائع بھی ہیں۔ اس لحاظ سے رفاہی نوعیت کے کسی بھی کام میں تفریق نہیں کی جاسکتی۔ گویا اگر معاشرے میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو اپنی ضروریات کے لیے امداد کے محتاج ہیں تو افراد، معاشرہ اور حکومت، تینوں کا یہ فرض ہے کہ ان کی خبر گیری بھی کریں اور ممکن حد تک ان کی تکلیف کا ازالہ بھی کریں۔ اگر ایسا نہیں ہوگا تو اللہ کے ہاں جوابدہی سے یہ خود کو بچا نہیں سکیں گے۔ تاہم یہ بہت ضروری ہے کہ دین کے جامع تصور کو سمجھا جائے اور ہر عمل کو اس کسوٹی پر پرکھنا چاہیے کہ کیا اس کا مقصود اللہ کی رضا کا حصول ہے یا اس کے مقاصد کچھ اور ہیں۔

یہاں مختلف مباحث کے دوران رسمی یا غیر رسمی طور پر یہ تاثر پیدا ہوا کہ شاید کچھ لوگوں کے نزدیک امدادی سرگرمی کے لیے مذہبی شناخت کا استعمال غیر جانبداری کے منافی ثابت ہوگا۔ یہ سمجھنا درست نہیں ہے۔

میری رائے میں ہمیں واضح طور پر اور بلا جھجک اسلام کو اپنی شناخت کا حصہ بنانا چاہیے۔ سورۃ حم السجدۃ آیت ۳۴ میں غیر مسلموں کے ساتھ تعلق میں جو رہنمائی کی گئی ہے وہ نہ صرف یہ ہے کہ

---

* وائس چانسلر، رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی، اسلام آباد

[1] الحج: ۴۱

[2] التوبہ: ۶۰

آپ خود نیکی پر قائم رہتے ہوئے اللہ کی طرف دعوت دیں بلکہ اپنی اس شناخت کا اظہار بھی کریں کہ وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ ٱلْمُسْلِمِينَ یعنی میں مسلمانوں میں سے ہوں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اپنی اصطلاحات میں بھی مذہب، عقیدہ، دین جیسے عمومی الفاظ کے استعمال سے زیادہ اسلام کا لفظ استعمال کرنا چاہیے جیسے اسلامی تنظیم اور اسلامی امداد وغیرہ۔اس حوالے سے قرآن کے مطالعہ کی بنیاد پر میری سمجھ مجھے یہ بتاتی ہے اگرچہ اس رائے سے اتفاق واختلاف ہر ایک کا حق ہے۔

اسی طرح یہ تصور بھی درست نہیں کہ تعداد کے لحاظ سے کم افراد کو اقلیت کا عنوان دے کر یہ سمجھا جائے کہ وہ پسماندہ، نظرانداز کیے گئے اور مفلوک الحال طبقات ہیں۔قرآن پاک بتاتا ہے کہ بہت سے مواقع پر کم تعداد، کثرت پر غالب آتی ہے۔[۳] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی تقسیم کثرت و قلت کی بنیاد پر نہیں، بلکہ حق اور باطل کی تمیز کے لیے عطا کردہ دین کے رہنما اصولوں کی بنیاد پر کرنی چاہیے۔اس سلسلے میں میرا موقف یہ ہے کہ مسلمان جہاں کم تعداد میں ہیں، انہیں خود کو اس احساسِ مجبوری اور گداگری سے نکالنے کی ضرورت ہے۔

اقلیت کہلایا جانا ایک نفسیاتی بیماری ہے۔ہمیں اپنی معاشرت میں بھی امداد کا معیار ضرورت کی نوعیت اور کی شدت کو بنانا چاہیے۔انسان ہمدردی، معاونت اور خدمت کے تعین کے لیے قرآن مجید انسانوں کی کیفیات کا ذکر کرتا ہے جیسے فقراء، مساکین، مسافر وغیرہ۔قرآن کے نزدیک کسی طبقے کی تعداد، اقلیت یا اکثریت، یا ان کی نسل و قومیت یا انسانوں کی تشکیل کردہ کوئی تقسیم کسی فرد یا طبقے کو انسانی خدمت و مدد کا مستحق نہیں بناتی۔لہٰذا، استعمار نے جو ہمارے خون میں فکری جال بچھا دیا ہے، اسے دور کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ کیا آپ کسی نظام میں جزوی بہتری لا کر دیرپا اصلاح کی امید رکھ سکتے ہیں۔بے شک فوری ضروریات پوری کرنے والے اداروں کو اپنا کام کرتے رہنا چاہیے مگر انسانوں

---

[۳] آلِ عمران: ۱۲۳

میں محرومی و بے چارگی پیدا کرنے والے نظام کو سُدھارنے کے لیے جامع تبدیلی کی جدّوجہد کرنا لازم ہے۔ ایسا ہونا ایمان کی تازگی کے بغیر ممکن نہیں۔ ایمان محض چند الفاظ یا جملوں کے اظہار کا نام نہیں۔ بلکہ اس سے مراد آپ کی زندگی کا وہ نظریہ ہے جو آپ کے عمل سے ظاہر ہو۔ یہ کوئی فوری عمل نہیں ہے۔ یہ طویل اور صبر آزما کام ہے اور تبدیلیٔ اذہان، تطہیرِ افکار اور تعمیرِ کردار سے عبارت ہے۔ لیکن جب تک یہ کام نہیں کیا جائے گا اس وقت تک معاشرہ بھلائی پر قائم نہیں ہو سکتا۔

یہ بھی بالکل درست نشاندہی کی گئی ہے کہ خاندانی نظام کی تباہی غیر معمولی اہم معاملہ ہے۔ بے شمار کام جو خاندان کے کرنے کے ہیں، انہیں تیزی سے مصنوعی اداروں کے سپرد کر دیا جارہا ہے۔ اس کی ضرورت وہاں ہے جہاں خاندانی نظام نہیں ہے اور وہ اس کی تباہی پر نوحہ کناں بھی ہیں۔ ایسے میں ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ ہم آگاہ اور خبردار رہیں اور ہماری زیادہ توجہ اس مثبت کام پر ہو جو آئندہ آنے والی نسلوں کو ان کی ذمہ داری سے آگاہ کرے۔ خاندان کے ادارے کے احیا اور مضبوطی کے بغیر کامیابی ممکن نہیں ہے۔ بعض تنظیمیں بیرونی ثقافتوں سے یہ نعرے مستعار لیتی ہیں کہ فرد زیادہ اہم ہے اور اس کی خواہش و خوشی پر کوئی قدغن نہیں ہونی چاہیے، ان کو ردّ کرتے ہوئے خاندان اور اجتماعیت پر استوار اپنی معاشرت کو اپنانا بے حد ضروری ہے۔ جب تک یہ نہیں ہو گا اس وقت تک محض شاخوں کو تراشنے سے درخت کی بیماری دُور نہیں ہو سکتی۔

# بلا امتیاز انسانی خدمات
# دینی مدارس کا کردار

مکالمہ

# بلاامتیاز انسانی خدمات—دینی مدارس کا کردار

ڈاکٹر سید عزیز الرحمٰن، ڈاکٹر عمیر محمود صدیقی،
مولانا ڈاکٹر زبیر اشرف عثمانی، مفتی عبدالرحیم

پاکستان میں قائم دینی مدارس، ان کی نوعیت اور کردار کے بارے میں اندرون و بیرونِ ملک ہمیشہ سے ہی آراء کا اختلاف رہا ہے۔ بعض طبقات کے لیے یہ دہشتگردی وانتہا پسندی کے مراکز ہیں۔ کچھ لوگ انہیں اندھی تقلید اور محدود عملی کردار کے حامل افراد کی تیاری کا الزام دیتے ہیں۔ تاہم لوگوں کی ایک بڑھتی ہوئی تعداد ان تعلیمی اداروں کی خدمات کو ملک و قوم کے لیے قابلِ قدر گردانتے ہیں جو دینی علوم کی حفاظت، تعلیم و ترویج تک محدود نہیں بلکہ ہر وقت لاکھوں طلبہ و طالبات ان مدارس سے بلا معاوضہ تعلیم، رہائش، خوراک، اور شعور کا حصول بھی انہی اداروں سے وابستہ ہے۔ رفتہ رفتہ بعض دینی مدارس نے اپنے معاشرتی کردار کو منظم انداز میں بڑھانا شروع کیا ہے اور باقاعدہ سماجی خدمات کی جانب توجہ کی ہے۔ انسانی خدمات کے تناظر میں یہ سوال ہمیشہ اُٹھایا جاتا ہے کہ دینی مدارس جن کی بنیادی تربیت ہی دینِ اسلام کی سربلندی اور بالادستی کے نظریے پر استوار ہے، کیا ان سے وابستہ افراد کی خدمت بلا امتیاز اور ہمہ گیر ہو سکتی ہے۔ کانفرنس کی اس نشست میں اہلِ علم نے ایسے ہی سوالات و مباحث کا احاطہ کیا ہے۔

ڈاکٹر سید عزیزالرحمٰن*

چونکہ میں سامع کے طور پر کل سے اس کانفرنس کا حصہ ہوں اس لیے میں رسماً نہیں، بلکہ حقیقتاً منتظمین کا شکر گزار ہوں۔ آج کل عام نشستوں کا تاثر اس سے مختلف ہے۔ ہمارے ہاں فوٹو سیشن کی ایک بد نما روایت قائم ہو چکی ہے جس کی وجہ سے اِن میں شرکت میں الجھن محسوس ہوتی ہے۔ بہر حال یہ کانفرنس ایک صدقۂ جاریہ ہے جس کے انعقاد پر میں منتظمین کا مشکور ہوں۔

میں ''مدارس، غیر جانبداری اور خدمت'' کے عنوان سے تین پہلوؤں پر گفتگو کروں گا۔ آغازِ کلام میں یہ واضح کر دینا مفید ہو گا کہ اسلام میں غیر جانبداری کا تصور مغربی تصور سے قدرے مختلف ہے۔ خالصتاً خدمت کے حوالے سے گفتگو کی جائے تو اسلامی تعلیمات خالصتاً وہی ہیں جو ایک محتاط اور متوازن الفکر شخص کی سوچ ہو سکتی ہے۔ یعنی جس میں نہ تو جغرافیائی، علاقائی اور لسانی بنیاد پر کوئی تقسیم ہو سکتی ہے اور نہ ہی خدمت کے دائرے میں۔ جب ہم مدارس کے حوالے سے خدمت کی بات کرتے ہیں تو بنیادی طور پر ہماری مراد تعلیم ہوتی ہے۔ تعلیم، خدمت کا ایک پہلو اور اس کے مختلف دائروں میں سے ایک دائرہ ہو سکتا ہے۔ اور مدارس کا لفظ استعمال ہو گا تو مدرسہ کی حدود میں رہنے والے دو بڑے طبقات، یعنی طلبہ اور اساتذہ کا ذکر ہو گا، نہ کہ عوام کا۔

خدمت اور مدارس پر بات کرنے سے قبل اسلام کے تناظر میں خدمت کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ حضور اکرم ﷺ وحیِ اوّل کے بعد جب گھر تشریف لائے اور اپنے احساسات اپنی رفیقِ حیات کے سامنے رکھے تو اس موقع پر انہوں نے چند مختصر جملے ادا کیے جو کہ نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کے چالیس برس کے نمایاں ابواب ہیں۔ سیدہ خدیجہؓ نے فرمایا تھا:

* انچارج، ریجنل دعوۃ سینٹر، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، کراچی

إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وتَصْدُقُ الحَدِيثَ وتَحْمِلُ الكَلَّ وتَكْسِبُ المَعْدُومَ وتَقْرِي الضَّيْفَ وتُعِينُ علَى نَوَائِبِ الحَقِّ[1]

ان تمام جملوں میں کسی بھی لفظ میں تقسیم کا شائبہ تک نہیں۔ بعد از اسلام بھی حضور اکرم ﷺ تو سیعی شکل میں اسی طرز پر قائم رہے۔ تاہم جب اس تصوّرِ خدمت کو سامنے رکھ کر مسلمانوں کے عمل کی بات کی جائے تو بار بار یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا ہم واقعی اس تعلیم پر اس درجے میں عمل پیرا ہو سکے ہیں جو اس کا بنیادی تصور تھا یا جو آپ ﷺ کی تعلیمات کا خلاصہ تھا؟

مذہب کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ یہ غیر جانبدار نہیں ہو سکتا۔ میں یہ کہنا چاہوں گا کہ یہ تاثر کم از کم تعلیمات کے دائرے میں اسلام کے بارے میں نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام سے قبل کے دیگر جتنے مذاہب موجود ہیں ان میں کسی نہ کسی درجے میں علاقائیت موجود ہے۔ مگر اسلامی تعلیمات میں علاقائیت کا کوئی وجود نہیں۔ یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ پوری دنیا ایک امت ہے، ان میں سے ایک حصہ امتِ دعوت کا ہے اور ایک امتِ اجابت کا ہے۔ کچھ حضور اکرم ﷺ کی تعلیم اور پکار پر اسلام لا کر آپ کے دامنِ رحمت سے وابستہ ہو چکے ہیں جبکہ کچھ نے ہماری کوششوں کے نتیجے میں ابھی اس دائرے میں آنا ہے۔ لہٰذا جب ہم امت کا لفظ استعمال کریں اور حضور اکرم ﷺ کی نسبت سے پوری دنیا کو امتِ دعوت اور امتِ اجابت میں تقسیم کریں تو محبت اور فکر کا احساس پیدا ہوگا۔ اس کے برعکس کوئی اور لفظ استعمال کرنے پر مانوسیت کم اور نامانوسیت زیادہ ہوگی۔

اس سلسلے میں مسائل کو سمجھنے میں غلطی کی گئی ہے۔ اسے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر ایک کسی ادارے کا ایک منفرد نشان (logo) بنا دیا جائے تو اس نشان کا مقصد تفریق نہیں بلکہ امتیاز ہوتا

---

[1] ''آپ تو صلہ رحمی کرتے ہیں، ناتوانوں کا بوجھ اپنے اوپر لیتے ہیں، محتاجوں کے لیے کماتے ہیں، مہمان کی مہمان نوازی کرتے ہیں اور حق کی راہ میں مصیبتیں اٹھاتے ہیں''۔ محمد بن اسماعیل البخاری، صحیح بخاری، کتاب الوحی، باب ۱، ج۳

ہے۔اسی طرح سے اگر کوئی ادارہ مخصوص یونیفارم منتخب کرے تو اس کا مقصد تفریق نہیں ہوتا۔ اسی پہلو کے حوالے سے قرآنِ کریم نے جغرافیائی اور نسلی فرق کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ یہ صرف تمہارے درمیان امتیاز قائم کرنے کے لیے ہیں اور اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِندَ اللّٰہِ أَتْقَاکُمْ [۲]۔ معلوم ہوا کہ اس بارے میں امتیازی تعلیمات بہت واضح طور پر موجود ہیں۔

یہ سوال اہم ہے کہ کمیونٹی کی بنیاد پر اگر کام شروع کیا جائے تو کیا یہ تصورِ غیر جانبداری کے خلاف ہو گا؟ اس سلسلے میں میں یہ کہنا چاہوں گا کہ کسی شخص کا اپنی خدمات کو متعین و منظم کرنا نہ تو امتیاز ہے اور نہ ہی غیر جانبداری کے برعکس ہے۔ جیسے ایک بڑے ادارے کے ذیل میں چھوٹے ادارے قائم کیے جا سکتے ہیں اسی طرح انفرادی سطح پر چھوٹے پیمانے پر بھی کام کیا جا سکتا ہے اور غیر منظم اور غیر مربوط تنظیمیں اگر باہم ایک دوسرے سے ناواقف ہوں تب بھی ان کا مقصد مخالفت نہیں ہے۔

مدارس کے حوالے سے بھی تقسیم کا یہ تاثر عام ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ یہ مسلکی بنیادوں پر قائم ہیں۔ یہ جاننا مفید ہو گا کہ یہ تاثر پیدا کب ہوا۔ یہ معاملہ ۱۸۵۷ء کے بعد کا ہے۔اس سے قبل، مکاتبِ فکر مدارس کی بنیاد پر تھے لیکن اس کے بعد انتہائی ہنگامی حالات میں قائم ہونے والے مدارس میں یہ طے کیا گیا کہ اب مدرسہ، مسلک کی بنیاد پر ہو گا۔ آپ اتفاق کریں گے کہ شاہ ولی اللہؒ، علمائے لدھیانہ، علمائے خیر آباد اور دیگر حضرات کا شخصی تعارف تو موجود ہے مگر مسلکی بنیاد پر تشخص نہیں تھا۔اس سلسلے میں اس دور کے کئی علماء کی مثالیں ملتی ہیں جنھوں نے مختلف مکاتبِ فکر سے وابستہ مدارس میں تعلیم حاصل کی مگر انہیں گمراہ نہیں کہا گیا۔ان میں ایک مثال مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی ہے۔ جبکہ آج مدارس کی صورتِ حال یہ ہے کہ ایک وفاق کا طالبِ علم دوسرے وفاق سے نہ تو الحاق کر سکتا ہے اور نہ ہی امتحان دے سکتا ہے۔ایسے میں یہ خدشہ بے بنیاد نہیں لگتا کہ

---

[۲] ”درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔“ الحجرات:۱۳

انسانی خدمت کے میدان میں بھی یہ ادارے اور ان کے تیار کردہ افراد تقسیم کا شکار ہوں گے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ بعض ادارے جنہوں نے تعلیم، صحت، یا خدمتِ خلق کے دیگر منصوبوں کا آغاز کیا ہے ان کے ہاں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ انہوں نے مدد کرنے کے معاملے میں صرف مسلکی نہیں بلکہ مذہبی اختلاف کے باوجود بلا تفریق انسانیت کی خدمت کی ہے۔ تاہم یہ اعتراف بھی کرنا چاہیے کہ ایسے اداروں اور اس وسیع تر سوچ کا دائرہ فی الحال محدود ہے۔ بہتر ہوگا کہ آنے والے وقت کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار استعمال کیا جائے اور نہ تو خود کو اور نہ ہی اپنے معاشرے کو وقت کے دھارے کے سپرد کیا جائے۔ بصورتِ دیگر ایسے افراد اور ادارے خدمت کے میدان میں خلا پوری کریں گے جن کے مقاصد سے شاید ہم ہمیشہ اتفاق نہ کر سکیں۔

## ڈاکٹر عمیر محمود صدیقی*

''بلا امتیاز انسانی خدمت اور دینی مدارس کا کردار'' کے حوالے سے چار سوالات نہایت اہم ہیں:

۱۔ کیا اسلام بلا امتیاز انسانی خدمات کے جواز کا حامی ہے؟ اس حوالے سے اسلامی تعلیمات کیا ہیں؟ اور کیا اسلامی تعلیمات میں اس حوالے سے ترغیب دی گئی ہے؟ اس سوال کی اہمیت اس لیے ہے کہ ہمارے ہاں جب سے اسلام کا ایک وسیع تناظر او جھل ہوا ہے، تب سے ان معاملات کو سمجھنے میں غلطی ہو رہی ہے۔ بہت سے مقامات پر انسانی خدمت کے عمل کو کفر کے طور پر گردانا جاتا ہے۔ اس لیے اس سوال کی بہت اہمیت ہے۔

۲۔ اس سلسلے میں مدارس کا موجودہ کردار کیا ہے؟

۳۔ اس سلسلے میں دینی مدارس کی راہ میں حائل رکاوٹیں کیا ہیں؟

۴۔ اس بات کی کتنی صورتیں اور امکانات موجود ہیں کہ مدارس بلا امتیاز انسانی خدمت سرانجام دے سکتے ہیں؟

---

* اسسٹنٹ پروفیسر، کراچی یونیورسٹی؛ رکن، اسلامی نظریاتی کونسل، پاکستان

جہاں تک غیر جانبداری اور غیر وابستگی کا تعلق ہے تو چونکہ ہم جانتے ہیں کہ مدارس اسلام کے قلعے ہیں اور اسلامی فکر کا تحفظ انہی مراکز سے کیا جاتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ان کی بنیاد اسلام پر ہے اور اسلام بلا امتیازِ رنگ و نسل اور خون اور بلا تفریقِ فرقہ، زبان و قومیت اور مذہب ہمیں انسانی خدمت کا درس دیتا ہے۔ جب آپ پوری کائنات کی تخلیق کی بنیاد روحانیت کو قرار دیتے ہیں تو اس کا نتیجہ انسانی خدمات کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا [3]

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ [4]

وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا [5]

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا [6]

وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ [7]

وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ [8]

اسی طرح کے کئی ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کے لیے اپنے ہر کام میں نیک نیتی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہمیشہ تمام تر امتیازات سے بالاتر ہو کر انسانی خدمت کو اپنا فریضہ سمجھنا چاہیے۔ تاہم، غیر جانبداری اور بلا امتیاز انسانی خدمت کو جب بالخصوص اسلامی تناظر میں دیکھا جائے تو یہ بعض چیزوں کے لیے مقید اور مشروط ہے۔ لیکن جہاں اسلام اور کفر کا مسئلہ درپیش ہو تو

---

[3] ''اور جس نے کسی کی جان بچائی اُس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی۔'' المائدہ: ۳۲

[4] ''ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی۔'' الاسراء: ۷۰

[5] ''اور ہم نے تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے۔ تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرو۔'' الحجرات: ۱۳

[6] ''اور لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف چھوڑ دو۔'' المائدہ: ۸

[7] ''اور ان کے مال میں مانگنے والے اور نہ مانگنے والے (دونوں) کا حق ہوتا تھا۔'' الذاریات: ۱۹

[8] ''اور سائل کو نہ جھڑکو۔'' الضحیٰ: ۱۰

اس فرق کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں زکوٰۃ کی تقسیم کا مسئلہ سرِ فہرست ہے۔

مدارس کا موجودہ کردار لائقِ تحسین اور قابلِ تقلید ہے۔ یہاں تمام تر امتیازات سے بالاتر ہو کر بلا تفریقِ رنگ و نسل و نسب، علاج، تعلیم اور مالی امداد فراہم کی جاتی ہے۔ اگر ہم حقیقی اعتبار سے بات کریں تو یقیناً یہ مدارس ہی دنیا کی سب سے بڑی این جی اوز ہیں جو انسان کی جسمانی و مالی معاونت کے ساتھ روحانی تربیت میں کلیدی کردار ادا کر رہے ہیں۔ حتیٰ تک کہ تجہیز و تکفین کے لیے بھی خدمات سرانجام دی جا رہی ہیں۔ قدرتی آفات اور بعض اوقات جنگوں اور بغاوتوں کے نتیجے میں مدارس سے متعلقہ افراد مالی امداد کے ساتھ ساتھ افرادی قوت بھی فراہم کرتے ہیں۔ اس کی ایک مثال آپ کے سامنے رکھنا چاہوں گا کہ میں جب جامعہ علومِ اسلامیہ میں فرائض سرانجام دے رہا تھا تو ہم نے کوشش کی کہ ہم اندازہ کر سکیں کہ ہمارے ادارے میں کتنے علاقوں اور کتنی زبانوں سے تعلق رکھنے والے لوگ موجود ہیں۔ ہمیں حیرت ہوئی کہ اس ادارے میں تیّس سے زائد زبانیں بولنے والے طلبہ زیرِ تعلیم تھے۔

درپیش رکاوٹوں میں سے پہلی رکاوٹ فرقہ واریت ہے اور ہمیں اس کو تسلیم کرنا چاہیے۔ رنگ، نسل اور لسانیت سے تو ہمارے مدارس بڑی حد تک آزاد ہیں تاہم فرقہ واریت نے ہمیں فرقوں سے بالاتر انسانی خدمت سے روک دیا ہے۔ اب حال یہ ہے کہ ایک ہی علاقے میں ایک مدرسہ کے قریب جب دوسرا مدرسہ کھلنے لگتا ہے تو پہلے مدرسہ والے، دوسرے مدرسہ والوں کو جگہ نہیں لینے دیتے۔ ان مسائل کو سنجیدگی سے دیکھنے کی ضرورت ہے کیونکہ بعض اوقات یہ فرقہ واریت بہت سنگین نتائج مرتب کرتی ہے۔ مدارس کے لیے بلا امتیاز انسانی خدمت سرانجام دینے میں ایک اور رکاوٹ ایسے متموّل افراد ہیں جو مالی معاونت کرنے کی وجہ سے اپنی رائے کے لیے اہمیت کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ ایسے میں مدارس کے منتظمین کے لیے فیصلے کی دائرہ محدود ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود بعض مدارس ہسپتال کی سہولت بھی رکھتے ہیں اور علاج معالجے کی سہولیات بھی فراہم کرتے ہیں۔ انسانیت کی بلا تفریق خدمت خاص طور پر ان مدارس میں نمایاں

ہے جہاں ساتھ خانقاہیں بھی ہیں یا وہ ادارے جو اپنی اصل میں خانقاہ ہیں اور اب مدرسہ کے نظام کو بھی پروان چڑھا رہے ہیں۔

ہماری اسلامی تاریخ میں بلا امتیاز انسانی خدمت سرانجام دینے میں ان اداروں کا بہت بڑا کردار ہے۔ اس حوالے سے اسلامی تاریخ میں سب سے بڑا نام شیخ عبد القادر جیلانیؒ کا ہے۔ ان کے قائم کردہ ادارے میں اگر آپ اب بھی جائیں تو ہزاروں کی تعداد میں وہاں بلا امتیاز رنگ و نسل و فرقہ، انسانی خدمات سرانجام دی جارہی ہیں۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ اگر قرآن کے بیان کردہ مصارفینِ زکوۃ پر تحقیق کی جائے تو مولفۃ القلوب تو ہے ہی غیر مسلموں کے لیے، جبکہ دیگر مصارفین میں بھی غیر مسلموں کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ چونکہ آج کل زکوٰۃ کا حساب کتاب مدارس کے پاس ہوتا ہے تو اگر ایک فرقے سے تعلق رکھنے والے مدارس باقاعدہ ایک نظام قائم کریں تو انسانی خدمت کے لیے اپنے معمولات کو آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔ اس پر غور کر لینے سے بہت بہتر نتائج سامنے آسکتے ہیں۔

## مولانا ڈاکٹر زبیر اشرف عثمانی*

زیرِ بحث موقف اس وجہ سے نہایت اہم ہے کہ یہ پوری انسانیت کا مسئلہ ہے اور اس وقت اس کا سامنا پوری دنیا کو ہے۔ سب سے پہلے بات یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ پر اللہ تعالی نے جو کتاب نازل فرمائی اس کی بنیادی تعلیمات کا حاصل یہ ہے کہ کچھ چیزیں تو وہ ہیں جو تمام مذاہب میں ایک بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ کچھ چیزیں ہیں جو اللہ نے دوٹوک اصول کے ذریعے بیان کیں مثلاً اللہ ایک ہے، وہ وحدہ لاشریک ہے۔ اس کے بعد عقائد کے بیان میں نبی اکرم ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ جنت، حساب کتاب، آخرت ان سب کا برحق ہونا دوٹوک ہے۔ اس کے بعد کچھ چیزوں کا تعلق احکامات سے ہے اور ایمان لانے والے ان کے مکلف اور پابند ہیں۔ البتہ جب

* رُکن مجلسِ انتظامی، سینٹر آف اسلامک اکنامکس، کراچی

معیشت، معاشرت اور اخلاقیات پر بات کی جائے تو اسلام اور تمام الہامی مذاہب نے بلا امتیاز خدمت کا حکم دیا ہے۔ معاشرت کے حوالے سے یہ حکم نہیں آیا کہ صرف مسلمانوں کے ساتھ حسنِ سلوک کیا جائے بلکہ بلا امتیاز حسنِ سلوک کی تعلیم دی گئی۔ خود نبی اکرم ﷺ کا عمل مبارک ایسا تھا کہ آپ زندگی کے تمام مراحل میں ہر کسی کے ساتھ حسنِ سلوک، خیر خواہی اور نرمی کا معاملہ فرماتے تھے اور دوسروں کو بھی اس بات کی تعلیم دیتے تھے۔

جہاں تک زکوٰۃ کی بات ہے تو وہ مسلمانوں کو ہی دینی چاہیے مگر دیگر صدقات میں اس بات کی کوئی پابندی نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کو ہی دیئے جائیں۔ اسلام کے بنیادی عقائد اور احکامات کے معاملے کو تو ایک خاص مذہب کے تناظر میں دیکھا جاتا ہے یعنی جو اس کا پیروکار ہوگا وہ اس پر عمل کرے گا۔ لیکن اس کے علاوہ دیگر شعبوں میں حضور اکرمؐ نے صحابہ کرامؓ کو یہی تعلیم دی کہ ہر ایک کے ساتھ بلا امتیاز حسنِ سلوک اور انسانی خدمت برتی جائے۔

دار الاسلام میں رہنے والے تمام غیر مسلموں کے بارے میں حکم ہے کہ ان کی جان، مال، عزت اور آبرو کا تحفظ مسلمانوں کے ذمے ہے۔ حتی کہ ان کی عبادت گاہوں کا تحفظ بھی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ کہیں یہ حکم نہیں آتا کہ ان کی عبادت گاہوں میں انہیں مذہبی آزادی سے روکا جائے۔ فتحِ خیبر کے موقع پر حضرت عمرؓ کے سامنے یہ تجویز رکھی گئی کہ خیبر میں مسلمانوں کی فوج کو دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے تو آپؓ نے اس تجویز کو یہ کہتے ہوئے رد کر دیا کہ چونکہ ہم ان سے جزیہ وصول کر چکے ہیں لہذا ان کا تحفظ ہمارے ذمے ہے اس لیے ہم یہاں سے فوج نہیں ہٹا سکتے۔ حضور اکرمؐ نے عین میدانِ جنگ میں اخلاقیات کی تعلیم دی اور دنیا کو بتایا کہ جنگ اپنا غصہ نکالنے کے لیے، مال و دولت سمیٹنے کے لیے یا اپنی طاقت کو بڑھانے کے لیے نہیں لڑی جاتی بلکہ جنگ کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ ہے۔ اور دورانِ جنگ، اخلاقیات بیان کی ہیں کہ دیکھو بچوں، بوڑھوں اور خواتین پر ہاتھ مت اٹھانا، بلکہ جو جنگ میں شریک ہے، جنگ صرف اسی سے ہے۔ ایک بار ایک غزوہ میں نبی اکرم ﷺ کو اطلاع ملی کہ کسی خاتون کو کسی شخص نے نقصان پہنچایا ہے۔ اس پر

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سخت خفگی کا اظہار کیا۔

اسی طرح، رہن سہن میں بھی حسنِ سلوک کی تعلیم دی گئی ہے۔ مدارس کے حوالے سے یہ بات درست ہے کہ یہ نصاب برِ صغیر میں ہنگامی بنیادوں پر قائم ہوا۔ میرے دادا مفتی محمد شفیعؒ جو دارالعلوم کراچی کے بانی بھی ہیں، وہ فرماتے تھے کہ چونکہ دارالعلوم دیوبند کا نصابِ تعلیم ایک خاص پسِ منظر میں ہنگامی بنیادوں پر وجود میں آیا لہٰذا ہمیں وہ نہیں چاہیے بلکہ پاکستان بننے کے بعد ہمیں ایک ایسے نصابِ تعلیم کی ضرورت ہے جو یہاں کی ضروریات سے ہم آہنگ ہو۔ بہر حال اس پر کئی بار رپورٹس بنائی گئیں مگر عمل درآمد نہیں ہو سکا۔ اگر عمل درآمد ہو جاتا تو آج تعلیمی نظام کی ایک بہت بہتر صورتِ حال ہمارے سامنے ہوتی۔ اس کے علاوہ میں یہ بات عرض کرتا چلوں کہ یہ درست ہے کہ آپ کو ایک مدرسے میں ایک ہی مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے والے لوگ ملیں گے مگر کسی جماعت میں آپ کو کوئی طالبِ علم یہ پڑھتا ہوا نہیں ملے گا کہ بریلوی غلط اور ہم صحیح ہیں یا اہلِ حدیث غلط اور ہم صحیح ہیں۔ آپ ہمارا پورا نصاب اٹھا کر دیکھ لیں آپ کو معلوم ہو گا کہ مدارس میں طلبہ کو اس بات کی تعلیم دی جاتی ہے کہ ہر ایک کی خدمت کریں، ہر مسلک کی تعلیمات درست ہیں اور ہر ایک کو معاشرے میں جینے کا حق حاصل ہے۔ یہ قطعاً درست نہیں ہے کہ وہاں کسی نے بابری مسجد کو شہید کر دیا تو یہاں آپ کسی مندر کو آگ لگا دیں۔ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا اور نہ اسلام میں ایسا کوئی تصور موجود ہے۔ بلا امتیاز انسانی خدمت کے حوالے سے جامعۃ الرشید، دارالعلوم کراچی اور دیگر مدارس کا بہت بڑا کام ہے۔

میری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کے عقائد اور احکامات صرف اسے قبول کرنے والوں پر لاگو ہوتے ہیں جبکہ معیشت، معاشرت اور اخلاقیات میں سب شریک ہیں۔ مزید برآں، انسانی خدمت کے حوالے سے ہم آہنگی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ خدمت اور تعلیم کے میدانوں میں ہم بہتری محسوس کرتے ہیں اور مزید بہتری کی امید کرتے ہیں۔

# صدارتی کلمات

## مفتی عبدالرحیم*

میں خالد رحمٰن صاحب اور ضیاء اللہ رحمانی صاحب کا ممنون ہوں کہ انہوں نے اس اہم موضوع پر گفتگو کے لیے بہت قابل مقررین کا انتخاب کیا۔ چونکہ میں عام تقاریب سے اعراض کرتا ہوں اس لیے اس تقریب میں آنے سے قبل میں نے اپنے ساتھی سے اس تقریب کے ماحول سے متعلق دریافت کیا تو مجھے کی یہ بات سُن کر اور اب خود دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ کانفرنس کا ماحول بہت سنجیدہ، علمی اور فکری ہے۔

فرقہ واریت کے حوالے سے جو مسائل ملکی اور بین الاقوامی سطح پر درپیش ہیں ان پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم نے عصبیت کو محض زبان و علاقے کے ساتھ مختص کر لیا ہے۔ عصبیت دراصل یہ ہے کہ حق اور حق دار کو جانتے ہوئے محض اپنی ذاتی وابستگی، پسند یا ناپسند کو معیار بناتے ہوئے اس حق کا انکار کیا جائے۔ یہ جانتے ہوئے کہ ہماری برادری یا قوم غلطی پر ہے، اس کی حمایت کی جائے۔ اسلام نے جو مزاج تشکیل دیا ہے اس میں عصبیت اجتماعی وانفرادی دونوں سطحوں پر حرام ہے۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ آئے دن اقلیتوں کے حوالے سے کوئی نہ کوئی معاملہ زیرِ بحث رہتا ہے، اس سلسلے میں ریاست کے حقوق اور معاہدات کی اہمیت پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ میں شرحِ صدر سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر مسلم حکومتوں کے تحت غیر مسلموں کو جو حقوق حاصل ہیں ان سے متعلق اسلامی تعلیمات کی درست تشریح کی جائے تو نہ صرف ہم انہیں فخر کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کر سکیں گے بلکہ ہمارے معاشرے بھی باہم احترام کی بنیاد

---

* شیخ الجامعہ، جامعۃ الرشید، کراچی

پر استوار پائیں گے۔

ہمارے معاشرے میں بڑھتی ہوئی خلیج کا ایک پہلو سماجی تنظیموں اور مدارس کے درمیان خلیج بڑھتی جا رہی ہے۔ این جی اوز اور ان سے متاثر افراد کا خیال ہے کہ مدارس میں یہ سکھایا جاتا ہے کہ انسانیت کو قتل کرنا ہے۔ دوسری طرف مدارس کے عام طلبہ و اساتذہ یہ سمجھتے ہیں کہ این جی اوز انسانیت کے نعرے کی آڑ میں منفی رجحانات کو فروغ دینے کے منصوبے پر کاربند ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان دونوں کی اصلاح کی ضرورت ہے اور ان دونوں طبقات کو براہِ راست ایک دوسرے کو دیکھنے، سمجھنے اور ایک دوسرے کا نقطۂ نظر بلاواسطہ جاننے کی ضرورت ہے۔

اسلام تو یہ چاہتا ہے کہ لَا نُرِیدُ مِنکُمۡ جَزَآءً وَلَا شُکُورًا[9] کے مصداق انسانی خدمت اتنی خالص ہو کہ اس کے نتیجے میں کوئی مالی، سیاسی، یا دیگر مفاد حاصل کرنے کی توقع ہی نہ رہے۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی زندگیوں میں ہمیں اس حوالے سے کافی رہنمائی ملتی ہے۔ مثال کے طور پر غِفار قبیلہ جس علاقے میں آباد تھا وہاں قحط پڑ گیا تو پورے قبیلے نے مدینہ کی راہ لی۔ انہیں معلوم تھا کہ یہاں کھانا ضرور مل جائے گا۔ آپ ﷺ کا مہمان بننے پر مسلمان نہ ہونے کے باوجود ان کے ساتھ اس قدر حسنِ سلوک کیا گیا کہ وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ حضور اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ سے ہمیں اس قسم کے بے شمار واقعات ملتے ہیں۔

جس نوعیت کی گفتگو اس مجلس میں ہوئی ہے، اگر یہ ہم اپنے اپنے مدرسے میں بھی جا کر بھی کریں تو یہ متعدد غلط فہمیوں کے ازالے میں بہت فائدہ مند ہو سکتی ہے۔ میں نے بھی ابھی یہ فیصلہ کیا ہے کہ ان مقررین کی گفتگو اپنے ادارے کے طلبہ کو سناؤں گا۔ اللہ تعالی ہمیں دین کے اصل مزاج کو سمجھنے اور اس کو عام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

---

[9] الدھر: ۹

# خصوصی گفتگو

## مولانا محمد حنیف جالندھری*

میرے لیے اس کانفرنس میں شرکت کرنا خوشی ومسرت کا باعث ہے اور اس کے انعقاد پر میں آئی پی ایس اور آئی سی آر سی کو مبارک پیش کرتا ہوں۔ اسلام اور انسانی خدمت سے متعلق گفتگو میں ایک اہم پہلو جو ہمیشہ مدّ نظر رہنا چاہیے، وہ یہ ہے کہ اسلام مذہب نہیں، بلکہ دین ہے۔ مذہب ایک مختصر، جبکہ دین ایک بڑا اور جامع تصور ہے۔ قرآن وحدیث میں اسلام کے ساتھ کہیں بھی مذہب کا لفظ استعمال نہیں ہوا بلکہ اسلام کو دین ہی کہا گیا ہے۔ إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ[1] یعنی الدین ھو الاسلام والاسلام ھو الدین۔[2] اسی طرح وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ[3] میں بھی مذہباً نہیں، بلکہ دیناً کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ ایک آیت میں تو دو مرتبہ اللہ نے اسلام کے لیے دین کا لفظ ارشاد فرمایا ہے: اِلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا[4] اس آیت میں دینِ اسلام کو کامل نعمت قرار دیا گیا ہے۔

---

* ناظمِ اعلیٰ، وفاق المدارس العربیہ، پاکستان

[1] ”اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔“ آل عمران: ۱۹

[2] مکمل طرزِ حیات صرف اسلام ہی ہے اور اسلام ہی زندگی کا درست طریقہ ہے۔

[3] ”اور جو کوئی اسلام کے سوا اور کوئی دین چاہے تو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔“ آل عمران: ۸۵

[4] ”آج میں تمہارے لیے تمہارا دین پورا کر چکا اور میں نے تم پر اپنا احسان پورا کر دیا اور میں نے تمہارے واسطے اسلام ہی کو دین پسند کیا ہے۔“ المائدہ: ۳

اہلِ علم کے نزدیک جس طرح سورۃ الفاتحہ اُمّ الکتاب ہے اسی طرح حدیثِ جبرائیلؑ اُمّ السنۃ یعنی تمام احادیث کا خلاصہ ہے۔[۵] جس کے بارے میں حضور اکرم ﷺ نے حضرات صحابہ کرامؓ سے فرمایا کہ أَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِيْنُكُمْ یعنی جبرائیل اس لیے آئے تا کہ تمہیں تمہارا دین سکھائیں۔ یہاں بھی حضور اکرمؐ نے اسلام کے لیے دین کا لفظ استعمال کیا۔اسی بنا پر میں عرض کرتا ہوں کہ اسلام کے لیے لفظ دین استعمال کرنا چاہیے کیونکہ مذہب محض چند عقائد و عبادات اور اخلاقی ہدایات کا نام ہے مگر دین ایک مکمل ضابطہ حیات اور دستورِ زندگی ہے۔

دین اپنے اندر ایک جامع تصور و پیغام رکھتا ہے اور اس کے پانچ بنیادی اجزاء ہیں: عقائد و نظریات، عبادات، معاملات، معاشرت، اخلاق و آدابِ زندگی۔ان تمام کے بارے میں دینِ اسلام نے ایک معتدل اور جامع نظام دیا ہے۔عام طور پر نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کو ہی اسلام سمجھا جاتا ہے حالانکہ یہ اسلام کا جزو ہیں، کل نہیں۔ معلوم ہوا کہ اسلام صرف چند عبادات کا نام نہیں ہے بلکہ یہ انسان کو اس کی پیدائش سے قبل، پیدائش کے بعد، موت اور موت کے بعد تک کی زندگی کی تمام رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ان سب باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہمارا دین واقعی اس بات کا حقدار ہے کہ اسے نعمت کہا جائے۔

اسلام ایک مکمل دستورِ حیات اور ضابطہ زندگی ہے اور اس کے تمام شعبہ جات پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام کے اجزاء میں انسانی خدمت کی کیا اہمیت ہے۔ نظامِ عقائد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں انسانی خدمت کا پیغام دیا جا رہا ہے۔ عبادات و معاملات کے نظام میں انسانی خدمت کا پیغام دیا گیا ہے۔اسی طرح سے اسلام کے نظامِ معاشرت اور آدابِ زندگی پر نگاہ دوڑائی جائے تو انسانی خدمت کے حوالے سے ہدایات ملتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ انسانی خدمت ہی وہ قدرِ مشترک ہے جس کی تعلیم اسلام نے اپنی مخصوص تعلیمات کے اندر دی اور ہر جگہ انسانی خدمت کو پیشِ نظر رکھا۔اسے عقائد و معاملات کا حصہ بنایا، عبادت کہا اور اخلاقیات و معاشرت کی روح بنایا۔

---

[۵] شرح الاربعین: ۱۲

اسی لیے شیخ التفسیر احمد علی لاہوریؒ فرماتے تھے کہ اگر میں ریلوے سٹیشن پر ہوں، ٹرین آچکی ہو اور میرا ایک پاؤں ٹرین کے اندر اور ایک پلیٹ فارم پر ہو، میری روانگی ہو جبکہ ایک شخص جس نے جانا نہ ہو، وہ مجھ سے کہے کہ احمد علی! جلدی سے مجھے بتادو کہ اسلام کا خلاصہ اور لبِ لباب کیا ہے؟ تو میں اسے کہوں گا کہ اسلام کا خلاصہ تین باتوں میں ہے۔

۱۔ اللہ کو راضی کرو عبادت سے۔

۲۔ حضورؐ کو راضی کرو غیر مشروط اطاعت و فرمانبرداری سے۔

۳۔ مخلوق کو راضی کرو خدمت سے۔

اگر قرآن و حدیث کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلام انہی تین چیزوں کے ارد گرد ہے اور یہی پورے دین کا خلاصہ ہے۔

الخلق عیال اللہ کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اللہ کو کسی کنبے اور برادری کی ضرورت ہے بلکہ یہ صرف مجھے اور آپ کو سمجھانے کی غرض سے کہا گیا ہے۔ اسلام جہاں دینِ امن ہے وہیں دینِ انسانیت ہے۔ قرآن مجید میں دیکھیں ہر نبی اپنی قوم سے یا قوم کہہ کر خطاب کر رہے ہیں مگر حضور اکرم ﷺ پوری انسانیت سے مخاطب ہیں۔ اس حوالے سے چند آیات ملاحظہ فرمائیے:

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا[6]

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا[7]

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا[8]

---

[6] ”کہہ دو اے لوگو تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔“ الاعراف: ۱۵۸

[7] ”اور (اے محمد ﷺ) ہم نے تم کو تمام لوگوں کے لئے خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔“ سبا: ۲۸

[8] ”لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے۔ تاکہ ایک دوسرے کی شناخت کرو۔“ الحجرات: ۱۳

لہٰذا تمام انسان خواہ وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، بطورِ انسان ایک برادری ہیں۔ ہماری نسل بھی ایک ہے، ہماری اصل بھی ایک ہے۔ اصل اس طرح ایک ہے کہ ہم سب مٹی سے پیدا ہوئے ہیں اور نسل اس طرح ایک ہے کہ ہمارے ماں باپ آدم و حواؑ ہیں۔ حضور اکرمؐ کا جو پہلا تعارف حضرت خدیجہؓ کی جانب سے ملتا ہے وہ ایک صلہ رحم، بوجھ نہ اٹھا سکنے والوں کا بار اٹھانے والے، کمانہ سکنے والوں کو کما کر دینے والے، مہمان نواز اور حق کے کاموں میں ہاتھ بٹانے والے شخص کے طور پر ملتا ہے۔ حضرت خدیجہؓ نے حضور اکرمؐ کا تعارف ایک عابد و زاہد کے طور پر نہیں کروایا بلکہ ان کا یہ تعارف ان کی سماجی و انسانی خدمت کا اظہار ہے۔

انسانی خدمت کی معاصر صورتوں پر مقررین نے بہت اچھے انداز میں روشنی ڈالی۔ اس موقع پر میں اختصار کے ساتھ یہ بات عرض کرنا چاہوں گا کہ انسانی خدمت انسانی بنیادوں پر ہونی چاہیے۔ اس مقدس کام کو اس وقت نقصان پہنچتا ہے جب عنوان تو انسانی خدمت ہو مگر پسِ پردہ کوئی اور ایجنڈا ہو، اپنے مذہب و مسلک کی تبلیغ ہو اور انسانی خدمت کو عنوان بنا کر اپنے عزائم یا سیاسی مقاصد کو پورا کیا جائے۔ اس صورت میں انسانی خدمت کے اس عظیم کام کو بہت بڑا دھچکا لگتا ہے۔ ماضی و حال میں بہت سے لوگوں نے اس عنوان کو اپنے سیاسی، مذہبی اور عسکری مقاصد کے لیے استعمال کیا، جس سے نقصان ہوا اور ہو رہا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم خدمت کے لیے انسانی بنیادوں پر آگے بڑھیں۔

میرا تعلق چونکہ مدارس سے ہے اور میں وفاق المدارس العربیہ کا خادم ہوں، لہٰذا آخر میں اتنی سی بات عرض کروں گا کہ الحمد للہ ہمارے معاشرے میں بے شمار ادارے خدمت کا کام کر رہے ہیں مگر اس میں دینی مدارس اور علماء کا بھی بہت بڑا کردار ہے۔ جس وفاق سے میں وابستہ ہوں اس سے الحاق شدہ مدارس کی تعداد تقریباً تئیس ہزار ہے جن میں ۲۵ لاکھ طلباء و طالبات زیرِ تعلیم ہیں اور ان میں زیادہ تعداد طالبات کی ہے۔ آج کے دور میں جب تعلیم بھی تجارت بن چکی ہے، اہلِ مدارس نے اسے عبادت بنایا اور یہی انسان کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ یہی عمل

حضور اکرمؐ کا غزوہ بدر کے موقع پر تھا۔ ان مدارس میں تعلیم کے ساتھ ساتھ مفت کھانا، رہائش، وظیفہ، کتب اور علاج کی سہولیات بھی فراہم کی جاتی ہیں۔ پسماندہ علاقوں میں جہاں سکول نہیں ہے، مدرسہ وہاں بھی موجود ہے جو عوام کے لیے فلاحی ورفاہی خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ اللہ پاک ہم سب کو انسانی خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔ آپ سب کا بہت شکریہ۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

# حرفِ آخر

## ڈاکٹر ضیاء اللہ رحمانی

الحمد للہ، ثم الحمد للہ۔ ہم نے اس کانفرنس کی جو منصوبہ بندی کی، یہ اس سے کئی گنا بہتر طریقے سے اختتام پذیر ہوئی۔ اور میں ہر لحاظ سے اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ ہم اپنا مقصد حاصل کرنے میں کافی حد تک کامیاب ہو گئے ہیں۔ البتہ اس کانفرنس کے بعد کیے جانے والے امور اور ان میں کامیابی کا انحصار تمام شرکاء پر ہے۔

اسلامی قانون کا طالبعلم ہونے کے ناطے میں اس بات پر خوش ہوں کہ اس کانفرنس میں علمی و عملی پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ نیز، یہاں پر ہونے والی گفتگو کے بعد اندازہ ہوا کہ انسانیت کا لفظ جو آج مغرب میں بکثرت استعمال ہو رہا ہے، اس پر ہمارے مذہب کی کئی نصوص موجود ہیں۔ طلبہ و محققین کے لیے ایک بات عرض کرنا چاہوں گا کہ ہمیشہ ذہن میں رکھیں کہ ایک ہوتی ہے حقیقت، جس پر سب متفق ہوتے ہیں اور جسے جھٹلانا ممکن نہیں ہوتا۔ ایک ہوتی ہے رائے، ایک فرد کی رائے کو دوسرے کی رائے پر مسلط نہیں کیا جا سکتا۔ اور تیسری چیز ہوتی ہے افواہ، جسے اکثر حقیقت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور افواہ کو حقیقت کے طور پر پیش کرنے کا رویہ قرآن کے بیان کردہ اصولوں اور ایمانی تقاضوں کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ [1]

اسی طرح سے فرمایا: وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا ۚ إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا [2]

---

[1] الاسرا: ۳۶

[2] یونس: ۳۶

اس کے علاوہ کئی احادیث ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مومن کے جھوٹا ہونے کے لیے اتنا کافی ہے کہ وہ سنی سنائی باتوں کو آگے پھیلائے۔ لہذا کسی بھی حوالے سے بات کرتے ہوئے شبہات کو شبہات کے طور پر ہی پیش کرنا چاہیے اور انہیں حقیقت کا رنگ دینے سے گریز کرنا چاہیے۔

آج کل دنیا میں علم اور معلومات حاصل کرنے کے ذرائع بآسانی دستیاب ہیں اور تحقیق کرنا بہت سہل ہے۔ لہٰذا کوشش کرنی چاہیے کہ اپنی بات کو ثبوت کے ساتھ پیش کیا جائے۔ اسی طرح سے مغرب کو جسدِ واحد سمجھنا درست نہیں۔ جیسے مشرق میں اچھے برے لوگ موجود ہیں اسی طرح وہاں بھی ہر طرح کے لوگ موجود ہیں۔ ایک اور بات عرض کرنا چاہوں گا کہ ہر شخص اپنی ذمہ داریوں کے مطابق اپنی قائم کردہ حدود میں رہتے ہوئے اپنے فرائض نبھا رہا ہے، ایک انسان ہر کام نہیں کر سکتا۔ جس انسان کا جو مقصد ہے اس کو اسی کے تحت دلجوئی سے کام کرنا چاہیے۔

اس دو روزہ کانفرنس میں ایسے کئی نئے پہلوؤں پر بات کی گئی جن پر تحقیق کی جا سکتی ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہم اس کانفرنس میں پیش کردہ مباحث کو مرتب کر کے وسیع تر حلقے تک پہنچانے کا اہتمام کر پائے ہیں۔ امید ہے کہ یہ کاوش مزید افراد کو منظم انسانی خدمت پر آمادہ کرے گی، پہلے سے سرگرم افراد اور اداروں کے لیے رہنما ہو گی اور عام قارئین کے لیے معلومات میں اضافے کے ساتھ ساتھ متعدد شکوک وشبہات کو دور کرنے کا باعث بنے گی۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ

Institute of Policy Studies
Islamabad

ICRC

## انٹر نیشنل کمیٹی آف دی ریڈ کراس

۱۸۶۳ء میں وجود میں آنے والی انٹر نیشنل کمیٹی آف دی ریڈ کراس (آئی سی آر سی) دنیا کی سب سے بڑی اور سب سے پرانی انسانی فلاحی تنظیم ہے۔ تین بار نوبل پرائز کی حق دار ٹھہرنے والی یہ تنظیم مسلح تصادم اور تشدد کی دوسری صورتوں میں متاثر ہونے والے لوگوں کو مدد فراہم کرتی ہے۔ آئی سی آر سی ۸۰ سے زائد ممالک میں اپنی سر گرمیاں انجام دیتی چلی آرہی ہے۔

آئی سی آر سی تکریمِ انسانیت کے اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ۱۹۴۷ء سے پاکستان میں ضرورت مندوں کی مدد کر رہی ہے۔ یہاں آئی سی آر سی نے صحت، جسمانی بحالی، آفتوں سے نمٹنے کے لیے کمیونٹی ایجوکیشن، مسلح تصادم یا آفت کے نتیجے میں بچھڑنے والے پیاروں سے رابطے کی بحالی، بین الاقوامی قانونِ انسانیت اور ہنگامی حالات میں لاشوں کی انتظام کاری کے حوالے سے متعلقہ شعبوں میں پائیدار تبدیلیاں لانے کی کوشش کی ہے۔

## انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد ایک آزاد، غیر سیاسی، علمی و تحقیقی ادارہ ہے جو ملکی، بین الاقوامی مسائل اور اسلامی دنیا سے متعلق امور اور پالیسیوں پر تحقیق اور مکالمے کا اہتمام کرتا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کے دائرہ کار میں اقتصادی، معاشرتی، تعلیمی اور نظریاتی امور سے متعلق ملکی اور بین الاقوامی پالیسیاں شامل ہیں۔ ادارے کا مقصد متعلقہ امور پر مکمل آزادی کے ساتھ تحقیق اور مباحثہ کرنا اور مطالعہ اور غیر جانبدارانہ تجزیہ کی روشنی میں لائحہ عمل پیش کرنا ہے تاکہ پالیسی ساز ادارے اس کی روشنی میں بہتر فیصلے کر سکیں۔

PRESS